کلیات آغا حشر کاشمیری

4

(یہودی کی لڑکی، ترکی حور، رستم سہراب)

مرتبین

آغا جمیل کاشمیری

یعقوب یاور

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر کے پورم، نئی دہلی 066 110

Kulliyat-e Agha Hashr Kashmiri-4
Edited by : **Agha Jameel Kashmiri**
&
Yaqoob Yawar

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : اپریل، جون 2004 شک 1926
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : -/137
سلسلہ مطبوعات : 1161

ISBN: 81-7587-059-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر کے پورم، نئی دہلی 110066
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کما حقہ واقفیت بھی نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت قدیم اور جدید عہد کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہل فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تا کہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جا سکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیات آغاحشر کاشمیری اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تا کہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

	دیباچہ	7
1۔	یہودی کی لڑکی	21
2۔	ترکی حور	119
3۔	رستم سہراب	247

دیباچہ

ڈرامے کا تعلق تمثیل اور نقالی سے ہے یہی سبب ہے کہ اس کے ابتدائی نمونے ان علاقوں میں ملتے ہیں جہاں بت پرستی عام تھی ہندوستان اور یونان ایسے ہی خطے ہیں لیکن ان دونوں علاقوں میں ڈرامے کی روایت انفرادی طور پر پروان چڑھی۔ آگے چل کر جب دونوں میں تہذیبی روابط استوار ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ ہندوستان میں کالی داس کے ڈراموں کی فکری و فنی بلندی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ایک صدی قبل مسیح سے کافی پہلے ہوئی ہوگی۔ بدھ اقتدار میں آئے تو انھوں نے بھی اسے اپنے عقائد کی ترویج کے لیے مفید پایا۔ رفتہ رفتہ مختلف ناٹک منڈلیاں وجود میں آئیں جنھوں نے اس کی شکل ایسی بدلی کہ اس کا تعلق سماج کے نچلے طبقے سے رہ گیا۔

مسلمان ہندوستان آئے تو ان کا سابقہ ڈرامے کی اسی شکل سے پڑا۔ اول تو ان کا عقیدہ ایسی چیزوں کی سرپرستی کی اجازت نہیں دیتا تھا دوسرے اس عہد میں ڈرامے شرفا کے معیار پسند سے نیچے کی چیز ہو گئے تھے۔ اس لیے اس فن کی خاطر خواہ ترقی نہ ہوسکی۔ البتہ شاہان اودھ کے آخری دور میں اس جانب توجہ دی گئی اور یہی اردو ڈرامے کے آغاز کا زمانہ ہے، جب سید آغا حسن امانت لکھنوی نے اندرسبھا کی تخلیق کی جسے اسٹیج پر بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس عہد میں امانت کی نقل میں متعدد اندر سبھائیں لکھی گئیں۔ حتیٰ کہ یہ لفظ ڈرامے کے متبادل کے طور پر استعمال

ہونے لگا۔ یہ اندر سبھائیں ملک کے مختلف حصوں میں اسٹیج کی گئیں۔

اسی زمانے میں عروس البلاد بمبئی میں بھی اردو ڈراموں کی جانب لوگوں کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ یہاں کی روایت کا سلسلہ اودھ کے بجائے انگریزی اور مراٹھی اسٹیج سے جڑا ہوا تھا۔ لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی نے اسے ایک منافع بخش کارو بار کی شکل دے دی تھی۔ کارو باری مسابقت نے اسے پھلنے، پھولنے اور نکھرنے کے وافر مواقع فراہم کئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اردو ڈراموں کے افق پر آغا حشر کاشمیری نمودار ہوئے۔

آغا حشر کی پیدائش بنارس میں 4/3/اپریل 1879 کی درمیانی شب میں ہوئی۔ ان کے اجداد کا تعلق ان کے والد آغا غنی شاہ تک کشمیر سے قائم رہا لیکن خود آغا حشر کا راست تعلق کشمیر سے نہیں تھا۔ والدین نے ان کا نام آغا محمد شاہ رکھا لیکن بعد میں انھیں شہرت آغا حشر کاشمیری کے نام سے ملی۔

جیسا کہ ان دنوں شرفا کے گھروں میں رواج تھا ،آغا حشر کو عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم مولوی حافظ عبد الصمد نے دی جو اس زمانے کے مشہور معلم تھے۔ آغا صاحب کے والد انھیں عالم دین بنانا چاہتے تھے لیکن خود آغا حشر کو انگریزی تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ خاندان کے بعض افراد کے اصرار پر ان کا داخلہ جے نرائن اسکول میں کرا دیا گیا، جہاں انھوں نے درجہ چھ تک تعلیم حاصل کی۔جب تک وہ اس اسکول میں زیر تعلیم رہے، اپنی ذہانت سے اپنے اساتذہ کا دل جیتتے رہے۔ اسی زمانے میں انھیں شاعری کا شوق ہوا اور وہ فارسی اور اردو میں شعر کہنے لگے۔

زمانہ طالب علمی میں ہی آغا حشر کو ڈرامے سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اپنے ہم جماعتوں کو ساتھ لے کر اسکول سے متصل قبرستان میں چادریں تان کر اندر سبھا اسٹیج کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں جبلی تھیٹریکل کمپنی بنارس آئی۔ طلب علموں کو رعایتی داموں پر ٹکٹ فراہم کرنے سے انکار پر آغا حشر نے رفیع الاخبار میں اس کمپنی کے ڈراموں پر شدید نکتہ چینی کی۔

کمپنی کی طرف سے اس کا جواب شائع ہوا تو آغا حشر نے اور شدت سے حملہ کیا۔ اس اخبار بازی سے بچنے کے لیے کمپنی کے مالکوں نے حشر کو مفت ڈراما دیکھنے کی دعوت دے کر مصالحت کرلی اس طرح نہ صرف آغا حشر کو ڈراما دیکھنے کا موقع ملنے لگا بلکہ کمپنی کے ڈائریکٹر امرت لال اور ڈراما نویس مہدی حسن احسؔن لکھنوی سے بھی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک دن کسی بات پر احسن صاحب سے بحث ہو گئی جس کے دوران حشر نے ان سے کہہ دیا کہ جیسا ڈراما آپ لکھتے ہیں، میں ایک ہفتے میں لکھ سکتا ہوں۔ احسن صاحب جیسے پختہ کار کے سامنے ایک نوجوان کا یہ دعویٰ تعلّی کے مترادف تھا تاہم اسے نبھانے کے لیے آغا حشؔر نے نہ صرف ڈراما ''آفتاب محبت'' لکھا بلکہ دوستوں کا ایک کلب بنا کر اسے اسٹیج بھی کر دکھایا۔ یہی آغا حشؔر کا پہلا ڈرامہ ہے جو 1897ء میں جواہر اکسیر پریس، بنارس میں چھپ کر شائع ہوا۔

ایک طرف آغا حشؔر کی دلچسپیوں کا یہ حال تھا ، دوسری طرف ان کے والد آبائی کاروبار میں ان کی دلچسپی نہ دیکھ کر ان کے مستقبل کی طرف سے فکر مند تھے۔ چنانچہ کافی غور و فکر کے بعد انھوں نے اپنے رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے بنارس میں میونسپل بورڈ میں ان کے لیے ایک معقول ملازمت کا انتظام کردیا۔ اس ملازمت کے لیے کچھ زرِ ضمانت مطلوب تھا۔ آغا غنی شاہ بیٹے کو ساتھ لے کر میونسپلٹی گئے لیکن کسی ضروری کام کی وجہ سے مطلوبہ رقم آغا حشر کے حوالے کر کے گھر چلے آئے۔ اتفاقاً کوئی ایسی صورت پیش آئی کہ یہ رقم اس دن میونسپلٹی کے خزانے میں جمع نہ ہوسکی۔ جب آغا حشؔر گھر لوٹ رہے تھے تو راستے میں انھیں کچھ دوست مل گئے جن کی خاطر مدارات میں اچھی خاصی رقم خرچ ہو گئی اس کے بعد والد کی جواب طلبی کے خوف سے ان کا رخ گھر کے بجائے اسٹیشن کی جانب مڑ گیا اور وہ بمبئی جا پہنچے۔

بمبئی آغا حشر کے لیے نئی جگہ تھی۔ ان کے علم میں تھا کہ ان کے ایک دوست عبداللہ بمبئی میں رہتے ہیں۔ وہ انھی کے پاس پہنچے اور ان کے ساتھ رہنے

لگے۔ عبداللہ شاعری کے دلدادہ تھے۔ اتفاق سے اسی دن بمبئی میں کوئی مشاعرہ تھا۔ وہ آغا حشر کو لے کر اس میں شریک ہوئے۔ یہاں کسی بات پر بمبئی پنچ کے ایڈیٹر مولوی فرخ سے ان کی جھڑپ ہوگئی۔ اور یہ جھگڑا بمبئی پنچ کے صفحات تک آگیا۔ اس طرح آغا حشر شہر کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوگئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے ایک دوست کے اصرار پر وہ الفریڈ کمپنی کے مالک کاوس جی پالن جی کھٹاؤ سے ملے۔ کاوس جی اس وقت چائے پی رہے تھے۔ حشر نے ان کے حسب فرمائش چائے پر ایک فی البدیہہ نظم کہہ کر سنائی۔ اس کے بعد انھوں نے حشر کو دوسرے دن ملنے کے لیے کہا۔ حشر یہ سمجھے کہ کاوس جی نے انھیں بڑے سلیقے کے ساتھ ٹال دیا ہے۔ یہ غلط فہمی دور ہونے کے بعد جب وہ کاوس جی سے ملے تو انھیں الفریڈ کمپنی میں ڈراما نویس کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا اور ۳۵ روپیہ ماہانہ مشاہرہ طے ہوا۔ اس کمپنی کے لیے انھوں نے سب سے پہلے مرید شک (1899) لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس کے چند ماہ بعد مار آستین (1899) تصنیف کیا۔ اس ڈرامے کو بھی اسٹیج پر غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

حشر کی مقبولیت بڑھی تو مختلف ڈراما کمپنیوں کی طرف سے انھیں ملازمت کی پیش کش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر نو روز بی پری کی کمپنی کی ملازمت قبول کر لی۔ یہاں انھوں نے اسیر حرص 1901 لکھا۔ یہ ڈراما بھی بے حد پسند کیا گیا۔ حشر کی اس روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر کاوس جی کھٹاؤ نے انھیں دو بارہ ساڑھے تین سو روپے ماہانہ پر اپنے یہاں بلا لیا۔ اس بار اُن کی کمپنی کے لیے انھوں نے شہید ِناز 1902 لکھا جو حسب روایت کافی مقبول ہوا۔اس کے بعد انھوں نے اڈیسر بھائی ٹھوٹھی کی کمپنی کے لیے 1906 میں سفید خون اور 1907 میں صید ہوس اور سہراب جی اُگرا کی کمپنی کے لیے 1908 میں خواب ہستی اور 1909 میں خوبصورت بلا ڈرامے لکھے جنھیں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

ڈراما نویس کے طور پر بے حد مقبول ہونے کے باوجود آغا حشر اپنی موجودہ

حیثیت سے ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھے۔ انھیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی تھی کہ مالکان کمپنی ان کی تحریروں میں اپنی صوابدید کے مطابق تحریف اور کاٹ چھانٹ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد کے ایک تعلقہ دار کے اشتراک سے 1909 میں انھوں نے دی گریٹ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے سہراب جی اگرا کی کمپنی کے لیے لکھا گیا ڈرامہ خوبصورت بلا اسٹیج کیا۔ اس کے بعد اگلے سال 1910 میں اپنا پہلا مجلسی ڈرامہ سلور کنگ عرف نیک پروین لکھ کر پیش کیا۔ اسی سال یہودی کی لڑکی عرف مشرقی حور بھی اس کمپنی کے اسٹیج پر دکھایا گیا۔ حیدرآباد میں مقبولیت کے ڈنکے بجانے کے بعد یہ کمپنی سورت ہوتی ہوئی بمبئی پہنچی اور یہیں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد آغا حشر نے 1912 میں جالندھر کے بھائی گیان سنگھ کی نو تشکیل کمپنی میں پانچ سو روپیہ ماہ وار پر ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ لیکن جلد ہی امرتسر میں یہ کمپنی بھی بند ہو گئی۔

1913 میں آغا حشر نے اپنے ڈراموں کی اداکارہ حور بانو سے لاہور میں شادی کرلی۔ اسی زمانے میں انھیں دہلی میں ایک عوامی استقبالیہ دیا گیا جس میں انھیں انڈین شیکسپیر کے خطاب سے نوازا گیا۔ لاہور پہنچ کر انھوں نے اپنی دوسری کمپنی انڈین شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ یہ کمپنی مختلف شہروں کا دورہ کرتی ہوئی کلکتہ پہنچی۔ یہاں آغا حشر ریلوے پلیٹ فارم سے نیچے گر گئے جس کے نتیجے میں ان کے دائیں پیر کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ چنانچہ انھیں کافی عرصے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اسی علالت کے دوران انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا پہلا ہندی ڈرامہ بھگت سور داس عرف بلوا منگل لکھوایا جو ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کی ہدایت میں پہلی بار 1914 اسٹیج ہوا۔ اس کے بعد کمپنی کھڑگ پور، مظفر پور اور پٹنہ ہوتی ہوئی بنارس آئی۔ قیام بنارس کے دوران آغا حشر کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جو صرف تین ماہ زندہ رہ کر لکھنؤ میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ کمپنی یوپی اور پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتی ہوئی لاہور ہوتے ہوئے سیالکوٹ پہنچی۔ یہاں آغا حشر اپنی زندگی کے ایک اور بڑے حادثے سے ہم کنار ہوے۔ ان کی اہلیہ جن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی ایک طویل علالت کے بعد

1918 میں لاہور میں انتقال کر گئیں۔ شریک حیات کی اس مفارقت نے آغا صاحب پر کچھ ایسے نفسیاتی اثرات مرتب کیے کہ وہ کمپنی کا سارا سامان سیالکوٹ میں چھوڑ کر بنارس چلے آئے۔ اور بہت دنوں تک یہیں آرام کرتے رہے۔ بعد ازاں وہ رستم جی کی دعوت پر کلکتہ گئے اور جے ایف مڈنس کمپنی میں ایک ہزار روپے ماہانہ پر ملازم ہوگئے۔ اس کمپنی کے لیے انھوں نے مشرقی ستارہ عرف شیر کی گرج لکھا (1918) چونکہ کلکتے کے مارواڑی عوام ہندی ڈراموں کے شوقین تھے، اس لیے آغا حشر نے اس زمانے میں بطور خاص ہندی میں لکھنا شروع کیا اور مدھر مرلی (1919) بھارت رمنی (1920) بھگیرتھ گنگا (1920) ایوم پراچین اور نوین بھارت (1921) جیسے ڈرامے لکھے اس کے بعد اردو میں ترکی حور (1922) اور ہندی میں سنسار چکر عرف پہلا پیار (1922) لکھا۔ اسی زمانے میں کلکتہ کی اسٹار تھیٹریکل کمپنی کے لیے انھوں نے بنگلہ زبان میں اپرادھی کے (1922) اور معمر کماری (1922) بھی لکھے۔ اسی کے ساتھ (1919اور 1923 کے درمیان انھوں نے مڈنس کمپنی کی خاموش فلموں میں اپنی اداکاری کے فن کا بھی مظاہرہ کیا۔ مڈنس کے لیے انھوں نے ترکی حور اور سنسار چکر عرف پہلا پیار کے بعد بھیشم پرتگیا (1923) اور آنکھ کا نشہ (1924) لکھے جنھیں زبردست عوامی مقبولیت ملی۔

شہرت اور مقبولیت کی اس بلندی پر پہنچنے کے بعد آغا حشر کے دل میں ایک بار پھر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی کمپنی قائم کریں۔ چنانچہ 1925 میں بنارس میں دی گریٹ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ کی بنیاد پڑی۔ اسے لے کر آغا حشر دورے پر نکلے۔ یہ کمپنی جب بہار اور یوپی کے مختلف اضلاع کا دورہ کرتی ہوئی الہ آباد پہنچی تو مہا راجہ چرکھاری نے جو ان دنوں الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ آغا حشر سے سیتا بن واس کے موضوع پر ہندی میں ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ آغا حشر نے وعدہ کر لیا اور بنارس آکر اس ڈرامے کی تکمیل کی (1928) یہ ڈراما مہا راجہ کو بے حد پسند آیا چنانچہ انھوں نے اسے آٹھ ہزار روپے خرید لیااور آغا صاحب کو مع اپنی کمپنی کے چرکھاری آنے کی دعوت دی۔ وہاں انھوں نے نہ صرف آغا حشر کی

شاگردی اختیار کی بلکہ پچاس ہزار روپے کی گراں قدر رقم کے عوض ان کی کمپنی بھی خرید لی اور آغا صاحب کو ہی اس کا نگراں مقرر کر دیا۔ یہاں سیتا بن واس کا پہلا دیوناگری ایڈیشن جس کی تعداد اشاعت صرف دو جلد تھی (ایک آغا حشر کے لیے اور ایک مہاراجہ چرکھاری کے لیے) ولسن پریس چرکھاری سے مئی 1929 میں شائع ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد کسی بات پر خوش ہو کر مہا راجہ نے کمپنی آغا حشر کو واپس لوٹا دی اور وہیں سے یہ معمول کے دورے پر کانپور کے لیے روانہ ہو گئی۔

اسی درمیان مڈنس تھیٹرز لینڈ نے آغا صاحب کو کلکتے بلایا۔ چنانچہ وہ کمپنی کو آغا محمود شاہ کے حوالے کر کے کانپور ہی سے کلکتے چلے گئے۔ وہاں رہ کر انھوں نے مڈنس کی بمبئی شاخ دی امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف بامبے کے لیے اردو میں رستم سہراب (1929) لکھا جو اسی سال اسٹیج کیا گیا۔ اس کے علاوہ کلکتے میں قیام کے اس زمانے میں انھوں نے مڈنس کے لیے ہندی کے تین ڈرامے دھرمی بالک عرف غریب کی دنیا (1929) بھارتی بالک عرف سماج کا شکار (1930) اور دل کی پیاس (1931) لکھے جو ہندی ڈرامے کی روایت میں ایک گراں قدر بلکہ انقلاب آفریں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آغا حشر نے 1931 میں مڈنس کی ملازمت چھوڑ دی اور بنارس آگئے۔ یہاں ان کے پیر میں چوٹ آگئی۔ دیسی دواؤں سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو وہ علاج کے غرض سے کلکتے پہنچے۔ اس درمیان وہ اور بھی کئی امراض میں مبتلا ہو گئے تھے چنانچہ ماہر امراض قلب ڈاکٹر سنیل بوس کا علاج شروع ہوا۔ یہ دور سخت پرہیز کا تھا۔ ان دنوں کلکتے میں بولتی فلموں کا رواج بڑھ رہا تھا۔ مڈنس تھیٹرز کے مینیجنگ ڈائرکٹر فرام جی نے جو پانیر فلم کمپنی کے مالک بھی تھے، آغا حشر سے فلمی ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کی۔ آغا صاحب نے ان کے لیے شیریں فرہاد لکھا جس میں ماسٹر نثار اور مس کجن نے بنیادی کردار ادا کیے۔ اس فلم کی مقبولیت نے دوسری فلم کمپنیوں کو آغا حشر کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ چاروں طرف سے فرمائشوں کی یلغار ہونے لگی جن کی تعمیل میں انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے فلمی ڈراما عورت کا پیار لکھا جو کافی مقبول

ہوا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے فرام جی کے لیے مزید دو ڈرامے دل کی آگ (1931) اور شہید فرض (1931) لکھے جو مختلف وجوہ سے فلمائے نہیں جا سکے۔ ان کے علاوہ نیو تھیٹرز کے لیے یہودی کی لڑکی اور چنڈی داس ڈرامے لکھے ان کا تیار شدہ فلمیں کافی مقبول ہوئیں۔ اسی دوران مڈنس نے بھگت سورداس (1914) شرون کمار (1931) اور آنکھ کا نشہ (1924) پر ہندی میں اور ترکی حور (1922) اور قسمت کا شکار پر اردو میں فلمیں بنائیں جنھیں عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

آغا حشر کی بیماری کا سلسلہ دھیرے دھیرے طول پکڑتا جا رہا تھا لیکن وہ حوصلہ ہارنے والے شخص نہ تھے۔ اسی عالم میں انھوں نے 1934 میں اپنی فلم کمپنی بنائی اور رستم سہراب کو فلمانے کا ارادہ کیا۔ کرداروں کا انتخاب ہونے کے بعد ریہرسل ہورہی تھی کہ ایک مقدمے کے سلسلے میں انھیں لاہور جانا پڑا۔ یہاں انھوں نے اپنے دوست حکیم فقیر محمد چشتی کا علاج شروع کیا اور یہیں چند دوستوں کے مشورے پر حشر کلچرز کی بنیاد ڈال کر بھیشم پتامہ کی شوٹنگ شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انھیں کئی بار جموں اور سری نگر کا سفر بھی کرنا پڑا۔ اس مسلسل تگ ودو نے ان کی صحت پر مزید برا اثر ڈالا اور مصروفیات کے سبب حکیم صاحب کا علاج بھی باقاعدگی سے جاری نہ رہ سکا۔ چنانچہ اسی بیماری میں 28/اپریل 1935 کو شام کے چھ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ حکیم فقیر محمد چشتی نے آغا محمود شاہ کو کلکتے فون کرکے ان سے لاہور ہی میں تدفین کی اجازت لے لی اور آغا صاحب مرحوم کی وصیت کے مطابق اگلے دن یعنی ۲۹/اپریل کو دن میں میانی صاحب کے قبرستان چار برجی میں انھیں ان کی اہلیہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس کلیات میں شامل ڈراموں کے مطالعے سے پہلے مندرجہ ذیل بنیادی باتوں کا جان لینا ضروری ہے تاکہ دوران مطالعہ پیدا ہونے والے سوالات کا تشفی بخش جواب مل سکے۔

ا۔ 'مار آستین' (1899) آغا حشر کا واحد ڈراما ہے جسے بہ ظاہر انھوں نے

اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنا کوئی ڈراما اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ برجستہ مکالمات بولتے جاتے تھے اور بہ یک وقت کئی منشی انھیں قلم بند کرتے رہتے تھے۔ منشیوں کے لکھے ہوئے ان مسودوں کو وہ شاید ہمیشہ دیکھتے بھی نہیں تھے۔ اور ان منشیوں کی اردو بس واجبی سی تھی اور املا ناقص۔ چنانچہ ان مسودوں میں جگہ جگہ املا کی غلطیاں موجود ہیں، جنھیں مرتبین نے درست کیا ہے۔ آغا حشر کی نظر میں ان مسودوں کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ حکومت کی طرف سے سنسر کے لیے مقرر حاکم مجاز کہانی کو سمجھ لے کہ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اور کردار ادا کرنے والے ایکٹر ان کی مدد سے اپنے مکالمے یاد کرلیں۔ انھوں نے ان مسودوں کی تیاری کے دوران کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ ان کا استعمال انھیں شائع کرنے کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ آغا حشر چونکہ اپنے بیش تر ڈراموں کے ہدایت کار بھی خود ہی ہوتے تھے اس لیے اکثر حالات میں انھیں مسودوں میں ہدایات اور مناظر کی تفصیل تحریر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ جن ڈراموں میں ہدایات موجود نہ تھیں، ان میں مرتبین نے ان کا اضافہ کیاہے۔ جہاں ایسا کیا گیا ہے، اس کی نشان دہی کردی گئی ہے۔

۳۔ ایک ہی ڈارے کے ایک سے زائد مسودے موجود ہونے کا سبب یہ ہے کہ کسی بھی شہر یا ریاست میں ڈراما اسٹیج کرنے سے پہلے اس شہر یا ریاست کے حاکم مجاز سے اسے سنسر کرانا ضروری ہوتا تھا۔ اس غرض سے ہر بار ڈرامے کی نئی نقل تیار کر کے حکام کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ جہاں سے مسودے پر checked and found nothing objectionable کا نوٹ لکھوا لینے کے بعد ہی اسے اسٹیج کیا جا سکتا تھا۔ بیش تر مسودوں پر یہ نوٹ موجود ہے۔

۴۔ عوامی مقبولیت حاصل کر لینے والے کسی ڈرامے کے چند شو مکمل ہوجانے کے

بعد اس میں نیاپن پیدا کرنے اور ناظرین کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کی غرض سے اس میں کبھی بعض نئے مناظر جوڑ دیے جاتے تھے اور کبھی بعض مناظر نکال دیے جاتے تھے۔ ان مناظر کو ڈرامے سے نکال دینے کا سبب ان کی خامیاں یا کمزوریاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایسا محض تبدیلی یا نیا پن پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ آغا حشر کبھی یہ کام ڈراما کمپنیوں کے مالکان کی فرمائش پر کرتے تھے اور کبھی اپنے طور پر۔ اپنے طور پر عموماً اس وقت جب وہ خود ہی کمپنی کے مالک بھی ہوتے تھے۔

۵۔ آغا حشر کا مرکز نگاہ (Target) وہ عام لوگ تھے جو اپنا پیسہ خرچ کر کے ان کے ڈرامے دیکھنے آتے تھے، وہ نہیں جو ادب کو فن لطیف کی حیثیت سے قبول کر کے اپنے اپنے گھروں میں اس کا لطف لینے کے عادی تھے۔ ڈراموں کی تخلیق کے دوران ادب ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے ان کی پوری توجہ ڈرامے کو دیکھے جانے اور ان ناخواندہ اور کم سواد ناظرین کے نقطۂ نظر سے پسندیدہ اور دلچسپ بنانے پر صرف ہوتی تھی، جن کے لیے یہ ایک سہل الحصول اور سستا وسیلہ تفریح تھا۔ شعر وسخن کے شائقین اور ادب کے سنجیدہ قارئین کی خاطر اس کی نوک پلک سنوارنے سے انھیں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ تھیٹر دیکھنے آنے والوں کی اکثریت پہلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور انھی کی پسند پر مالی اعتبار سے کسی ڈرامے کی کامیابی کا دار و مدار ہوتا تھا۔ ناقدین کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ ڈراموں میں اپنی بھرپور ادبی صلاحیت کا استعمال نہیں کر سکے۔

۶۔ اکثر ایک ہی ڈرامے کے دو مسودوں میں کرداروں کے نام بدلے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات کرداروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ مقامات کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'آنکھ کا نشہ'' (1924) کے ایک مسودے میں کردار کالی داس، گوری ناتھ، سوہن اور کامنی ہیں۔ اس کا پس منظر بنارس ہے۔ جب کہ اسی ڈرامے کے ایک دوسرے مسودے میں

کرداروں کے نام جگل کشور، بنی پرساد، مادھو اور کام لتا ہیں اور اس کا پس منظر کولکتہ ہے۔ ان صورتوں میں مرتبین نے بعد میں لکھے جانے والے مسودوں کو بنیاد بنایا ہے۔

۷۔ کلیات کی ترتیب میں مسودوں میں مستعمل قدیم املا کو جدید املا میں بدل دیا گیا ہے۔

۸۔ ایک ڈرامے کے ایک سے زائد ناموں سے موسوم ہونے کا سبب یہ ہے کہ آغا حشر ڈرامے میں معمولی تبدیلیاں پیدا کر کے عوام کو باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ ڈراما اس ڈرامے سے مختلف ہے جو وہ پہلے کسی اور نام سے دیکھ چکے ہیں۔ تاکہ وہ لوگ بھی اسے دوبارہ دیکھنے آئیں جو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس طرح کی تبدیلی صرف آغا حشر نے نہیں کی ہے بلکہ اس عہد کی تمام ڈراما کمپنیاں بھی کرتی تھیں۔

۹۔ آغا حشر کی ہندی اپنے معاصر اردو فن کاروں کے مقابلے میں کافی بہتر تھی۔ لیکن اردو ان کی فطری اور مادری زبان تھی۔ چنانچہ ان کے ہندی ڈراموں کو پڑھتے وقت بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہندی میں مکالمے لکھواتے لکھواتے یک بہ یک اردو بولنے لگتے تھے۔ پھر جیسے ہی انھیں خیال آتا تھا کہ جو ڈراما لکھوایا جا رہا ہے وہ اردو میں نہیں ہندی میں ہے تو وہ پھر ہندی کی طرف آجاتے تھے۔ لیکن یا تو اپنی عدیم الفرصتی کے باعث یا محض تساہل کی بنا پر اتنی اردو رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ وہ مکمل ڈراما پہلے اردو میں لکھاتے رہے ہوں گے اور بعد میں اس کا ہندی میں ترجمہ کرتے ہوں گے۔ اس کا امکان کم ہے کیوں کہ ایسا ہوتا تو بے خیالی میں جہاں وہ فارسی آمیز اردو لکھوا گئے ہیں اسے درست ہوجانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے غالب امکان اسی بات کا ہی ہے کہ وہ فی البدیہہ اور براہ راست ہندی میں ہی ڈراما لکھواتے تھے۔ یہ بات تو اب سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ڈرامے ٹہل ٹہل کر منشیوں کو لکھوایا

کرتے تھے۔

۱۰۔ آغا حشر کے ڈرامے بلا اجازت چھاپنے والے پبلشروں نے ان ڈراموں کے ساتھ بڑی بدسلوکی کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ جو مکالمے یا حصے ان کی سمجھ میں نہیں آئے، ان کو اپنی طرف سے لکھ دیا ہے بلکہ اکثر ان کے ہندی ڈراموں کو کسی اچھے ہندی جاننے والے سے مشکل اور سنسکرت آمیز ہندی میں منتقل کروا کر چھاپا ہے۔ اس تعلق سے بنارس کے ٹھاکر پرساد اینڈ سنز کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو آغا حشر کی ناک کے نیچے یہ کام دھڑلے سے کر رہے تھے۔ آغا حشر نے ذاتی طور پر کبھی اس جانب توجہ نہیں دی۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آغاحشر کے جعلی ایڈیشن چھاپنے والے پبلشرز اپنے منشیوں کو آغا حشر کے لکھے ڈرامے دیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے، جہاں سے وہ اس کے مکالمات نوٹ کر لاتے تھے۔ یہ کام ایک ساتھ ایک سے زائد منشیوں سے کروایا جاتا تھا۔ بعد میں ان کی تحریروں کو ترتیب دے کر اور جو حصے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے ان میں حسب ضرورت اصلاح کر کے یا انھیں اپنی طرف سے ازسرنو لکھ کر ڈراما شائع کردیا جاتا تھا۔ اصلاح و ترمیم کا یہ کام عموماً وہی منشی انجام دیتے تھے جنھیں نمائش کے دوران ان ڈراموں کی نقل کے کام پر مامور کیا جاتا تھا۔

۱۱۔ آغا حشر نے اپنے ہندی ڈراموں کے لیے جو گانے لکھے ہیں ان میں بیش تر فارسی وزن اور بحروں کا استعمال کیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں انھوں نے لوک گیتوں، دوہوں یا موسیقی کی لوک دھنوں کو اپنایا ہے وہاں فطری طور پر عروضی ڈھانچہ بھی ہندوستانی ہوگیاہے۔ انھوں نے بعض ہندی الفاظ کو ان کے رائج عوامی تلفظ کے مطابق استعمال کیا ہے۔

۱۲۔ یہ معاصر ماحول میں رچی بسی انگریزی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے یا پھر شعوری طور پر ایسا کیا گیا ہے کہ عمومی بات چیت کے مکالموں میں آغا حشر

نے حال استمراری (Present Imperfect) کی بجائے حال قریب (Present Indefinite) کا استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اردو میں انگریزی کے اس صیغے (Tense) کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ اردو میں عام طور پر 'وہ جاتاہے' کے بدلے 'وہ جا رہا ہے' کا پیرایہ بیان زیادہ مقبول ہے۔ اور جب 'وہ جاتاہے' کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے عادت کے اظہار کا کام لیا جاتاہے۔ یعنی ایسی جگہوں پر اس کا مفہوم 'وہ جایا کرتا ہے' ہو جاتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ آغا حشر نے ڈرامے میں ایک مصنوعی فضا قائم کرنے کے لیے یہ انداز بیان اختیار کیا ہو۔

اس کلیات کی ترتیب کے دوران ہمیں مسلسل اردو کے معتبر محقق پروفیسر حنیف نقوی صاحب، سابق صدر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کی رہنمائی حاصل رہی ہے۔ ہم ان کے احسان مند ہیں۔ اگر ان کی خاص توجہ نہ ہوتی تو شاید یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ ہی نہ پاتا۔ مسودوں کی تلاش، چھان بین اور انھیں ایک دوسرے سے مربوط کرنے میں خانوادہ حشر کی تیسری نسل سے تعلق رکھنے والے جناب آغا نہال احمد شاہ کاشمیری نے جس طرح ہماری مدد کی ہے، اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

آغاحشر نے اردو ڈرامے کو کیا دیا اس کا تجزیہ خاطر خواہ طریقے سے نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے ڈراموں کی اشاعت یا مسودوں کے تحفظ میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اسٹیج کے عاشق تھے اور ہر ڈرامے کو اسٹیج تک پہنچا کر مطمئن ہوجاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بازاری و کاروباری نوعیت کی بعض غیرمصدقہ اشاعتوں سے قطع نظر یہ ڈرامے اپنی اصل شکل میں کبھی منظر عام پر نہیں آسکے۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ نئی دہلی انھیں باضابطہ طور پر شائع کر رہی ہے تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو ڈرامے کو آغا حشر

کی دین پر خاطر خواہ گفتگو ہو سکے گی۔ اس کام کے لیے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ صاحب اور دیگر اراکین بالخصوص ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ اور ڈاکٹر رحیل صدیقی کا مشکور ہوں کہ انھوں نے ہر طرح سے تعاون کیا۔

مرتبین

بنارس
31/اکتوبر 2003

یہودی کی لڑکی

یہودی کی لڑکی (11-1910)

یہ ڈراما بھی آغاحشر نے 1910 اور 1911 کی درمیانی مدت میں اپنی کمپنی 'دی گریٹ الفریڈ کمپنی حیدرآباد' کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ یہ پہلی بار اسی کے اسٹیج پر پیش ہوا۔ بعد میں اسے مختلف اوقات میں 'مشرقی ستارا' اور 'وفا کی پتلی' کے نام سے بھی اسٹیج کیا گیا۔ یہ ان کے چند مقبول ترین ڈراموں میں سے ایک ہے، جس پر بعد میں فلم بھی بنی۔ اس ڈرامے میں انھوں نے رومنوں کے ان مظالم کی داستان بیان کی ہے جو انھوں نے یہودیوں کے ساتھ روا رکھے تھے۔ اس موضوع پر دیگر معاصر کمپنیوں کے ڈراما نویسوں نے بھی ڈرامے لکھے لیکن وہ 'یہودی کی لڑکی' کی مقبولیت کو نہ پہنچ سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ناظرین بیروں ملکوں کے رہن سہن اور وہاں کے ملبوسات کو اسٹیج پر دیکھنے کے شوقین تھے اور ہر ڈراما کمپنی ان کی اس خواہش کی تکمیل کا خیال رکھ رہی تھی۔

اس ڈرامے کی مقبولیت کو دیکھتے ہوے آغاحشر نے اس کا دوسرا حصہ 'مشرقی حور عرف شیر کی گرج' کے نام سے لکھا تھا، جو مکمل شکل میں دستیاب نہیں ہے۔ ان کے ذخیرے میں اس کا ایک ناقص مسودہ موجود ہے جو الگ الگ کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوے مکالمات کی شکل میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرچے مختلف کرداروں کو ان کے مکالمات یاد کرانے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ چونکہ ان منتشر اجزا کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دینے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی، اس لیے یہ ڈراما اس کلیات میں شامل نہیں ہے۔

'یہودی کی لڑکی' کی ترتیب میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ اور چار مسودے پیش نظر رہے ہیں۔ مطبوعہ نسخہ نرائن دت سہگل، لاہور کا شائع کردہ ہے۔ اس پر سال طباعت درج نہیں۔ اس میں کچھ کرداروں کے نام بھی بدلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'آکٹویا' کا نام 'ڈیسنہ' اور 'حنا' کا نام 'راحیل' ہے، جس کی تائید کسی قلمی نسخے سے نہیں ہوتی۔ ممکن ہے یہ ڈراما شروع میں ان ناموں کے ساتھ بھی کھیلا گیا ہو اور بعد میں کسی مصلحت کی بنا پر بعض نام تبدیل کردیے گئے ہوں۔ مطبوعہ نسخہ کل 100 صفحات پر مشتمل ہے۔

مسودات میں سے پہلا مسودہ مجلد رجسٹر کی شکل میں ہے اس میں کل 95 صفحات ہیں۔ اس کے سرورق پر کاتب کا نام محمد رفیق اور سنہ 1915 لکھا ہوا ہے۔ یہ مسودہ مکمل اور صاف ستھرا ہے اور اسے ہی مشمولہ ڈرامے کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ دوسرا مسودہ بھی رجسٹر سائز میں مجلد ہے۔ اسے منظور احمد عظیم آبادی نے بھاگل پور میں 9فروری 1926 کو مکمل کیا ہے۔ اس پر سنسر کے دستخط ہیں اور تاریخ 29 مئی 1928 لکھی ہوئی ہے۔ ترتیب کے دوران اس مسودے سے بھی جا بہ جا مدد لی گئی ہے۔ اس رجسٹر کی ابتدا میں ڈرامے میں کردار ادا کرنے والے ایکٹروں کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ تیسرا مسودہ بہت خراب حالت میں ہے۔ یہ بھی رجسٹر سائز میں ہے اور اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے سب سے قدیم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں نہ تو سنہ تحریر درج ہے اور نہ کاتب کا نام۔ البتہ کہیں کہیں پنسل سے اصلاح کی گئی ہے جو غالباً خود آغا حشر کے ہاتھ کی ہے۔ یہ نامکمل بھی ہے۔ اس میں پہلے ایکٹ کا پہلا سین نہیں ہے۔ یہ کل 63صفحات پر مشتمل ہے۔ چوتھا مسودہ مجلد کاپی کی سائز میں ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد 126 صفحات ہے۔ املا غلط اور خط مبتدیانہ ہے۔ علاوہ بریں اس پر نہ تو تاریخ تحریر درج ہے اور نہ کاتب کا نام۔

کردار

مرد

1۔	مارکس	رومن شہزادہ
2۔	برولس	مذہبی رہنما
3۔	بعورا	ایک بوڑھا یہودی
4۔	بادشاہ	رومن بادشاہ
5۔	کرامت	نصیبن کا شوہر
6۔	سرخاب	نرگس کا باپ
7۔	شمشاد	نرگس کا عاشق
8۔	رحیم، کریم	سرخاب کے ملازم
9۔	منوا	کرامت کا نوکر

خواتین

1۔	حنا	مارکس کی معشوقہ
2۔	آکٹیویا	رومن شہزادی اور مارکس کی منگیتر
3۔	جونا	آکٹیویا کی ملازمہ
4۔	نرگس	شمشاد کی معشوقہ
5۔	نصیبن	کرامت کی بیوی

پہلا ایکٹ - پہلا سین

محل

(سہیلیوں کا حمد گانا)

والی تو جگ کا ہے۔
جل میں تھل میں تیرے نور کی تجلی دیکھی
میرے والی۔ ڈالی ڈالی۔
کویلیا گُن بھری۔ تو جگ...
برگ و بار، کوہسار، ہرا بھرا پھولن کے بن میں ہے۔
صدف کے تن میں ہے، حشر کے من میں ہے۔ تو جگ...

(سہیلیوں کا جانا اورآکثیویا کا آنا)

آکثیویا : (گانا) مانو برہا ستاوے۔ جی جراوے پریا۔
ہاں مانو..... ہاں مانو.....
ترچھی نجریا کی ماری رے کٹاری پیا۔
لاگی تو ہے پریم کی کٹاری۔
کاری کاری پیا۔
گھایل کیو تن من سب جان۔
بار بار بے شمار، حال راز۔

روئے انکھیاں۔ مانو برہا...

مرمٹے تیرے لیے اور تجھے دھیان نہیں
غیر کا درد نہ ہو جس کو وہ انسان نہیں
او ستم گار، جفاکار نہ ٹھکرا دل کو
توڑنا سہل ہے پر جوڑنا آسان نہیں

مارکس : آکٹیویا۔ تم اور یہاں؟
آکٹیویا : ـ

جو نظر اب ہے وہ پہلے تری بے دید نہ تھی
اس طرح آنکھ بدل لے گا یہ اُمید نہ تھی

آخر اس بے رخی کا سبب؟
مارکس : کوئی نہیں۔
آکٹیویا : اس ناراضگی کا باعث؟
مارکس : کچھ نہیں۔
آکٹیویا : تو پھر کیا ہوگیا؟
مارکس : سودا ہوگیا۔
آکٹیویا : ہوش و حواس کدھر گئے؟
مارکس : مرحوم آرزوؤں کے ساتھ وہ بھی مرگئے۔
آکٹیویا : تو کیا اب مجھے تم سے کوئی آس نہیں؟
مارکس : آس دلانے والی چیز ہی میرے پاس نہیں۔
آکٹیویا : میرے پیارے وہ کیا؟
مارکس : دل۔ ـ

میں دل کو روؤں گا اور روئے گا دل عمر بھر مجھ کو
نہ میری ہے خبر دل کو نہ دل کی ہے خبر مجھ کو

پہلا ایکٹ - دوسرا سین

یہودیوں کا محلّہ

(حنّا کا گاتے ہوئے آنا)

تیر قضا کا نشانہ کوئی ہو مرغ بسمل نہ ہو۔
ظالم یہ تیغ نظر کے ہیں چرکے۔
ترچھی نگاہیں نہ ہوں۔ کسی کی ترچھی.... تیر قضا...
دیکھا نہ مڑ کر شہیدوں کو اپنے۔
آنکھوں سا قاتل نہ ہو۔ تیری ان آنکھوں۔ تیر قضا...
نینوں کے سیناں ہیں چھیت چیناں۔
آوے نہیں نیند۔ پڑے نہیں چیناں۔ تیر قضا...

(مارکس کا یہودیوں کے لباس میں آنا)

مارکس : پیاری حنّا۔ میری یہ خواہش ہے کہ تم چہرے پر نقاب ڈالے بغیر گھر سے باہر نہ نکلا کرو۔

حنّا : اس کی وجہ؟

مارکس : وجہ یہ ہے کہ جس طرح بارش سے دھلے ہوئے شفاف آسمان پر شفق کی سرخی شہاب پاشی کرتی ہوئی حدِ نظر تک پھیل جاتی ہے تو تمام دنیا بے پایاں مستی میں ڈوبی ہوئی پُر شوق نگاہوں سے اس کی دلفریبیوں پر قربان ہونے لگتی ہے۔ اسی

طرح جب تمھارے گلابی گالوں کے عکس سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگانے اور چمکنے لگتا ہے تو قدرت کی مخلوق ہی نہیں خود قدرت بھی تمھیں پیار سے دیکھنے لگتی ہے۔

ہے نظر کاتب کی اپنے ہاتھ کی تحریر پر
خود مُصور بھی مٹا جاتا ہے اس تصویر پر

حنا : تو میرے پیارے۔ تم رشک کرتے ہو؟

مارکس : رشک؟ میں اُس لباس پر رشک کرتا ہوں جو تمھارے خوبصورت جسم کو اپنی آغوش میں لیے رہتا ہے۔ میں اس گلے کے ہار پر رشک کرتا ہوں جو اس دلفریب سینے کے ابھار کو ہر وقت بوسے دیا کرتا ہے۔ میں اس ہوا کے جھونکے پر رشک کرتا ہوں، جو ان لہراتی ہوئی ناگنوں کے پاس سے نڈر ہو کے نکلتا ہے۔ یہاں تک کہ میں تمھارے سائے سے رشک کرتا ہوں جو ان قدموں سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

بندھی ہے ٹکٹکی سب آزماتے ہیں نصیب اپنا
جسے میں دیکھتا ہوں اس کو پاتا ہوں رقیب اپنا
جو حسرت ہے تو یہ حسرت نہ ہوتی تو مقابل میں
تمھیں آنکھوں میں رکھ لوں اور ان آنکھوں کو اس دل میں

(دونوں کا مل کر گانا)

سمند ناز پر کھولے ہوئے وہ بال پھرتے ہیں
بچے کب طائرِ دل جب ہوا میں جال پھرتے ہیں

پھول سے گالوں پہ۔ ناگن سے بالوں پہ۔
ہوں میں فدا۔ اے دل ربا۔
متواری چالوں کی۔ گھونگھر سے بالوں کی۔
زنجیر کی ہوں میں اسیر۔

اسیر پنجۂ عہد شباب کرکے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے
کسی کے درد محبت نے عمر بھر کے لیے
خدا سے مانگ لیا انتخاب کرکے مجھے

ابرو کٹاری۔ سینے پہ ماری۔
تیغ دو دھاری جان۔ پھول سے.....

(دونوں کا گاتے ہوے جانا۔ رومن سرداروں کا داخل ہونا)

سپاہی ۱: تو کیا آپ اس مشرقی ستارہ کو/روم کی کلیوپیٹرا کا خطاب دیتے ہیں؟
کیشیش: ہاں۔ اور اس خطاب پر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے۔ اُس کے حسنِ خدا داد کی داد دینے میں بخل سے کام لے رہا ہوں۔
سپاہی ۲: جب تو اُس کے حُسن کی غلامی کرنے کے لیے رومن سورماؤں میں سے بہت سے سیزر و اینٹونیو پیدا ہوجائیں گے۔
سردار: دیکھو دیکھو وہ کافرادا یہودن اسی طرف آرہی ہے۔
کیشیش: قسم ہے رومن خون کی۔ میں اس روم کی سب سے زیادہ حسین دوشیزہ کا ایک بوسہ لیے بغیر کبھی یہاں سے نہ جاؤں گا۔
سپاہی ۴: بوسہ؟
کیشیش: ہاں۔
سپاہی ۱: اس کی مرضی کے خلاف؟
کیشیش: ہاں۔ ہاں۔
سپاہی ۳: جبراً؟
کیشیش: بے شک۔ ہم کون ہیں؟
سپاہی ۲: معزز رومن۔
کیشیش: اور یہودی کون ہیں؟
سپاہی ۴: رومنوں کے ادنیٰ غلام۔

کیشیش : تو بس پس و پیش بیکار ہے۔ غلام اور غلام کے مال پر آقا کو ہر طرح کا اختیار ہے۔

(حنا کا آنا)

حنا : (پھول سے مخاطب ہو کر) ۔

فدا ہوں جس طرح اُس گل پہ تجھ پر بھی فدا ہوتی
جو تجھ میں اُس کی رنگت، اس کی بو، اس کی ادا ہوتی

کیشیش :

فقط یہ پھول ہی کیا مستحق ہے مہربانی کا
اِدھر بھی اک اُچٹتی سی نظر، صدقہ جوانی کا

حنا : جناب آپ کون ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؟

کیشیش : میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ پھول زیادہ نظر فریب ہے یا یہ؟ یہ زیادہ خوبصورت ہے یا یہ؟ اس کی پنکھڑیوں کو دیکھ کر طبیعت للچاتی ہے یا ان پنکھڑیوں کو؟ اس کو چھاتی سے لگانے کو دل چاہتا ہے یا اس کو؟ ۔

زمیں سے تا بہ فلک، لالہ زار کس سے ہے
بہار کس سے ہے کیف بہار کس سے ہے

حنا : صاحب آپ ہوش میں ہیں؟

کیشیش :

رحم کرتی ہیں کہیں، یہ نرگسِ مے نوش بھی
اک نظر میں دل بھی چھینا ساتھ دل کے ہوش بھی
راہ چلتوں پر یہ ناوک افگنی اچھی نہیں
کہہ دو اِن آنکھوں سے ایسی رہزنی اچھی نہیں

حنا : بس بس۔ ایک غیرت دار شریف زادی اس سے زیادہ اپنی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔

کیشیش :

مست ہے نشاط بھی ہیں باغ باغ بھی
آنکھیں بھی شاد کام ہوئیں اور دماغ بھی
منت پذیر حسن خدا داد کیجیے
یہ ہونٹ رہ گئے ہیں انھیں شاد کیجیے

(حنا کو پکڑ لینا)

حنا : چھوڑ دے۔ چھوڑ دے بے رحم موذی مجھے چھوڑ دے۔

کیشیش :

صرف کر دے زور، جتنا بھی پر و بازو میں ہے
چھٹ چکا وہ صید جو صیاد کے قابو میں ہے

حنا : دوڑو۔ بچاؤ۔ یہ کمینہ میری عزت پر حملہ کرتا ہے۔

(مارکس کا یہودی کے لباس میں آنا)

مارکس : خبردار۔ او بدمعاش پاجی۔ اگر ایک انچ بھی آگے بڑھا تو یہ بالشت بھر کی چھری قبضے تک سینے میں اتار دوں گا۔

کیشیش : تو کون؟

مارکس : تجھ پر لعنت بھیجنے والی زبان، تجھے سزا دینے والا ہاتھ۔

پاجی ہو تم کہ پاس شرافت نہیں تمھیں
تلوار باندھنے کی بھی غیرت نہیں تمھیں
ہو دم تو آؤ ساتھ مرے ہم نبرد ہو
عورت سے جنگ، کون کہے گا کہ مرد ہو

کیشیش : حقیر ہستی۔ کیا تو رومن قوم کے معزز نوجوان کا مقابلہ کرنے آیا ہے؟

مارکس : معزز؟ ایسی کمینی حرکتیں اور معزز؟ جب تمھارا دل، تمھارا خیال، تمھاری ہر چیز ذلیل ہے تو پھر تمھارے معزز ہونے کی کیا دلیل ہے؟

کہیں اعزاز ہوتے ہیں جہاں میں ان قرینوں کے
جو عادت ہے رذیلوں کی جو لچھن ہیں کمینوں کے
معزز وہ ہے جس کے قول اچھے ہوں، عمل اچھے
درخت اچھا وہی کہلائے گا جس کے ہوں پھل اچھے

کیشیش : بس خاموش۔ شاید تیرے دل میں اپنی زندگی کا پیار نہیں ہے۔ کیا تو رومن قوم کے غرور، غصہ اور ہیبت ناک انتقام سے خبردار نہیں ہے؟

مارکس : ذلیل غلام۔ تو اپنے پاجیانہ خیالات کے اظہار میں تمام رومن قوم کو کیوں شامل کرتا ہے؟

یہ طرز زیست ہے ان کی نہ یہ قرینہ ہے
وہ سب کمینے نہیں صرف تو کمینہ ہے

کیشیش : بس یہ اپنی بدزبانی سے اپنے موت کے فتوے پر مہر کرچکا۔ سپاہیوں باندھ لو اس باغی کو۔

مارکس : بدبخت، نامراد۔ بھالے نیچے جھکا دو۔

کیشیش : کس کے حکم سے؟

مارکس : میرے حکم سے۔

کیشیش : تو کون؟

مارکس : دیکھ۔

(مارکس کا سینہ کھول کر نشان شاہی دکھانا)

کیشیش : کون شہزادہ مارکس؟ آپ؟

مارکس : چُپ۔

(سپاہیوں کا بھالے جھکا دینا اور حنّا کا مارکس سے لپٹ جانا)

پہلا ایکٹ - تیسرا سین

راستہ

(بروٹس کا اپنے سرداروں کے ساتھ آنا)

بروٹس : جاو اس ذلیل کتے سے کہو کہ فوراً حاضر ہو۔ اگر حکم سننے کے بعد آنے میں عذر کرے تو داڑھی سے پکڑ کر منھ پر تھوکتے اور پیٹھ پر لاتیں مارتے یہاں لے آؤ۔

سردار : مقدس باپ۔ تلوار کی حکومت ہی بہترین حکومت ہے۔ نرمی برتنے سے حاکم وقت کا رعب و داب جاتا رہتا ہے۔ اور محکوم قوم کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ان سرکش یہودیوں کا صرف یہی علاج ہے کہ ایک پوری اور آخری ضرب لگا کر ان کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے۔ ڈسنے سے پہلے ان آستین کے سانپوں کا زہر نچوڑ دیا جاے۔

بروٹس : بھول گئے۔ بھول گئے۔ یہ محسن کش، احسان فراموش، وہ دن بھول گئے۔ جب فرعون کی زمین پر مصریوں کے ہاتھوں سے کوڑے کھاتے تھے، جب بابل کی گلیوں میں بخت نصر کی قوم کے ہاتھوں غلام بناکر دو دو پیسے کو بیچے جاتے تھے۔ ؎

انھیں پناہ دی، ان کے دکھوں کو دور کیا
سلوک ان سے کیے، یہ بڑا قصور کیا

(ایک سپاہی کا ایک یہودی شخص عِزرا کو لیے ہوے آنا)

سپاہی ۲: آگے بڑھ اور جھک ان قدموں کے آگے۔

عزرا: جھکوں؟ کس کے آگے، ان قدموں کے آگے؟ جن قدموں نے اِس سر سے بھی زیادہ سفید اور بوڑھے سروں کو ٹھوکریں ماری ہیں۔ جنھوں نے اپنی جوتی کی نوک کی ضربوں سے ہماری مظلوم قوم کے کلیجے میں چھریاں اتاری ہیں؟ ۔

قیامتیں ہوں کہ آفتیں ہوں، جہان جائے کہ جان جائے
مگر یہ ممکن نہیں ہے ہرگز کہ اُس کے بندے کی آن جائے
اُسی کی چوکھٹ پہ ہوں گے سجدے، جدھر وہ ہوگا ادھر جھکے گا
بجز خدا کے کسی کے آگے نہ دل جھکا ہے نہ سر جھکے گا

بروٹس: بے ادب گستاخ سُن کہ تجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟ تو یہودی قوم کا سرغنہ ہے۔ اس لیے میں اپنا حکم تیری زبان سے تیری قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ ان سے کہہ دے کہ روم کا مذہبی پیشوا یہودیوں کو عطا کی ہوئی مذہبی آزادی آج بطور جرمانہ ضبط کرتا ہے۔

عزرا: کیوں؟

بروٹس: کیونکہ وہ میرے حکم کے مطابق اپنی مذہبی رسمیں پوشیدگی اور خاموشی کے ساتھ ادا نہیں کرتے اور اس دلیری کو پڑوس میں رہنے والے رومن اپنے دیوتاؤں کی ہتک سمجھتے ہیں۔

عزرا: تو کیا ہم اس زبان کو کاٹ کر پھینک دیں جو راحت میں اظہار شکر اور مصیبت میں طلب رحم کے لیے اپنے خالق و مالک کا نام لیتی ہے؟ یہودی قوم اس خلاف مذہب حکم کو کبھی نہ مانے گی۔

بروٹس: تب میں تمام یہودی قوم کو باغی اور تجھے باغیوں کا سردار قرار دے کر خوفناک سزا دوں گا۔ احمق کیا تو میرے حکم سے سرکشی کرکے اپنے اور اپنی قوم کے لیے کوئی بہتری کی امید رکھتا ہے؟

عزرا: اب ہمارے لیے صرف آسمان میں امید باقی رہ گئی ہے۔ جہاں نہ تمھاری حیوانی تہذیب ہے، نہ تمھارا ظالمانہ قانون ہے، نہ تمھاری شیطانی سلطنت ہے۔

وہیں پر اب تسلی خانماں برباد پائیں گے
وہیں اس بے کسی و بے بسی کی داد پائیں گے
لہو ان آستینوں کا گواہی دے رہا ہوگا
اِدھر مظلوم، اُدھر ظالم، مقابل، میں خدا ہوگا

بروٹس : مفسد، ملعون۔ ہمارے عقیدوں، رسموں اور مذہبی تہواروں کے ساتھ علانیہ نفرت کا اظہار کرنا اور پھر دنیا کے سامنے اپنی بے گناہی آشکار کرنا۔ کتو۔ ہم جانتے تو تمھیں آزادی اور زندگی کبھی نہ دیتے۔

عِزرا : اس ملک روم میں آزادی اور زندگی یہ دونوں چیزیں کسی قیمت پر ملی ہیں اور نہ مل سکتی ہیں۔ جس طرح کوئی گناہ یا شرم کا کام کرتا ہو۔ اُسی طرح اپنے خالق و مالک کی عبادت اور اپنے مذہبی اور رسم و رواج کو چھپانا، تمھاری قوم کے ذلیل سے ذلیل آدمی کے سامنے بید کی طرح تھرّانا۔ اپنی قوم کی دولت، عزت، عصمت کو لٹتے ہوئے دیکھنا اور کلیجہ مسوس کر رہ جانا۔ اس کا نام آزادی اور زندگی ہے۔ نہیں یہ حالت زندگی کے لیے دائمی لعنت اور ابدی شرمندگی ہے۔ ؎

شجرِ زیست کے چن چن کے ثمر توڑے ہیں
تم نے دل توڑے ہیں ہم سب کے جگر توڑے ہیں
تم ہو وہ پیکر بیداد و تعصب جس نے
سینکڑوں لاکھوں ہی اللہ کے گھر توڑے ہیں

بروٹس : اگر تیرے خدا کو تجھے اس دنیا میں آزاد اور معزز رکھنا منظور ہوتا تو یہودیوں کی ذلیل قوم میں تجھے پیدا ہی نہ کرتا۔

عِزرا : یہودی قوم اور ذلیل؟ کیوں؟ وجہ؟ کیا یہودی اس لیے ذلیل ہیں کہ تمھارے جیسے لامذہب، بے اُصول، متعصب خود غرض، بے رحم، جفا شعار اور بدکار نہیں ہیں۔ کیا اس لیے ذلیل ہیں کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کو لوٹنے، روندنے اور ذلیل حالت کو پہنچانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کیا اس لیے ذلیل ہیں

کہ وہ ایک خدا، ایک شریعت اور ایک قانون کو مانتے ہیں۔ کیا اس لیے ذلیل ہیں کہ جس طرح وہ اپنی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں اسی طرح دوسرے کے دکھ کو بھی دکھ جانتے ہیں۔ ؎

اگرچہ خاک بسر اور شکستہ پر ہیں ہم
خراب، خستہ و برباد، در بدر ہیں ہم
مگر خلیق، وفا دوست، خوش سیر ہیں ہم
فراخ مشرب و ذی علم، ذی ہنر ہیں ہم
جو تم شریف تو تم سے شریف تر ہیں ہم

بروٹس : تو دوہ ملامت۔ تو رومن قوم کے سلوک کے لیے اسے ملزم ٹھہراتا ہے مگر اپنے گریباں میں منھ ڈال کر اپنے دل سے پوچھ کہ تیری ملعون اور سرکش قوم نے اپنے خدا، اپنی کتاب اور اپنے نبیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

عزرا : کیا کیا؟

بروٹس : تم نے، ہاں تم نے ابراہیم اور موسیٰ کے خدا کو ٹھٹھوں میں اڑایا۔ اپنی کتاب توریت کے احکام کو جھٹلایا۔ اپنے ہم قوم مریم کے بیٹے مسیح کو سولی پر چڑھایا۔ ؎

کیوں کبھی اس کا کبھی اُس کا گلا کرتا ہے
جو بھی کرتا ہے ترے ساتھ خدا کرتا ہے
رنگ لائے ستم و جور، بد افعال ترے
ویسا ہی حال ہوا جیسے تھے اعمال ترے

عزرا : اگر یہودی قوم کے ذلت و بربادی کا حال معلوم ہوگیا ہے تو ہماری پہلی حالت سے موجودہ حالت کا مقابلہ کرکے مستقبل کے فیصلے سے لرزو اور اپنے طریق حکومت اور طرز عمل کی اصلاح کرو۔ ؎

مہمل نہیں اگرچہ کلام ادق ہوں میں
میری سنو زمانے کی آواز حق ہوں میں

جس میں لکھے ہیں راز نہاں وہ ورق ہوں میں
مجھ کو پڑھو کتاب فنا کا سبق ہوں میں
عبرت کدہ بنا ہوں عروج و زوال کا
آئینہ ہوں زمانۂ ماضی و حال کا

بروٹس : اگر رومن قوم سے نفرت کا خیال دل سے نہ جائے گا تو جس طرح تیرا ماضی حال پر رو رہا ہے اسی طرح تیرا حال تیرے اور تیری قوم کے مستقبل پر آنسو بہائے گا۔ ؎

ہماری تیغ غضب اور ترا گلو ہوگا
نہ تیری قوم ہی ہوگی کہیں، نہ تو ہوگا

عزرا : جاؤ جاؤ۔ جب تک خدا اپنی زمین پر ہم کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اُس وقت تک تمام دنیا کی طاقتیں بھی مل کر ہماری قومیت کو نیست و نابود نہیں کرسکتیں۔ ؎

ممکن نہیں لگائے کوئی نابکار ہاتھ
دشمن کے گر ہیں دو تو ہیں اس کے ہزار ہاتھ

بروٹس : یہ جواب؟

عزرا : ہاں۔

بروٹس : ان دیکھے خدا پر اتنا بھروسا؟

عزرا : ارے ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔

بروٹس : تیرا مغرور حلم میرے تحمل کا منہ چڑھا رہا ہے۔ اچھا جاؤ (سپاہیوں سے) جلتی ہوئی مشعلیں اور بربادی کو ساتھ لے کر یہودیوں کے محلے میں جاؤ۔ ان کی سرکشیوں کا آج ہی انھیں مزہ چکھا دو۔ اِن کے باغ، محل، دوکان، سامان سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دو۔ ؎

آتش فشانیوں سے زمیں شعلہ زار ہو
ہر در پہ ایک لاش ہو ہر گھر مزار ہو

عزرا : ارے نہیں نہیں۔ تمھارا مجرم، تمھارے گھوڑے کی ٹاپوں سے پامال ہونے والا مٹی کا ڈھیر، تمھارے گرسنہ غصے کا لذیذ لقمہ صرف میں ہوں۔ مجھے سولی پر چڑھا دو۔ زندہ آگ میں جلادو۔ اس جھرّی دار بوڑھے جسم سے بوٹیاں تراش تراش کر اپنے شکاری کتوں کو کھلا دو۔ مگر میری بے کس، مظلوم قوم پر برداشت سے زیادہ ظلم نہ کرو۔ ۔

سبھی مجرم نہیں، ہیں چند بد، تو لاکھ اچھے بھی
کرو رحم، اُن میں بیوائیں بھی ہیں، بوڑھے بھی، بچے بھی

بروٹس : ہاں اور آج ان سب کو آگ اور موت کے حوالے کیا جائے گا۔ ۔

سامنے شعلوں کے رونا بے گناہی قوم کی
(جاؤ!) تو بھی ساتھ جا، دیکھ اب تباہی قوم کی

عزرا : سمجھ گیا۔ میری ہی بھول تھی جو رحم کی بھیک مانگنے کے لیے دوزخ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ مغرور رومنو۔ تاریخ ایک مرتبہ ضرور اپنے کو دہراتی ہے۔ اس لیے سنو، اور یاد رکھو۔ جس طرح مصر، بابل، نینوا، کارتھج اور اسیریا کی ظالم اور سرکش قومیں دنیا کے جسم پر پھوڑے کی طرح پیدا ہوکر خدائی نشتر سے نیست و نابود ہوگئیں اسی طرح تمھاری رومن قوم اور رومی سلطنت کا بھی زوال ہوگا۔ آنے والے وقت کی ٹھوکروں سے تمھارا غرور بھی ضرور پامال ہوگا۔ ۔

کہاں تک مضحکہ کرتے رہوگے، بے ادب اس کا
کبھی تم کو نہ چھوڑے گا ستم گارو غضب اس کا

پہلا ایکٹ - چوتھا سین

یہودی محلہ

آوازیں : آگ لگی۔ آگ لگی۔ بھاگو۔ بھاگو۔

(رومن سپاہی ہاتھوں میں مشعلیں لیے ہوئے محلے کے مکانوں میں آگ لگا رہے ہیں۔ بچے، بوڑھے، جوان، سب وا ویلا مچاتے ہیں۔ رومن سپاہیوں کے یہودیوں پر مظالم، عزرا کا داخلہ۔ حنا کو چیختا چلاتا دیکھ کر عزرا پل پر چڑھتا اور اسے ساتھ لے کر نیچے آتا ہے۔ شعلے زیادہ بھڑک اٹھتے ہیں)

پہلا ایکٹ - پانچواں سین

مکان

(نصیبن کا گاتے ہوئے آنا)

دیکھو موئے کھوسٹ کا جھوٹا یہ پیار۔
کھانے کو مانگو تو جوتی پیزار۔
نہ پیسہ پاس ہے۔ بڑا دل اُداس ہے۔
کھوسٹ سے ہوں بیزار۔ ہاں رے موئے...
میرے نازک بدن پر۔ عارض چمن پر۔
ایسے موئے کو کروں میں نثار۔
لوں پیزار۔ ماروں چار۔ روئے زار زار۔
موئے کھوسٹ پہ اللہ کی مار۔ دیکھو موئے.....

نصیبن : صورت گوری۔ نصیب کالا۔ نگوڑی قسمت نے ایسے بدبخت کے پالے ڈالا۔ کہ کمانے کو کہیے تو کرتا ہے حیلہ حوالہ۔ بگڑو تو جوتا وہ بھی سادہ نہیں نعل والا۔ موئے کی آنکھوں میں پڑجائے جالا۔ ڈس جائے ناگ کالا۔ مرتا بھی نہیں ہے رذالا۔ جس سے چھوٹ جائے میرا پالا۔

(کرامت کا آنا)

کرامت : بس بس۔ کتنی دعائیں دوگی میری خالہ۔

نصیبن : ارے موئے۔

کرامت : ارے موئی۔

نصیبن : ارے میں پوچھتی ہوں کہ تو کہیں جا کر نوکری کیوں نہیں کرتا؟

کرامت : ہیں نوکری۔ کیا کوئی میرے باوا کا نوکر ہے جو مجھے نوکری دے گا؟ بیوی وہ دن گئے جب ایک کماتا تھا اور دس کھاتے تھے۔ اب تو ایک کا پیٹ بھرنا بھی محال ہے۔ بڑی نوکری تو گئی جہنم میں۔ اگر جوتا صاف کرنے کی نوکری مانگنے جاؤ تو کہتے ہیں پہلے بی اے کلاس کا سرٹیفکٹ دکھلاؤ۔ میں تو آج کل کیمیا بنانا سیکھ رہا ہوں۔

نصیبن : ارے بے وقوف یہ کیمیا کس جانور کا نام ہے؟

کرامت : جانور کا نام نہیں ہے۔ یہ ہے ایک قسم کا علم۔ پیاری تھوڑے دنوں میں تمھارے ناک، کان، ہاتھ، پاؤں سب سونے سے پیلے ہوجائیں گے۔

نصیبن : یہ مانا جب باوا مرے گا تو بیل بٹے گا۔ مگر یہاں تو گھر میں پاؤ بھر آٹا بھی نہیں ہے۔ آج کا دن کیسے کٹے گا؟

کرامت : پھر وہی بیہودہ جھگڑا نکالا۔

نصیبن : موئے جھگڑا کیسا۔ کھانے کو لاتا ہے یا جوتیاں کھاتا ہے؟

کرامت : دیکھو بیوی میں پٹھان آدمی ہوں۔ بہت جلد غصے میں آجاؤں گا۔ اور اس وقت بھوکا بھی ہوں۔ بگڑ گیا تو ناک ہی چبا جاؤں گا۔

نصیبن: چل چل بڑا آیا ہے ناک کاٹنے والا۔ تو کوئی رستم ہے یا اسفندیار کا سالا؟

کرامت: میں سفید دیو کا بہنوئی ہوں۔

نصیبن: تو میں لال دیو کی خالہ ہوں۔

کرامت: کیا کشتی لڑے گی؟ ایسے جوتے لگاؤں گا کہ سر کی دھول جھڑے گی۔ چپ بیٹھ۔

نصیبن: کیوں چپ بیٹھوں۔ تو ایک کہے گا۔ میں تجھے دس سناؤں گی۔

کرامت : او میرے باپ کے غصے۔ کم الانگ۔

نصیبن : ارے دیسی چمار۔ باپ تو تیرا مرگیا۔ اب اپنی اماں کو پکار۔

کرامت : شیطان کی نانی، نہیں چھوڑتی بدزبانی؟

(نصیبن کرامت کو مارتی ہے اور خود ہی چلاتی ہے)

نصیبن : ارے کوئی آوٗ۔ یہ مجھے مارتا ہے، میری جان بچاوٗ۔

(کریم اور رحیم کا آنا)

دونوں : کیا ہے۔ کیا ہے؟

کریم : یہ کیا ستم نظر آتا ہے؟ اے کم بخت مرد ہوکر عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔

کرامت : پھر تجھے کیا۔ تو کیا کوئی خدائی فوجدار ہے؟

رحیم : اے بے غیرت مرد ہوکر عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اوپر سے غراتا ہے۔

نصیبن : تم کون۔ ہمارا دل ہے مار کھانے کو۔ تم کیوں آئے بچانے کو؟

کریم : ارے یار۔ یہ عورت تو گلے پڑو ہے۔

نصیبن : عورت کا بچہ۔ نکل جا۔ نہیں تو کھا جاوٗں گی کچا۔ لو پیارے دس پانچ ہاتھ اور لگاوٗ۔

کریم : ہاں اُستاد۔ ونس مور۔ دس یہ کہتی ہے اور دس دس ہم دونوں کی طرف سے لگاوٗ۔

کرامت : واہ میں اپنی اکلوتی بیوی کو کیوں ماروں۔ یہ تو مجھے اپنی بہن سے زیادہ پیاری ہے۔

نصیبن : میاں میں تمھاری باتوں کا بُرا کیوں مانوں۔ تم تو مجھے بھائی سے زیادہ پیارے ہو۔

کریم : لو چلو۔ یہ بہن اور یہ بھائی۔ پھر ہم تم کون؟

نصیبن : اُلو، گدھے، سودائی۔

کرامت : نہیں نکلتے ناسزائی۔

(کرامت اندر جاتا ہے)

رحیم : ارے یہاں کہاں لے آیا؟

کریم : ابے لنگڑے تو ہی تو لایا ـــــــ بیگم معاف کرنا۔ ہم تو ایک تجربہ کار حکیم کی

تلاش میں آئے تھے ادھر سے تمھارا غل سنا تو جان بچانے کو چلے آئے۔

نصیبن : ٹھیک ہے۔ اب میں اس موئے کی حجامت کراتی ہوں۔ (جاتے ہوئے رحیم کریم کو آواز دیتے ہوئے) اجی میاں۔ اجی او صاحب۔ ابھی آپ نے حکیم کا ذکر کیا تھا؟

دونوں : جی ہاں۔ جی ہاں۔

نصیبن : بھلا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ آپ بے کھٹکے ان کو لے جایئے۔ ان کی کیا بات ہے۔ واقعی ان کا علاج کرامات ہے۔

کریم : بیگم یہ تو کوئی اول نمبر کا گھاسلیٹ معلوم ہوتا ہے۔

نصیبن : اجی توبہ کرو۔ ورنہ بخشے نہ جاؤگے۔ انھوں نے صورت ہی ایسی پائی ہے اور ایک بات اور سن لو۔ یہ جب تک مار نہیں کھائیں گے، حکیم ہونے کا اقرار نہ کریں گے۔

کریم : پھر اس کا کیا علاج؟

نصیبن : اجی سر کے رستے سے جوتوں کا مکسچر پلاؤ۔

رحیم : دیکھنا پھر بُرا نہ ماننا۔ تم ان کی بیوی ہو۔

نصیبن : کون بیوی ہے۔ میں تو ان کو دلگی سے میاں کہتی ہوں۔

(کرامت ڈنڈا لے کر آتا ہے اور کریم و رحیم کو مارتا ہے)

کرامت : ایک۔ دو۔ تین۔

کریم : بس حکیم صاحب بس کیجیے۔ ورنہ آپ کا ہاتھ دکھ جائے گا۔ پھر نسخہ کس طرح لکھیے گا؟

کرامت : پاگل بے وقوف۔

رحیم : نہ پاگل ہے اور نہ بے وقوف۔ وہ تو گونگی ہو گئی ہے۔

کرامت : میں کوئی حکیم ویکیم نہیں ہوں۔ پوچھ لو میری بیوی سے۔

نصیبن : بیوی کون؟ بس بس حکیم صاحب میری دلگی نہ کیجیے۔ میں تمھاری بیوی نہیں ہوں۔ میرا میاں تو چار مہینے ہوئے گذر گیا۔ ہیضے سے مر گیا۔

کرامت : اری او ہیضہ کی خالہ۔
کریم : بس بس حکیم صاحب۔ یہ کیا گڑبڑ گھوٹالا۔
کرامت : ارے تم لوگوں کو دلگی سوجھتی ہے۔ یہاں پالی پوسی بیوی ہاتھ سے جاتی ہے۔
رحیم : اجی حکیم صاحب۔ انعام پایئے گا تو اور پٹاخہ سی بیوی بیاہ لایئے گا۔
کرامت : ایسے حکیم پر شیطان کی مار۔
کریم : تو پھر بس لگاؤ یار۔
رحیم : (مارنا) ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔
کرامت : ارے باوا۔ میں حکیم۔ میرا باپ حکیم، میرا دادا حکیم۔ بلکہ سارا خاندان حکیم۔
کریم : ہاں۔ اب کیسے قبولا۔
کرامت : ہاں۔ میں بھولا۔ چلیے اب چلنے کو تیار ہوں۔
رحیم : اچھا تو لیجیے نذرانہ فیس مریضہ کو دیکھنے کے بعد ملے گی۔ ہم ابھی سواری لاتے ہیں۔ اور آپ کو لے جاتے ہیں۔

(دونوں کا جانا)

کرامت : واہ واہ۔ حکیم بننے میں تو بڑا فائدہ ہے۔ مگر مار مار کر حکیم بنانا کہاں کا قاعدہ ہے؟
نصیبن : کیا ہوا مار کھائی۔ رقم تو آئی۔
کرامت : ہاں سچ کہتی ہو میری لگائی۔ مگر ٹھہر تو میری بیوی نہیں ہے۔
نصیبن : کون کہتا ہے۔ پیارے میں تمھاری بیوی تمھارے باپ کی بیوی۔
کرامت : تو پھر اپنے بھائیوں کے سامنے کیوں مکرتی تھی؟
نصیبن : وہ تو میں دلگی کرتی تھی۔

(دونوں کا گانا)

بوڑھے غمزے نہ ہم کو دکھاؤ۔ شرماؤ چلے جاؤ۔
پیاری مٹکو، نہ ہاتھ میرا جھٹکو، گلے سے لگ جاؤ۔

جارے سیلانی۔ باتیں دیوانی۔ نہ کر مستانی۔
یاں سے سٹکو۔ بوڑھے غمزے...
میری جان و جگر۔ تجھ پہ صدقے قمر۔ کلکتہ والی گوہر۔
میں موٹر میں تجھ کو بٹھاؤں گا۔ پم پم۔
تھیٹر میں ناٹک دکھاؤں گا۔
ونس مور۔ نو مور۔
اور تجھے گارڈن کی ہوا کھلاؤں گا۔
باتوں میں گھاتوں میں۔ مجھ کو پھنساتے ہو۔
جاؤ جی جاؤ کیا گڑیا سمجھتے ہو۔
صبح سے بیٹھا تھا تیری راہ میں۔
در سے سر کو پٹکو۔ بوڑھے غمزے...

(شمشاد کا آنا)

شمشاد : جناب حکیم صاحب۔ آداب۔ تسلیم۔ کورنش۔
کرامت : آیئے حکیم صاحب۔ آیئے حکیم صاحب۔
شمشاد : جناب میں حکیم نہیں ہوں۔
کرامت : نہیں جناب۔ یہ آپ کی خاکساری ہے۔ آپ حکیم ضرور ہیں۔
شمشاد : واللہ۔ جناب میں حکیم نہیں ہوں۔
کرامت : نہیں ہو تو کون ہو؟
شمشاد : میں نے ٹھیک سنا تھا کہ یہ پاگل بھی ہے۔ جناب آپ یقین کیجیے کہ میں حکیم نہیں ہوں۔
کرامت : کیوں نہیں ہو۔ ضرور ہو۔

(کرامت شمشاد کو پیٹتا ہے)

شمشاد : اجی ہوں میں حکیم ہوں۔

کرامت : اب آیا سیدھے راستے پر، نامعقول۔
شمشاد : کیا جناب آپ گھونسے سے حکمت پڑھاتے ہیں؟
کرامت : جی ہاں۔ جب سے پلیگ میں حکیم مرگئے ہیں۔ مار مار کر حکیم بناتے ہیں؟
شمشاد : خوب۔
کرامت : ابے مجھے بھی اسی طرح حکیم بنایا ہے۔ اب بتاؤ تو یہاں کیوں آیا ہے؟
شمشاد : جناب آپ جس لڑکی کا علاج کرنے جاتے ہیں وہ کوئی گونگی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ مجھ پر مرتی ہے۔
کرامت : ابے تجھ پر۔ تجھ پر۔ اس جھڑوس شکل پر؟
نصیبن : میاں آپ سے اچھی ہے۔
کرامت : چپ بدتمیز۔
شمشاد : اُس کا باپ اس کی مرضی کے خلاف دوسری جگہ شادی کرنے کو تیار ہے۔
نصیبن : میں سمجھی یہ گڑبڑ گھوٹالا۔ شادی رک جاے اسی لیے اس نے گونگی کا سوانگ نکالا؟
شمشاد : جی ہاں بیگم۔ یہی بات ہے۔
کرامت : ابے بیگم کے بچے اپنی ماں سے کیا کہتا ہے۔ باپ سے بات کر۔
شمشاد : اتنی مہربانی فرمایئے کہ مجھے اپنا نوکر یا دوست یا اور کچھ بنا کر کسی بہانے سے ساتھ لے جایئے۔
کرامت : ابے میں لے جاؤں۔ تو نے مجھے کوئی ملاؤ خاں دلّال جانا ہے۔
شمشاد : لیجیے آپ کا نذرانہ۔
کرامت : اچھا منظور۔ چل ہو جا کافور۔ لو بیوی اب کھاؤ تنجن اور موتی چور۔
نصیبن : اے میرے حکیم تیرا سارا پلیگ دور۔

(سب کا گانا)

مار کھائی حکمت آئی
چلیے چلیے جناب۔ ابھی آیا شتاب۔ مار...

لائے ہیں ٹنو میاں۔ ٹھہرو بجر بٹو میاں۔ جاؤ نکھٹو میاں۔ میں ہارا۔
خوب مارا۔ بھوت اتارا۔ آؤ آؤ جلدی آؤ۔

جا اے جان۔ ہٹ نادان۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ آہا ہا ہا ہا۔ مار....
جاؤ حکمت دکھاؤ۔ اور پیسے ٹھگ لاؤ، میں ریشم کی ساڑی بناؤں گی۔
اور گوٹے کی انگیا سلاؤں گی۔
یہ ہے کتنی سی بات۔ سنائی گھات۔ وہ ماری لات۔ مار...

پہلا ایکٹ - چھٹا سین

عزرا کا مکان

(حنّا اور مارکس آتے ہیں)

مارکس : میری جان حنّا اگر ایک کنگال مفلس آدمی کو، اس ملک روم کے قیصر کا تخت و تاج مل جاتا یا ایک دنیا سے ناراض فلسفی کو اس دنیا میں ہمیشہ زندہ اور خوش رہنے کا راز معلوم ہو جاتا تو اسے بھی اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی خوشی مجھے تمھارے ان دل بڑھانے والے لفظوں سے حاصل ہوئی ہے۔ ۔

اب سمجھتا ہے یہ قطرہ بھی کہ دریا ہو گیا
روح کو ان پیارے لفظوں سے نشہ سا ہو گیا
آرہی ہیں شادیاں شور مبارکباد ہے
دل مرا اب ایک شہر تہنیت آباد ہے

حنّا : میں حیران ہوں کہ اس روز ان انسان نما درندوں کے زور کس قوت نے گھٹا دیے۔ تم میں وہ کون سی چھپی ہوئی طاقت ہے جسے دیکھتے ہی ظالم رومنوں نے اپنے خونی برچھے اور مغرور سرزمین کی طرف جھکا دیے۔ ۔

دریا کا جوش رک گیا، طوفان تھم گیا
جو تھا جہاں لرز کے اسی جا پہ جم گیا

مارکس : پیاری حنّا۔ جس طرح اکثر لوگ سانپ اور بچھو کا منتر جانتے ہیں، اسی طرح ان رومنوں پر قابو پانے کے لیے میرے پاس بھی ایک طلسم ہے۔ ۔

مجھ پہ ہے قابو ترا اور ان پہ ہے قابو مرا
ایک ساں ہیں پُر اثر گیسو ترے، جادو مرا

حنا : مگر دیکھنا پیارے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ ؎

کہیں ایسا نہ ہو، کچھ ان کا اثر ہو جائے
اس وفا اور محبت کو نظر ہو جائے
سبق آموز وفا نرگسِ جادو نہ رہے
پھول رہ جائے مگر پھول میں خوشبو نہ رہے

مارکس : پیاری حنا۔ اگر کچھ سنانے ہی کو جی چاہتا ہے تو جی بھر کر سنا لو۔ مگر فال بد منھ سے نہ نکالو۔ ؎

دُر یکتا تمھاری چاہ، یہ جان صدف ہوگی
یہی راحت، یہی عزت، یہی وجہ شرف ہوگی
محبت کی نگاہیں مرتے دم تک دیکھ لینا تم
کہ پُتلی بھی پھرے گی تو تمھاری ہی طرف ہوگی

(عزرا کا اندر آنا)

عزرا : ظالم، بے دین، یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ حنا۔ حنا۔

حنا : حکم پیارے ابا۔

عزرا : رومنوں کے بادشاہ کی بھتیجی اور ولی عہد سلطنت کی منگیتر شہزادی آکٹیویا اس طرف سے گذر رہی تھی۔ اتفاقاً ایک ستون سے ٹکرا کر اس کے رتھ کا پہیہ چور چور ہو گیا۔ اور اس کا شاہی غرور اپنی غریب رعیت سے پناہ اور مدد مانگنے کے لیے مجبور ہوگیا۔

مارکس : تو کیا وہ آپ کے یہاں قیام کرنا چاہتی ہے؟

عزرا : ہاں۔ دوسری سواری کے آنے یا پہلی کے درست ہوجانے تک۔ وہ پاک قوم کی لڑکی ایک ناپاک یہودی کے گھر میں ٹھہرنا چاہتی ہے۔ ؎

جو دور رہتے تھے آنے لگے قریب مرے
زہے نصیب تمھارے، زہے نصیب مرے

حنّا : تو ابا جان جائیے۔ مہمان بن کر آنا چاہتی ہے تو ضرور بلا لائیے۔

مارکس : (خود کلامی) آکٹیویا اور عزرا کے گھر میں۔ کیا اپنی منگیتر کی موجودگی میں میرا راز راز رہ سکے گا۔ (مخاطب ہوکر) ہاں۔ کیا میں ہٹ جاؤں؟

عزرا : کیوں؟

مارکس : شاید شہزادی ایک غیر شخص کی موجودگی پسند نہ کرے۔

عزرا : ٹھہرو۔ مجھے اس ناخواندہ مہمان کے آنے کے بعد تمھاری مدد کی ضرورت ہوگی۔

(جانا)

مارکس : (خود کلامی) ؎

یہ بھی دیوانی مری اور وہ بھی دیوانی مری
دیکھیے کیا آفتیں لاتی ہے نادانی مری
چغلیاں کھائے گا گھبرائے ہوئے چہرے کا رنگ
کھول دے گی بھید دونوں پر پریشانی مری

(آکٹیویا کا عزرا کے ساتھ اندر آنا)

آکٹیویا : ہاں عزرا۔ گاڑی کے اتفاقیہ ٹوٹ جانے سے مجھے قدرے تکلیف تو ہوئی۔ تاہم اس تکلیف میں بھی اپنے لیے ایک طرح کی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ اگر یہ ناشدنی واقعہ پیش نہ آتا تو مجھے اپنے چچا کی ایک وفادار رعیت کے جوہر پہچاننے اور یہودی قوم کی اخلاقی خوبیوں کو جاننے کا کبھی موقع نہ ملتا۔

عزرا : میں اس نوازش کا ممنون ہوں۔ اگر حضور کے ہم قوم، ہمارے آقا، ہماری جان و مال کے مالک معزز رومن بھی اپنی رعایا کے ساتھ یہی برتاؤ رکھیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی حکومت چاند اور سورج کی عمر پا سکتی ہے۔

آکٹیویا : (مارکس کو دیکھ کر خود کلامی) تعجب، حیرت۔ کس قدر ملتی جلتی صورت۔ ایک قلم کی دو تصویریں۔ یہودی فریم میں رومن تصویر؟

حنا : (خود کلامی) یہ میرے پیارے کو اس قدر حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہے؟

مارکس : (خود کلامی) ؎

آج توقیر گئی، بات گئی، شان گئی
کچھ بنائے نہ بنے گی، جو وہ پہچان گئی

آکٹیویا : عزرا۔ یہ نوجوان شخص کون ہے؟

عزرا : حضور۔ یہ میرے ایک ہم مذہب کی آنکھ کا تارا ہے۔ اور مجھے اولاد سے بھی زیادہ پیارا ہے۔

آکٹیویا : کیوں جونا۔ کیا یہ چہرہ دیکھنے والے کے دل میں حیرت پیدا نہیں کرتا؟

جونا : جی ہاں۔ اگر یہ آدمی یہودی کے لباس میں نہ ہوتا تو میں ضرور شہزادہ مارکس سمجھ کر دو زانو ہوکر اس کے دامن کو بوسہ دیتی۔

عزرا : حضور۔ میں تھوڑی دیر کی غیر حاضری کی معافی چاہتا ہوں۔

آکٹیویا : خوشی کے ساتھ۔

مارکس : ضرورت ہو تو میں بھی ساتھ چلوں؟

عزرا : ٹھہرو۔ کیا انگاروں کے فرش پر کھڑے ہو؟

(عزرا اور حنا کا جانا)

مارکس : (خود کلامی) ؎

یہ کہاں سے آگئی حیران کرنے کے لیے
اور دروازے نہ تھے کیا اس کو مرنے کے لیے

آکٹیویا : جونا۔ میں اس نوجوان یہودی سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے کہہ کہ میرے نزدیک آئے۔

جونا : ذرا قریب آنا بھائی۔

مارکس : (سائڈ میں) لیجیے۔ مصیبت کفن پھاڑ کر چلائی۔
جونا : اجی نزدیک آؤ۔
مارکس : (سائڈ میں) بی۔ بلی۔ اس گنہگار چوہے پر رحم فرماؤ۔
جونا : اجی آگے بڑھو.... ہیں پھر رک گئے.... یا حواس؟
مارکس : (خود کلامی) شہزادے صاحب چلیے آگے۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔
آکٹیویا : اس سے پوچھ۔ کہ تمھارا نام کیا ہے؟
جونا : شہزادی صاحبہ دریافت فرماتی ہیں کہ تمھارا نام کیا ہے؟ — کیا گونگے ہو — میں تمھارا نام پوچھتی ہوں — کیا کہا — کچھ نہیں۔ — حضور ان کا نام 'کچھ نہیں' ہے۔
آکٹیویا : پوچھ۔ کس ملک کے رہنے والے ہو؟
جونا : تمھارا وطن کون سا ہے؟ — اجی اڑھائی سیر کا سر ہلتا ہے ذرا سی زبان نہیں ہلتی۔ نہیں سمجھے —— میں پوچھتی ہوں کہاں سے آئے ہو؟ کیا آسمان سے؟ — حضور ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ یہ پچھلے سال کی برسات میں اولوں کے ساتھ زمین پر ٹپک پڑے ہیں۔
آکٹیویا : جونا۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کبھی حیرت زدہ نہیں ہوئی جتنی آج اس کی اور اپنے پیارے کی ملتی جلتی صورت دیکھ کر ہوئی ہوں۔ ؎

دل پوچھ رہا ہے آنکھوں سے، یہ بہتر یا وہ اعلیٰ ہے
قدرت نے ایک ہی سانچے میں کیا دو سکوں کو ڈھالا ہے

(عزرا اور حنا کا دوبارہ آنا)

حنا : (خود کلامی) ؎

آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں ہونٹوں پہ اگرچہ تالا ہے
جس چاند کی میں دیوانی ہوں کیا یہ بھی اسی کا ہالا ہے

عزرا : (خود کلامی) ؎

اس کے بھی رنگ عجب سے ہیں اس کا بھی طور نرالا ہے
ہے یہ بھی چپ اور یہ بھی چپ کچھ دال میں کالا کالا ہے

(سپاہی کا آنا)

سپاہی : حضور عالیہ۔ سواری تیار ہے۔ صرف حضور کا انتظار ہے۔

آکٹیویا : اچھا عزرا۔ میں نے تمھیں بہت تکلیف دی۔ اگر پھر کبھی اس طرف سے گذری تو ضرور تم سے ملنے کی خوشی حاصل کروں گی۔

عزرا : حضور کی رعیت نوازی سے مجھے ایسی ہی امید ہے۔

(آکٹیویا، جونا اور سپاہی کا جانا)

مارکس : (خود کلامی) ۔

میں تو سمجھتا تھا، کہ پوری آج رسوائی ہوئی
خیر گذری، ٹل گئی، سر سے بلا آئی ہوئی

حنا : (خود کلامی) ۔

رنگ فق، منھ زرد، بھرّائی ہوئی آواز ہے
اس پریشانی کے پردے میں یقیناً راز ہے

(مخاطب ہوکر) کیا اس رومن شہزادی کو جانتے ہو؟

مارکس : اتنا ہی جتنا کہ تم جانتی ہو۔

حنا : یہ شہزادی تم سے واقف ہے؟

مارکس : اتنا ہی جتنا وہ تم سے واقف ہے۔

حنا : ہوں۔ اس روز رومن سرداروں کا یک بیک تمھارے آگے جھک جانا، آج شہزادی آکٹیویا کا تمھیں دیکھ کر حیرت میں آنا ظاہر کرتا ہے کہ تم پر اندھا بھروسا عقل کا قصور ہے۔ تمھارا رومنوں سے کوئی نہ کوئی پوشیدہ تعلق ضرور ہے۔

مارکس : پیاری حنا۔ اس بات کا جواب دینے کی نہ مجھ میں جرأت ہے اور نہ میں

اس کی ابھی ضرورت سمجھتا ہوں۔ ؎

یہ قصہ طول ہے، سننا کبھی، فی الحال جانے دو
تمھیں معلوم ہو جائے گا سب کچھ، وقت آنے دو

(حنا کا گانا)

تو پہ میں واری پیا۔ چھین لیا ہے جیا۔ پریم کا مارا موہے بان۔
رنگ رنگیلے، چھیل چھبیلے۔
ہوتم پر دل جانی۔ آرام زندگانی، یہ اٹھتی جوانی۔ تو پہ میں....
نٹ کھٹ دل لینے والے۔ کیسے ہو بھولے بھالے۔
نیناں یہ کالے کالے۔ پی کر مدھ کے پیالے۔
جھومت جیسے متوالے۔ ابرو یہ برچھی بھالے۔
جس سے جینے کے لالے ہیں۔ تو پہ میں....

(دونوں کا جانا)

پہلا ایکٹ - ساتواں سین

مکان

(نرگس کا گاتے ہوئے آنا)

کیا قاتل نے دل پہ نگاہوں کا وار۔
میری ہائے۔ جان جائے۔
پیا پیارے نے پریم کی ماری کٹار۔ کیا قاتل....
گالوں پہ لالی۔ کانوں میں بالی۔
سوہے سر پہ ڈوپٹہ گل انار۔ کیا قاتل.....
مرے جوبن پہ لاکھوں چھائی بہار۔
کون دیکھے پیا بن نکھار۔
چھیلا آؤ۔ من لبھاؤ۔ جاؤں میں نثار۔ کیا قاتل....

نرگس : زہر، آگ، سمندر، دُکھ، بیماری یہ سب آدمی کے دشمن ہیں۔ مگر جس دشمن کا کوئی علاج نہ ہو وہ عشق ہے۔ مُوا عشق اگر تلوار ہو تو اس کے روکنے کے لیے ڈھال بنائے۔ درد ہو تو دوا کھائے۔ پلیگ ہو تو شہر سے بھاگ جائے۔ مگر یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اس کا علاج کیا کیا جائے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ دل مسوسا کرو اور موئے کے نام کو کوسا کرو۔ میں نے اس عشق کی بدولت یہ سو انگ رچایا ہے۔ اپنے پیارے سے ملنے کے لیے اپنے آپ کو گونگا بنایا ہے۔

جان دی کتنوں نے اس موذی کے پالے پڑ کر
یا خدا ناس ہو یہ عشق مُوا سڑ سڑ کر

(نرگس کا جانا اور سرخاب، کریم، رحیم اور کرامت کا باری باری سے آنا)

سُرخاب : ابے کریم۔ تو نے عجیب اُس حکیم کا حال بیان کیا ہے۔
کریم : مگر حضور علاج میں یکتائے زمانہ ہے۔ اس لنگڑے کی نانی کی قسم بقراط کا نانا ہے۔
رحیم : لیجیے حکیم صاحب بھی آگئے۔

(کرامت اور شمشاد کا آنا)

سرخاب : آیئے حکیم صاحب۔
کرامت : خوش رہو۔
سرخاب : آداب۔
کرامت : جیتے رہو۔ مرو تو بخشے جاؤ۔ اگر جنت کے اسپتال میں جگہ نہ ملے تو جہنم کے قرنطینہ میں جگہ پاؤ۔
سرخاب : (سائڈ میں) واقعی کچھ سڑی معلوم ہوتا ہے۔
کرامت : کیوں حکیم صاحب ٹھیک ہے نا؟
سرخاب : جناب میں کوئی حکیم نہیں ہوں۔
کرامت : جناب آپ ضرور حکیم ہیں۔
سرخاب : آپ کی قسم میں حکیم نہیں ہوں۔
کرامت : آپ کے باپ کی قسم آپ حکیم ہیں (مارتا ہے) آپ کو کہنا پڑے گا کہ میں حکیم ہوں۔
سرخاب : ابے کریم تو کس خچر کو بلا لایا۔
کریم : میں نے ان کے جھک پنے کا حال آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔
سرخاب : ایسے جھکّی کی ایسی تیسی۔ نکال دے ایسے پاگل حکیم کو، مجھے ضرورت نہیں ہے۔
کرامت : ہیں۔ حکیم سے یہ گستاخی۔ لا میرے آنے کی فیس، تیرے رئیس کی ایسی تیسی۔

کریم : معاف کیجیے گا۔ آپ کو حکیم ہو کر اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے۔
کرامت : درست ہے۔ کیوں جناب آپ کی طبیعت کچھ سُست ہے؟
کریم : نہیں نہیں۔ بہت اچھی ہے۔
کرامت : آپ اچھے ہیں یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔
کریم : کیوں اس کا مطلب؟
کرامت : اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے چہرے کا رنگ.....
سرخاب : ....کچھ نرالا ہے۔
کرامت : کیونکہ آپ کو کل یا پرسوں....
سرخاب : .....بخار آنے والا ہے۔
کرامت : ابھی نہیں پلیگ ہونے والا ہے۔
کریم : ہیں۔ حکیم صاحب اس کا کچھ علاج؟
کرامت : علاج؟ اونھ ہوں۔
سرخاب : کیا کہا حکیم صاحب۔ کچھ بولیے۔
کرامت : ارے میرے گھسیارے باپ۔ تم تو گھاس کاٹتے کاٹتے ہوگئے فوت۔ اب علاج کیا بتاؤں۔ آئی موت۔
سب : موت؟
سرخاب : (روتے ہوے) حکیم صاحب موت؟
کرامت : ہاں روؤ۔ اچھی طرح روؤ۔ اس کی قسمت پر روؤ۔ اور میری حالت پر روؤ۔
سرخاب : کیوں کیوں۔ حکیم صاحب آپ کی حالت پر کیوں روئیں۔
کرامت : اس لیے کہ مجھے زبردستی حکیم بنالائے ہیں۔
سرخاب : عجیب دل گی باز شخص معلوم ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کیا آپ میری لڑکی کا علاج نہیں کرنا چاہتے؟
کرامت : جی کیوں نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کا گھر بھر بیمار ہوجائے تو سب کا علاج کروں۔

(نرگس کا آنا)

سرخاب : لیجیے حکیم صاحب یہی لڑکی ہے۔ جو آج چار دن سے گونگی ہوگئی ہے۔
کرامت : کیوں لڑکی تیرا کیا حال ہے؟
نرگس : ایں ایں ایں۔
کرامت : بھئی یہ تو سرگم گاتی ہے۔ جی آپ کی بولی میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔
نرگس : نی نی نی۔
کرامت : لو نکھاد کے سُر شروع ہوگئے۔ لڑکی تیرا کیا حال ہے؟
سرخاب : اجی حکیم صاحب جواب کس طرح دے۔ اس کی زبان تو بند ہے۔
کرامت : زبان بند ہے تو اتنا بول دے کہ میں گونگی ہوں۔
سرخاب : آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ علاج کی طرف توجہ فرمایئے۔
کرامت : اچھا تو آپ دوسرے کمرے میں چل کر غپ شپ اُڑایئے۔ میرا شاگرد اس کا علاج کرتا ہے۔
سرخاب : آیئے آیئے۔ تشریف لایئے۔

(سب کا جانا)

شمشاد : لو بیگم اب تو زبان کھولو۔
نرگس : آں آں آں۔
شمشاد : اجی آں آں چھوڑ کر صاف بولو۔
نرگس : ای ای ای۔
شمشاد : بس حکیموں سے دل کا مرض نہ چھپاؤ۔ آنکھ سے آنکھ ملاؤ۔
نرگس : کون؟ میرا شمشاد پیارا۔
شمشاد : واللہ۔ تم نے غضب کی چال نکالی۔ دل آرا۔

(کریم کا دوسرے کمرے سے جھانکنا)

کریم : ہیں یہ دال میں کالا (چھینکنا)

نرگس : ابی کل سے میری کتیا کو زکام ہوگیا ہے۔

(سرخاب کا آنا)

سرخاب : کیوں بے رذالے۔ یہ طور نکالے۔ تو میری لڑکی کا علاج کر رہا ہے۔
شمشاد : احسان مانیے صاحب۔ میں نے آپ کی گونگی لڑکی کو بولنا سکھا دیا۔
سرخاب : بڑی مہربانی۔ جیتی رہے تیری نانی۔ مگر ہاں مجھے کچھ گڑبڑ گھٹالا نظر آتا ہے۔ یہ حکیم کے لباس میں کوئی اور معلوم ہوتا ہے۔ کیوں جناب آپ ایک مہربانی فرمائیں گے۔ مجھے اپنا نام بتائیں گے۔
شمشاد : جی میرا نام۔ میرا نام ہے نام.....
سرخاب : سمجھا سمجھا۔ یہ کوئی حکیم وکیم نہیں ہے۔ یہ ہے مردود شمشاد۔
شمشاد : جی ہاں۔ بندہ ہی ہے آپ کا ہونے والا داماد۔
سرخاب : چل داماد کا بچہ۔ ورنہ کھا جاؤں گا کچا۔
نرگس : میری سنیے ابا جان۔
شمشاد : پہلے میری سنیے نیک فرجام۔
سرخاب : چپ رہو بدلگام۔ ایک ایک کہو۔ ایک ایک کی سنوں گا اور ایک ایک کو جواب دوں گا۔
شمشاد : اچھا تو پہلے میری سنیے حضور عالی۔
نرگس : جی پہلے میری سنیے جناب عالی۔
سرخاب : پھر وہی نالائقی۔
شمشاد : اصل حال یہ ہے۔
نرگس : باعثِ ملال یہ ہے۔
سرخاب : نہیں مانتے بد زبانو۔
نرگس : اچھا میری بات مانو۔
سرخاب : اچھا تو ہی بک مردار۔
شمشاد : میں کہتا ہوں سرکار۔ میں آپ کی لڑکی کا عاشق ہوں۔

سرخاب : عاشق عاشق۔ ابے تو کس سے پوچھ کر عاشق ہوا؟
شمشاد : جناب ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر مرتے ہیں۔
سرخاب : پیار، عشق، مرنا۔ ارے کم بخت کیا تمام دنیا مر گئی تھی۔ تجھے میری لڑکی ہی مرنے کو تھی۔
نرگس : ابا جان ہم پر رحم فرمایئے۔ ورنہ میں زہر کھالوں گی۔ اپنی جان دے دوں گی۔
سرخاب : واہ بھئی۔ یہ کلجگ کا زمانہ ہے۔ جوان لڑکیاں عشق کرتی ہیں۔ نوجوانوں پر مرتی ہیں۔
شمشاد : ہونے والے سسُر صاحب۔ اب بات کو زیادہ طول نہ دیجیے۔ مجھے اپنی دامادی میں قبول کیجیے۔

(کرامت کا آنا)

کرامت : بس اب قصہ تمام کیجیے۔ نکاح کا انتظام کیجیے۔
سرخاب : واہ حکیم صاحب واہ۔ آپ نے خوب میری بیٹی کا علاج فرمایا کہ اس کو عشق کے جال میں پھنسایا۔ اچھا تو اب آپ ہی قاضی بن جایئے اور نکاح پڑھایئے۔
کرامت : لایئے نذرانہ دلوایئے۔
سرخاب : لیجیے اب ہلایئے ہونٹ۔ یہ حاضر ہے سو روپے کا نوٹ۔
کرامت : مگر یہ تو جعلی معلوم ہوتا ہے۔
شمشاد : اجی حکیم صاحب۔ آپ نے کون سی محنت کرکے کمایا ہے۔ مفت ہاتھ آیا ہے۔ اب دیر نہ لگایئے۔ نکاح پڑھایئے۔ اور میری طرف سے یہ بیس روپیہ کا نوٹ قبول فرمایئے۔
کرامت : (ہاتھ ملا کر) ۔

پیازم بٹاٹم کریلم کریلا۔ سیاٹم کیٹم گھوٹیلم گھوٹیلا
رہو مل کے جیسے رہیں بہن بھیا۔ نکاح ختم شد لاؤ پنجم روپیا

(سب کا مل کر گانا)

رنگ رلیاں۔ کرو خوشیاں۔
مل مل شاداں۔ مل مل شاداں۔ مل مل...
ہے گل اور بلبل کا جوڑا نایاب۔ جوڑا نایاب۔ جوڑا...
ہوں اررر۔ ہوں اررر ہوں میں حیران۔
چل پرے ہٹ۔ چل پرے ہٹ۔ دور ہو شیطان۔
جاتے ہیں سب کو آداب۔ رنگ رلیاں........

پہلا ایکٹ - آٹھواں سین

باغ

(مارکس اور حنا کا باتیں کرتے دکھائی دینا)

حنا : بس بس۔ میں اب تشویش اور خوف کی حالت میں ایک نامعلوم مدت تک رہنا نہیں چاہتی۔

مارکس : دماغ خیال کا اور خیال لفظوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ مجھے جواب دینے کے لیے کچھ مدت دو۔

حنا : بس آج ہی یا کبھی نہیں۔ میرا دل اس کانٹے کی چبھن کو زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔ ؎

یہ رنج جائے یہ تکلیف و اضطراب مٹے
کہو کہو کہ کسی طرح یہ عذاب مٹے

مارکس : تو پیاری حنا۔ حقیقت کے چہرے سے نقاب دور ہوتی ہے۔ دیکھو اصلیت کی بھیانک شکل دیکھ کر خوفزدہ نہ ہونا۔ نفرت نہ کرنا۔ میں آج تک یہودی کے لباس میں ایک دھوکے باز عاشق کا پارٹ کر رہا تھا۔ آہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اچھا سنو سچ یہ ہے کہ۔ ؎

ہر اک گمان الگ ہے ہر اک یقین الگ
تمھارا دین الگ ہے ہمارا دین الگ

حنا : تو کیا تم ہمارے ہم مذہب نہیں ہو؟

مارگس : نہیں۔ میں تمھارے مذہب کے دشمنوں کی ڈالی ہوئی بنیاد ہوں۔ یعنی رومن خون اور رومن باپ کی اولاد ہوں۔

حنّا : تم یہودی نہیں ہو؟

مارگس : نہیں۔

حنّا : تو پھر تمھیں یہودی بننے کو کس نے کہا؟

مارگس : تمھاری محبت نے۔

حنّا : تمھیں ایک یہودی لڑکی کے ساتھ محبت کرنے کی جرأت کس نے دلائی؟

مارگس : تمھاری صورت نے۔

حنّا : اُف نور میں نار۔ گل میں خار۔ شربت میں کفِ مار۔ زہریلا سانپ اور گلے کا ہار۔

کیوں الجھتا اپنا دامن، گر نہ پھنستی بھول میں
مجھ کو کیا معلوم تھا کانٹا چھپا ہے پھول میں
میری بربادی کا آخر کچھ سبب بتلا مجھے
کیا خطا تھی میری تو نے کیوں دیا دھوکا مجھے

مارگس : حنّا۔ زندگی سے زیادہ عزیز حنّا۔

عطیہ ہے یہ نیرنگِ طلسم آب و گِل تیرا
یہ جسم ان رومنوں کا ہو تو ہو لیکن ہے دل تیرا
یہودی ہوں کہ رومن ہوں۔ میں نوری ہوں کہ ناری ہوں
کوئی ہوں کچھ ہوں لیکن تیری صورت کا پجاری ہوں

حنّا : بس بے درد بس۔ ایک دغاباز رومن ایک معصوم یہودی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

مارگس : تو کیا تم میری مجبوریوں کا خیال کرکے میرا گناہ نہیں معاف کرسکتیں؟

حنا : نہیں۔

مارگس : میری نہیں ہوسکتیں؟

حنا : نہیں۔
مارکس : کیا اپنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھ میں نہیں دے سکتیں؟
حنا : نہیں۔
مارکس : تو کیا اپنا دل مجھ سے پھیر لوگی؟
حنا : آہ کاش یہ ممکن ہوتا۔ مگر نہیں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ یہی نہیں ہو سکتا۔ ؎

بے وفا دنیا کی اب تک جاننا رسمیں نہیں
دل کے میں بس میں ہوں لیکن دل مرے بس میں نہیں

(عزرا کا آنا اور چھپ کر دونوں کی باتیں سننا)

مارکس : تو پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے کیوں انکار ہے؟
حنا : اس لیے کہ اس دل پر میرا قبضہ ہے مگر اس ہاتھ پر میرے باپ کا اختیار ہے۔
مارکس : مگر تمھارا باپ جو اپنے قومی رسم و رواج کا سخت پابند ہے وہ خوشی سے اپنی لڑکی کا ہاتھ ایک رومن کے ہاتھ میں دینا کیونکر گوارا کرے گا؟
حنا : تو پھر میں کیا کرسکتی ہوں؟
مارکس : تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے بھاگ کر کسی دوسرے ملک میں پوشیدہ طور سے اپنا نکاح پڑھائیں گے اور پھر ایک جان دو قالب بن کر لوٹ آئیں گے۔
حنا : اس خفیہ شادی کو میرا باپ کیونکر منظور کرے گا؟
مارکس : جب عقد ہوگیا تو اُسے مجبوراً قبول کرنا ہوگا۔ ؎

ہے ایسا کون رد کر دے جو قسمت کے نوشتے کو
کوئی طاقت نہیں جو توڑ دے اس پاک رشتے کو

حنا : یا خدا۔ یہ تو مجھے بھاگنے کو کہتا ہے۔ اب میں۔ پھر...
مارکس : یہ کیا؟ تم کانپ رہی ہو؟ حنا کل کا سکھ آج کے فیصلے پر موقوف ہے۔ ؎

تمھیں ہو آرزو اپنی، تمھیں ہو بس خوشی اپنی
تمھاری ایک ہاں پر منحصر ہے زندگی اپنی
امیدیں جی اٹھیں وہ لفظ منھ سے میری جاں کہہ دو
میں صدقے پیارے ہونٹوں کے لب نازک سے ہاں کہہ دو

حنا : نہیں بے درد۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ـ

بنوں گی خاک، مٹا دوں گی اپنے آپ کو میں
مگر نہ دی نہ دغا دوں گی اپنے باپ کو میں

مارکس : اگر تمھیں انکار ہے تو پھر میرا اس دنیا میں جینا بیکار ہے۔ ـ

مری خوشی مری راحت تری نہیں تک تھی
سمجھ گیا کہ میری زندگی یہیں تک تھی
اسی طرح سے بس اب یہ عذاب کم ہوگا
نہ دم رہے گا نہ اس دم کے ساتھ غم ہوگا

(اپنے آپ کو خنجر مارنے کی کوشش کرتا ہے)

حنا : ٹھہرو۔ پیارے ٹھہرو۔
مارکس : بس ہاں یا نہیں۔ ایک لفظ۔
حنا : تھوڑی دیر۔ غور کرنے کے لیے، تھوڑی دیر۔
مارکس : ایک منٹ نہیں۔
حنا : آہ...
مارکس : بس کہو کہ مجھے منظور ہے۔
حنا : لے چل خوبصورت جادوگر، لے چل۔ حنا اس دل سے مجبور ہے۔ ـ

تیری ہوں، تیرے ساتھ ہوں، دیتی ہوں زباں میں
اب سایہ کے مانند جہاں تو ہے وہاں میں

مارکس : تو اپنے باپ کو خبر ہونے سے پہلے یہاں سے نکل چلو۔ ـ

جیسے یہ جسم و روح ہیں ویسے ہی ساتھ دو
لو آؤ اب چلو، مرے ہاتھوں میں ہاتھ دو

(دونوں جانا چاہتے ہیں کہ عزرا سامنے آجاتا ہے)

عزرا : ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟ کہاں بھاگ کر چھپنا چاہتے ہو؟ ۔
یہ پھانس اس زندگی میں چبھ کے مشکل سے نکلتی ہے
ڈرو اس بد دعا سے جو جلے دل سے نکلتی ہے
تمھاری آرزو دنیا سے خالی ہاتھ جائے گی
جہاں جاؤ گے میری بد دعا بھی ساتھ جائے گی

حنا : رحم۔ پیارے ابا ہم گنہگاروں پر رحم۔

عزرا : رحم۔ ایسے نابکار پر؟ رحم تجھ جیسی نابنجار پر؟ کیا اسی دن کے لیے میں نے تجھے پالا تھا؟ اور کیوں او رومن قوم کے نجس کتے۔ جس نے ہمیشہ محبت سے تیری پیٹھ کو تھپتھپایا۔ جس نے تجھے شریف اور وفادار سمجھ کر تیرے منھ پر ٹھوکر مارنے کے بدلے تجھے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھایا۔ اسی محسن کے کلیجے میں اپنے زہری دانت گڑونے کے لیے تیار ہوا۔ ۔
قہر خدا سے گڑ نہ گیا، تو زمین میں
کیا بے وفائی جرم نہیں تیرے دین میں
وہ بات کی نہ تھی جو، گمان و یقین میں
اک سانپ گویا پالا تھا اس آستین میں
کیا جانتا تھا مہر کے پردے میں قہر ہے
آب بقا میں سمجھا ہوں جس کو وہ زہر ہے

حنا : ابا۔ پیارے ابا۔ بے شک ہم دونوں محبت کرنے کے مجرم ہیں۔ مگر ہمارا جرم گناہ کی آلودگی سے پاک ہے۔ اس لیے ہم سے نفرت کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

مارکس : ۔

ہے پاک گناہوں سے ہماری یہ خطا بھی
غارت ہوں، اگر ہم کو بدی نے ہو چھوا بھی
ہم چشمہ الفت میں ہیں مانند کنول کے
جو پانی کے اندر بھی ہے پانی سے جدا بھی

عزرا : تو کیا تم محبت کرنے کے سوا اور ہر طرح بے قصور ہو۔ چاند کی طرح اس زمین کی برائیوں سے دور ہو؟

مارکس : ہاں بزرگ عزرا۔ ایسا ہی ہے۔ ۔

پرواز کی طاقت تھی مگر پر نہیں نکلے
اخلاق کے قانون سے باہر نہیں نکلے
یہ قلب و جگر پاک ہیں، یہ دیدہ تر پاک
اللہ ہے شاہد کہ ہے دل پاک نظر پاک

عزرا : افسوس۔ میں نے کیا سوچ رکھا تھا اور یہاں کیا واقعہ روبہ کار ہے۔ سچ ہے جس طرح دریا کی رو کے سامنے ایک تنکا بے بس ہے۔ اسی طرح تقدیر کے آگے تدبیر ناچار ہے۔ ۔

مجھ کو ہے خیال اور انھیں مدنظر اور
اُرمان طبیعت میں اِدھر اور اُدھر اور

حنا : ابا۔ پیارے ابا۔

عزرا : سالومن۔ غیر قوموں کے خون سے سینچی ہوئی سرزمین قلم پر حُسن کا قحط نہیں ہے۔ روم کے محفل افروز کنواریوں کی موجودگی میں حنا کو دل دینے کا باعث؟

مارکس : اس کی دلفریب صورت۔ اور صورت سے زیادہ اس کی سیرت۔

عزرا : تو کیا تم اسے عزیز رکھوگے؟

مارکس : اپنی جان کی طرح۔

بعورا : اس کی عزت کروگے؟
مارکس : اپنے ایمان کی طرح۔
بعورا : اس کی حفاظت کروگے؟
مارکس : اپنی آبرو اور شان کی طرح۔
بعورا : اچھا تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور خوشی سے اس کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دیتا ہوں آگے بڑھو۔ دو زانو ہو ـــــ نہیں سنا۔ دو زانو ہو۔
مارکس : کیا آپ مجھ سے کوئی مزید اقرار کرانا چاہتے ہیں؟
بعورا : ہاں۔ بغیر مذہب بدلے۔ ایک رومن۔ یہودی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ اس لیے سب سے پیش تر تمھیں اسرائیلی عقاید کی تعلیم دے کر اپنے مذہب میں لاؤں گا اور پھر موسوی شریعت کے مطابق تم دونوں کا ہاتھ ملا کر باپ کے فرض سے ادا ہوجاؤں گا۔
مارکس : تو کیا مجھ کو خطائے محبت کے جرمانے میں اپنا مذہب دینا ہوگا؟
بعورا : ہاں۔ اگر تم سچے ہو، ایمان دار ہو، اپنے دل کی انگوٹھی کا نگینہ بنانے کے لیے اس ہیرے کو خریدنا چاہتے ہو۔ تو اس کی قیمت صرف تمھارا مذہب ہے۔
حنا : پیارے۔ میرے پیارے۔ ـ

سوچ میں کیوں پڑگئے آخر ہو کوئی بات بھی
ہاں کہو، مل جائے تاکہ دل کی صورت ہاتھ بھی

مارکس۔ ـ

کس کو چاہوں، کس کو چھوڑوں کشمکش میں جان ہے
اک طرف یہ حور ہے اور اک طرف ایمان ہے

بعورا : جواب دو۔ کیا خیال ہے؟
مارکس : میں حنا کو چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر اپنا مذہب چھوڑنا محال ہے۔
بعورا : تو پھر نہیں؟

مارکس : نہیں۔

عزرا : انکار؟

مارکس : لاچار۔

عزرا : دوری؟

مارکس : مجبوری۔ ؎

ساری دنیا سے زیادہ یہ شکر لب مجھ کو
اور اس سے ہے زیادہ مرا مذہب مجھ کو
ایسی شے سہل میں انسان نہیں دے سکتا
جان دے سکتا ہے، ایمان نہیں دے سکتا

عزرا : تب کیا۔ رومن قوم کے ذلیل کتے۔ کیا تو معصومیت کے معبد میں گناہوں کی بدبو پھیلانے۔ فسق و فجور کا جال بچھا کر ایک بھولی بھالی لڑکی کو حرام کاری کا راستہ بتانے آیا تھا۔ ؎

رسائی کی پیدا میرے گھر میں، عزیز، ہمدرد و یار بن کر
مگر یہ ٹھانے ہوئے تھا دل میں کہ باغ اجاڑے بہار بن کر
دغا اور اس سے دغا، بھروسا کیا تھا جس نے مدام تجھ پر
زمیں سے نفریں، فلک سے لعنت، پڑے گی ہر صبح و شام تجھ پر

حنا : پیارے۔ میرے پیارے۔ یہ کیا؟ ؎

ہم وہی اور تم وہی پھر یک بیک کیا ہو گیا
با وفا دل آج کیوں بے درد ایسا ہو گیا
جان لو دل کی لگی کی قدر اب بھی جان لو
یہ نہ میں کہنے کو رہ جاؤں کہ دھوکا ہو گیا

مارکس : حنا۔ میری قوت فیصلہ بیکار ہو گئی۔ میرے چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ اب مجھے جانے دو۔

عزرا : ٹھہرو۔ ایک یہودی جس کے سر کے بال تمھاری قوم کے ظلم سہتے سہتے سفید

ہوگئے ہیں۔ جانے سے پہلے اس کے جلے اور دکھے دل سے نکلے الفاظ سنتے جاؤ۔ جس قہار و جبار کے پُر جلال نام کی قسمیں کھا کھا کر تم نے مجھے اور اِسے دھوکا دیا ہے۔ جس حاضر و ناظر ہستی کو گواہ کرکے ایک معصوم دوشیزہ کو ٹھگا ہے، وہ بے کس نواز، وہ منصف، وہ منتقم حقیقی خدا تمھیں بغیر سزا دیے کبھی نہ چھوڑے گا۔ جس بے رحمی سے تم نے اس غریب کا دل توڑا ہے۔ اسی بے دردی سے وہ تمھارا غرور توڑے گا۔ ؎

کڑھو، تڑپو، جلو، دل چور چور اور آنکھ پُر نم ہو
خدا کی لعنتیں ہوں، جاؤ، تم ہو، اور جہنم ہو

(پردہ)

دوسرا ایکٹ - پہلا سین

شاہی محل

(مارکس اور آکٹیویا کا آنا)

مارکس : پیاری آکٹیویا۔ احمق، شرابی اور پاگل، ان میں سے کوئی جرم کرے تو در گذر کی جا سکتی ہے مگر جس گناہ میں عقل تمیز اور ارادہ شامل ہو اس سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی۔ میں کس منہ سے معذرت پیش کروں؟ ؎

ہے زباں بھی بند، لب ہائے سخن پرداز بھی
دم بخود ہے نطق بھی اور نطق کا اعجاز بھی
ہونٹ تک آتے حجاب آتا ہے لفظِ عذر کو
چھپ کے بیٹھی ہے گلے میں، شرم سے آواز بھی

آکٹیویا : میرے دل کے مالک۔ انسان اور غلطی ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ جو گناہ نہیں کرتا وہ بے شک سزاوار توصیف ہے۔ مگر جو گناہ کر کے نادم ہوتا ہے اور تلافی کرتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف ہے۔

مارکس : تب تم میری گذشتہ بے اعتنائیوں کو معاف کرتی ہو؟

آکٹیویا : میرے پیارے بار بار معافی کا لفظ دُہرا کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو؟ ؎

رحم اور درگذر بھی ہو عفوِ سزا بھی ہو
سو بار میں معاف کروں پر خطا بھی ہو
قبضہ ہے دل پہ، جان پہ، عقل و تمیز پر
آقا کو اختیار ہے اپنی کنیز پر

(آکٹیویا کا جانا)

مارکس : (خود کلامی) دغاباز مارکس۔ بے وفا رومن۔ تو کتنا ذلیل شخص ہے؟ کہ زبان سے آکٹیویا کے ساتھ محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ مگر تیرا دل ابھی تک حنا کو پیار کر رہا ہے۔ کیا ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرے گا؟ کیا ایک شریف یہودن کی زندگی اس رومن شہزادی کا بھی حال و مستقبل تباہ کرے گا؟ ؎

بس اب بھی باز آ، وہ کام کیوں بے دین کرتا ہے
کہ جس پر خود ترا دِل تجھ کو سو نفرین کرتا ہے

(جانا چاہتا ہے کہ حنا آتی ہے)

حنا : ٹھہرو۔ ؎

جاتے کہاں ہو مجھ کو ٹھکانے لگا کے جاؤ
مارا ہے جس کو اس کا جنازہ اٹھا کے جاؤ

مارکس : حنا۔ تم اور یہاں؟

حنا : ہاں۔

مارکس : کیوں آئیں۔ کس کے پاس آئیں؟

حنا : اپنے صیاد کے پاس۔ قتل کرکے بھول جانے والے جلاد کے پاس۔ ؎

بے کس پہ ستم حد سے گذر کر نہیں کرتا
اس طرح کلیجہ کوئی پتھر نہیں کرتا
دنیا میں ہیں صیاد بھی، جلاد بھی، لیکن
جو تونے کیا کوئی ستم گر نہیں کرتا

مارکس : حنا۔ جب تک ستار کے تار آپس میں ملے رہتے ہیں، تبھی تک ان میں سے ایک دل لبھانے والا سریلا نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ تمھارے باپ کی ضد نے ٹھوکر مار کر اُس محبت کے ساز کا تار تار الگ کر دیا ہے۔ اس ٹوٹے ہوئے ساز سے دوبارہ محبت کا زمزمہ پیدا ہونا محال ہے۔ پہلے میرا

کچھ خیال تھا اور اب کچھ اور خیال ہے۔ ـــ

اب نہ وہ بات رہی اور نہ وہ جوش مجھے
تم بھی اب میری طرح کر دو فراموش مجھے

حنا : اگر یہی ارادہ تھا۔ آئندہ چل کر دھوکا ہی دینا تھا۔ تو ایک بھولی بھالی معصوم لڑکی کو جو جوان ہو کر بھی، محبت کیا ہے؟ محبت کیوں کرنی چاہیے؟ محبت کس سے کرنی چاہیے؟ ان باتوں سے مطلق خبردار نہ تھی۔ کیوں اس انیلی ناسمجھ کو دوزانو بیٹھ کر، آنسو بہا کر، گڑگڑا کر، قسمیں کھا کر اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلایا؟ کیوں اپنے ہونٹوں سے اس کی زندگی کے آب حیات میں زہر ٹپکایا؟ آہ۔ ـــ

تمھیں ہو، پھونک ڈالا ساتھ دل کے، جان و تن جس نے
بگاڑا ہے یہ گھر جس نے، اُجاڑا ہے چمن جس نے
تم اپنا ظلم اِس آنکھ، اس دلِ رنجور سے دیکھو
ہمارا گھر جلے، اور تم تماشا دور سے دیکھو

مارگس : حنا۔ تمھارا حُسن، نیکی، عصمت، شرافت، ابھی تک یہ تمام چیزیں پاک امانت کی طرح اچھوتی ہیں۔ اس لیے بدبخت عورت، قسمت اور اپنے باپ کے فیصلے پر صبر کرو۔ کیونکہ اس مجبورانہ جدائی کے، یہی دونوں ذمہ دار ہیں۔ جاؤ۔ مجھ سے اچھے اور مجھ سے زیادہ قابل لوگ تمھاری قدر کرنے کو تیار ہیں۔ ـــ

بدلا جو میں نے تم بھی بدل ڈالو طور کو
جو دل مجھے دیا تھا وہ دے ڈالو اور کو

حنا : یہ تم جیسے بے دید اور طوطا چشم مردوں کا شیوہ ہے۔ جس طرح ایک سچا خدا پرست انسان، دوسرے خدا کی خدائی کا اقرار نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک وفادار اور شریف عورت بھی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو پیار نہیں کرسکتی۔ ـــ

عمر بھر کو تجھ پہ صدقے جان میری ہو چکی
تو نہ ہو میرا، مگر میں دل سے تیری ہو چکی

مارکس : حنا۔ تم آج سے پہلے مجھے کیا سمجھتی تھیں؟

حنا : ایک نیک یہودی۔

مارکس : اور اب کیا سمجھتی ہو؟

حنا : ایک بے وفا رومن۔

مارکس : لیکن میں نہ وہ تھا نہ یہ ہوں۔

حنا : تو پھر۔

مارکس : میں سلطنت روم کا ولی عہد یعنی اس ملک کا ہونے والا شہریار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے سے لاچار ہوں۔

حنا : تم ولی عہد ہو؟ اس ملک کے ہونے والے بادشاہ ہو؟

مارکس : ہاں۔ اب تم ہی منصف ہو۔ اگر میں تمھارے باپ کی شرط منظور کرلیتا تو مجھے مذہب کے ساتھ سلطنت کی امید بھی چھوڑ دینی پڑتی۔

حنا : تو کیا سلطنت سچی محبت سے زیادہ قیمتی ہے۔ شاہی تخت عورت کے پاک دل سے زیادہ مقدس ہے۔ غلاموں اور درباریوں کا شور تنہائی میں گونجتی ہوئی پیار کی راگنی سے زیادہ میٹھا ہے۔ شہزادے صاحب۔ اگر مرد کو دنیا میں عورت کی سچی محبت مل جائے تو اسے سلطنت کیا بہشت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

مارکس : جو ہوچکا اُس کا باعث مجبوری ہو یا بھول۔ لیکن اب میں دوبارہ وہ خواب نہیں دیکھ سکتا۔

حنا : کیوں؟

مارکس : کیونکہ کل شہزادی آکٹیویا سے میری شادی ہونے والی ہے۔

حنا : شادی؟

مارکس : ہاں۔

حنا : کان مجھے دھوکا تو نہیں دیتے، اپنے لفظوں کو پھر دہراؤ۔ شہزادی آکٹیویا سے

تمھاری شادی ہوگی؟

مارکس : ہاں۔ ہاں۔

حنا : ظالم بے درد۔ تو کیا اسے بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر مجھ ناشاد و نامراد کی طرح اُس غریب کی جوانی اور زندگی کو بھی خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ اُس منحوس دن کا سورج کبھی طلوع نہ ہوگا میں تیرے بھولے شکار کو ہوشیار کردوں گی کہ تو فریبی ہے، جھوٹا ہے، دغاباز ہے۔ یہ شادی ایک عورت کی زندگی کا انجام اور دوسری عورت کی تباہی کا آغاز ہے۔

مارکس : مگر یہ شادی کل کے دن مقرر ہو چکی ہے اور کل کا دن مقدر کے فیصلے کی طرح اٹل ہے۔

حنا : تو مقدر کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ شادی ہرگز نہ ہوگی۔

مارکس : ضرور ہوگی۔

حنا : کبھی نہ ہوگی۔

مارکس : کل ہی ہوگی۔

حنا : قیامت تک نہ ہوگی۔

مارکس : میں جو کہتا ہوں۔

حنا : میں جو کہتی ہوں۔

مارکس : اس شادی کو کون روک سکتا ہے؟

حنا : میں۔ میں عزرا یہودی کی لڑکی حنا۔

مارکس : کون؟ تو؟

حنا : ہاں میں۔ پھر کہتی ہوں کہ میں اور میرے ساتھ روم کا قانون۔ روم کا رواج۔ روم کا بادشاہ، میں ان سب کو مجبور کروں گی کہ اس دغاباز کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا جائے۔ اس بدانجام شادی کے گھروندے کو ٹھوکروں سے ڈھا دیا جائے۔

مارکس : یہ ناممکن ہے۔

حنا : اگر یہ ناممکن ہے تو میں یہ سمجھوں گی کہ ظالموں اور موذیوں کے لیے میدان

صاف ہے۔ روم میں نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ قانون ہے، نہ انصاف ہے۔ ۔

باطن میں بزدلے ہیں بظاہر دلیر ہیں
یہ دور سے ڈرانے کو مٹی کے شیر ہیں

مارکس : مُشت۔

(حنا کا گانا)

جو طبیب اپنا تھا دل اُس کا کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ، عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

کیسے بے دردی کے پالے پڑے ہیں۔
فرقت میں جینے کے لالے پڑے ہیں۔
ظالم نگاہوں کی بیداد دیکھو۔
چتون کے سینے پہ بھالے پڑے ہیں۔

دِل لگانا ہے دگی دل کی
اب رلانے لگی ہنسی دل کی
شمع رو دیکھ حال پروانہ
بری ہوتی ہے لو لگی دل کی

ظالم محبت نے آگ لگادی۔
جل جل کے اس دل میں چھالے پڑے ہیں۔
کیسے بے دردی کے پالے پڑے ہیں۔

(جانا)

دوسرا ایکٹ - دوسرا سین

دَربار

(سہیلیوں کا ناچتے گاتے دکھائی دینا)

دختر رز کے کنٹر جھٹکاؤ۔
قلقلِ مینا کا ساغر چمکاؤ۔
باقی رہے نہ قطرہ بھی ایک۔
بھر بھر ساغر دلبر پیو اب مل کر دلبر خوشتر۔ دختر رز...
کاری کاری گھٹا ہے چھائی۔
باد صبا مژدہ یہ لائی۔
آب ناب کی برسے گی بارش۔
میکشوں کے لیے آج عید پیو شوق سے۔
بھر بھر ساغر دلبر پیو اب مل کر دلبر خوشتر۔ دختر رز.....

سردار ۱:

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

سردار ۲: ۔

ہوائے عیش نے پھیلائی نکہتِ شادی
اُڑا ہے مشک ختن خاک کے بگولوں میں

چوبدار : دولت و اقبال پائندہ، رعایائے روم کے رواج قدیم کے مطابق اِس شہر کا مشہور سوداگر عزرا یہودی اپنی قوم کی طرف سے عقیدت مندانہ نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے اور عالی مرتبت شہزادی سے شرف حضوری کی اجازت چاہتا ہے۔

آکٹیویا : کون آیا ہے؟ عزرا۔ وہ یہودیوں میں سب سے زیادہ شریف و معزز بوڑھا۔ میں اسے دیکھ کر ضرور خوش ہوں گی۔ حاضر کرو۔

مارکس : (خود کلامی) عزرا اور یہاں؟ اگر مجھے پہچان کر، غم و غصہ میں دل کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کا کوئی شرارہ منہ سے نکل جائے گا تو چشم زدن میں یہ جلسۂ شادی انصاف کی عدالت سے بدل جائے گا۔

بروٹس : (خود کلامی) دیوتا خیر کریں۔ یہ نحوست کی نشانی، مصیبت کا پیش خیمہ اس ہنسی خوشی کے جلسے میں کہاں سے نازل ہوا؟ —— (مخاطب ہو کر) شہزادی رواج کی سرپرستی جلسے سے باہر بھی ہوسکتی ہے۔ حکم دیجیے کہ نذرانہ لے کر اس نامبارک عبرانی کو دروازے ہی سے واپس کر دیا جائے۔

آکٹیویا : بزرگ باپ۔ ایک بے ضرر یہودی سے اتنی نفرت؟ کیا وہ کوئی چور یا خونی ہے؟

بروٹس : وہ ایک کافر نعمت۔ سنگ دل۔ زر پرست۔ دیوتاؤں کی راندہ اور دنیا کی مردود کی ہوئی قوم کا ایک شخص ہے۔ اس لیے اس مبارک جلسے میں اس کا شریک ہونا سخت بدشگونی ہے۔

آکٹیویا : مگر اُس کی موجودگی سے ہمارا کیا نقصان ہو سکتا ہے؟

بروٹس : راتوں کو ایک کونے میں بیٹھ کر رونے والا کتا کیا نقصان پہنچاتا ہے جو فوراً محلّے سے مار کر بھگا دیا جاتا ہے۔ مکان کی چھت پر بیٹھ کر غم زدہ آواز میں بولنے والا الو کیا تکلیف دیتا ہے جو فوراً بانس اور ڈھیلوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ جس طرح یہ دونوں اپنی موجودگی سے نحوست پھیلاتے ہیں۔ اسی طرح یہ نجس یہودی بھی جہاں جاتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔

(عزرا کا داخلہ)

آکٹیویا: عزرا۔ خوش آمدی۔ تمھیں اس خوشی کے جلسے میں دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔

عزرا: معزز شہزادی۔ سلطنت آپ کے گھر میں موجود ہے۔ زریں لباس آپ کے توشہ خانے میں بھرے پڑے ہیں۔ زر و جواہر آپ کی ٹھوکروں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس کی آپ کو پرواہ و ضرورت ہو۔ اس لیے میں اپنی اور اپنے قوم کی طرف سے ان کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاؤں کا لازوال تحفہ پیش کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمایئے۔

آکٹیویا: میں اس تحفے کو تمام دنیا کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہوں۔

عزرا: اس فراخ مشربی و بے تعصبی کے صلے میں اُس آسمانی خدا کی بہترین برکتیں آپ پر سایہ گستر ہوں ——— اور اُس ملعون رومن پر جس نے میری بھولی بچی کی راحت و زندگی تباہ کردی، بدترین عذاب نازل ہو۔

بروٹس: عزیز شہزادی۔ اگر اس نجس یہودی کی موجودگی ضروری ہے تو پہلے اسے مندر میں بھیج کر پاک بنایا جائے۔ اس کے بعد شادی کے جلسے میں بلایا جائے اور شرکائے جلسہ کی روحیں اس کی پرچھائیں پڑنے سے گندی نہ ہوجائیں۔ اس لیے احتیاطاً دور بٹھایا جائے۔

عزرا: عالی مرتبت۔ دینی سردار۔ جس طرح رومن قوم اپنے بادشاہ کی وفادار ہے اسی طرح یہودی قوم بھی اس کی دعا گزار و تابع دار ہے۔ جس طرح وہ شاہی قانون اور شاہی حکموں کا ادب کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ جس طرح وہ بادشاہ کے خیر خواہوں کو اچھا اور بدخواہوں کو برا سمجھتے ہیں اسی طرح ہم بھی اس کے دوستوں سے محبت اور دشمنوں سے نفرت کرتے ہیں۔ جب ہر مذہب و ملت اور رعیت کے ہر چھوٹے بڑے پر بادشاہ کی مساوی نظر التفات ہے تو محض مذہبی تعصب کی بنا پر اس کی شریف

رعایا کو سر دربار ذلیل کرنا، کتنی شرم کی بات ہے۔

بروٹس : ذلیل کو ذلیل کہنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ کیا تم یہودیوں نے اپنی کینہ پروری، اپنی بے رحمی، اپنی سود خوری سے رومن قوم کے سر پر مصیبت نہیں ڈھائی ہے؟

عزرا : اگر ہم واقعی ایسے ہیں تو ہمیں ایسا بے رحم بنانے والے تم اور تمھاری ظالم قوم ہے۔ جب تم ہمارے مذہب کو ذلیل سمجھوگے۔ ہمارے رسم و رواج کی تحقیر کروگے۔ ہمیں کتا سمجھ کر ٹھوکر ماروگے تو یقیناً ہمارے دل میں بھی انتقام کا سویا ہوا جذبہ بیدار ہوگا۔ جب ایک غریب بھی اپنے ستانے والے پر الٹ کر حملہ کرتا ہے تو دل اور کلیجہ رکھنے والا انسان کیوں نہ بدلہ لینے کے لیے تیار ہوگا؟

بروٹس : جھوٹے۔ اگر ہم واقعی ایسے ہوتے تو تم ہماری سلطنت میں رہنے بھی نہ پاتے۔

عزرا : کیوں نہیں۔ یہ سورج جو ہمیں روشنی پہنچاتا ہے، دریا جو ہمیں پانی پلاتے ہیں۔ زمین جو ہمارے لیے غذا اگاتی ہے۔ غرض قدرت کی ہر قوت جو ہماری خدمت بجالاتی ہے۔ ان سب کی ہمدردی کا سبب تمھاری ہی مہربانی ہے۔ تمھاری ہی وجہ سے ہماری زندگانی ہے۔

بروٹس : تو کہہ سکتا ہے کہ یہودی قوم کے ساتھ ہم نے کون سا بُرا سلوک کیا ہے؟

عزرا : یہ مجھ سے نہیں اپنے بے رحم دل سے پوچھو۔ اپنے خون بھرے ہاتھوں سے پوچھو۔ اپنی چھریوں اور خنجروں سے پوچھو۔ کیا ہزاروں یہودیوں کو، صرف اس قصور پر کہ وہ ابراہیم اور یعقوب کے خدا کو کیوں پوجتے ہیں، سخت سے سخت عذاب کے ساتھ قتل نہیں کرایا۔ کیا سینکڑوں اسرائیلی بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ نہیں بنایا۔ کیا ہماری قوم کے مظلوموں اور بے کسوں سے تم نے اپنا قید خانہ نہیں بسایا؟ اگر یہی اچھا سلوک اور یہی اچھا کام ہے تو پھر مجھے بتاؤ کہ ناانصافی اور ظلم کس چیز کا نام ہے؟ ۔

تم ستم کرتے رہے اور ہم ستم دیکھا کیے
خانماں برباد ہوکر رنج و غم دیکھا کیے
سر ہوئے تیغ عداوت سے قلم، دیکھا کیے
تم نے کیں لاکھوں جفائیں اور ہم دیکھا کیے
بغض کا ہم پر مگر الٹا اثر ہوتا گیا
چھانٹنے سے نخلِ قومی بار ور ہوتا گیا

سردار ۱: ناعاقبت اندیش یہودی خاموش رہ۔ کیا زندگی سے ناامید ہے؟ (بروٹس سے مخاطب ہوکر) بزرگ باپ۔ ایک فرسودہ حواس بوڑھے کو اپنا مخاطب بنانا آپ کے رتبہ اور شان سے بعید ہے۔

بادشاہ: میں بھی اس رائے کو پسند کرکے آپ کو اس کی احمقانہ جرأت سے چشم پوشی کرنے اور اس یہودی کو خاموش رہنے کا حکم دیتا ہوں.... اٹھیے اور میرے عزیز بچوں کو شادی کی برکت دیجیے۔

(بروٹس کا اٹھ کر مارکس اور آکٹیویا کا ہاتھ ملانا)

بروٹس: ـ

خوش اور ایک دوسرے پر مہربان رہو
دنیا میں بامراد رہو شادماں رہو

(حنا کا آنا)

حنا: ٹھہرو۔ جب تک انصاف کی عدالت میں۔ بادشاہ عادل کے روبرو ایک باوفا کی عرضی پیش ہوکر دغابازی کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہولے۔ اُس وقت تک ٹھہرو۔

بادشاہ: یہ کون؟
بروٹس: تو کون؟
مارکس: ـ (خود کلامی)

باعثِ تکلیف راحت میں گراں جانی ہوئی۔
سن رہا ہوں صاف اک آواز پہچانی ہوئی

عزرا : حنّا۔ تو یہاں کیوں آئی؟

حنّا : انصاف کے لیے۔

عزرا : کیا تجھے یقین ہے کہ ایک رومن شہزادے کے برخلاف ایک یہودی لڑکی کی فریاد سنی جائے گی؟

حنّا : اگر اس دربار کا دعویٰ ہے کہ یہاں امیر و غریب دونوں کا یکساں انصاف ہوتا ہے۔ تو اس دعوے کی شرم رکھنے کے لیے اسے میری فریاد سنّی پڑے گی۔

بادشاہ : اجنبی لڑکی۔ صاف لفظوں میں حال بیان کر۔ اگر تو مظلوم ہے تو تیرا حریف چاہے شاہی نسل ہی کا آدمی کیوں نہ ہو۔ مگر انصاف ضرور تیری طرفداری کرے گا۔ بول۔ کس کی ستائی ہے؟ اور کس کے خلاف فریاد لائی ہے؟

حنّا : مجھے ستانے والا، دین و دنیا سے مٹانے والا۔ ؎

جفا پیشہ، وفا دشمن، ستم گر کون ہے؟ یہ ہے۔
شکایت جس کی کرتا ہے مقدر کون ہے؟ یہ ہے۔

آکٹیویا : کون؟ شہزادہ مارکس؟

بادشاہ : ولی عہدِ سلطنت؟

حنّا : یہی۔ یہی۔ ؎

اسی کے دم سے خزاں باغ کی بہار ہوئی
یہی ہے، جس سے مری زندگی یہ خوار ہوئی

بادشاہ : مارکس۔ سنتا ہے؟ اس الزام کا تیرے پاس کیا جواب ہے؟

مارکس : ؎

ستائی گئی ہے، بُرا کہہ رہی ہے
یہ جو کہہ رہی ہے بجا کہہ رہی یہ

آکٹیویا : دیوانی عورت۔ الزام لگانے سے پہلے انجام سوچ لے۔

حنا : بچیے۔ بچیے۔ شہزادی صاحبہ۔ اس خوبصورت سانپ کے زہر سے بچیے۔ ؎

بے رحم ہے یہ رحم سر مو نہیں رکھتا
یہ روح میں درد آنکھ میں آنسو نہیں رکھتا
آزاد ہے جذبات پہ قابو نہیں رکھتا
انسان ہے، انسان کی مگر خو نہیں رکھتا
یہ پھول ہے وہ جو خوشبو نہیں رکھتا

آکٹیویا : بس بس خاموش۔ میں اپنے پیارے کی نسبت ایسا کوئی لفظ سننا نہیں چاہتی۔ جس سے اس کی توہین ہو۔

حنا : شہزادی۔ ؎

سراسر مکر، سر تا پا دغا، نا آشنا ہے یہ
مری آنکھوں سے دیکھو تم تو ہو معلوم کیا یہ
کنواری رہنا بہتر چاہیے اس عقد ہونے سے
وفا کی ہے عبث اُمید مٹی کے کھلونے سے

برولس : عالم پناہ۔ اگر آپ میری نصیحت قبول فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ عورت کے بیان پر کبھی یقین نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ عورتیں شیطان کے مکتب سے تعلیم پاکر نکلی ہیں۔ اس لیے ان سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔ ؎

جفا سے اُنس کریں اور وفا سے عار کریں
جگر پہ ضرب لگائیں تو دل پہ وار کریں
جو شرمناک عمل ہو ہزار بار کریں
یہ بے گناہ کو، دم میں گناہ گار کریں
ہزار مکر کے پہلو نکلتے بات سے ہیں
جہاں میں جتنے ہیں فتنے سب ان کی ذات سے ہیں

عِزرا : سریر آرائے عدالت، سلطنت کا ایک معزز رکن ہو کر انصاف کے راستے میں

روڑا اٹکانا، دباؤ ڈال کر شاہی انصاف اور شاہی رائے کو ایک مظلوم فریادی کے خلاف بنانا۔ کیا ان جیسے مقدس اور مذہبی پیشوا کو سزاوار ہے۔ کیا سلطانِ عادل کا انصاف مظلوموں کا سرپرست ہونے کے بدلے ظالموں کا طرفدار ہے؟

بادشاہ : نہیں عبرانی کبھی نہیں۔ جس طرح آفتاب کی روشنی، امیر کے محل اور غریب کے جھونپڑے میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ اسی طرح میں بھی انصاف کے وقت ادنیٰ اور اعلیٰ سب کو یکساں جانتا ہوں۔ اپنی ذمہ داری اور اپنا فرض اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

عزرا : بس تو پھر جھگڑا صاف ہے۔ آج کے روز آپ کے لیے صرف ایک ہی کام ہے اور وہ ان دونوں کا انصاف ہے۔

بادشاہ : میں انصاف کو استعمال کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کردوں گا۔

حنّا : خدا آپ کو مظلوموں کی حفاظت کے لیے قیامت تک زندہ رکھے۔ فرمایئے۔ آپ کی رعایا میں سے اگر کوئی شخص شادی کا وعدہ کرکے کسی عورت کو اپنی محبت میں گرفتار کرے اور اس کے کنوارے ہونٹوں اور گالوں کو ناپاک بنانے کے بعد اسے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کو اپنی دغابازی کا شکار کرے۔ تو حضورِ والا کا قانون اس کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے؟

بادشاہ : موت۔ بغیر رحم کے موت۔

عزرا : بس تو ہوچکا۔ فیصلہ ہوچکا۔ آپ شاہی نام کی عزت ہیں۔ تختِ سلطنت کے اہل ہیں۔ قلم اٹھایئے اور ولی عہد کے سزائے موت کے کاغذ پر دستخط فرمایئے۔

بادشاہ : مگر مجھے پہلے اس کا گناہ تو معلوم ہونا چاہیے؟

حنّا : یہ آپ کی عزت اور شہرت کو برباد کرنے والا۔ اس ملک کی غریب لڑکیوں کے سر پر تباہی لا رہا ہے۔ اس نے شادی کا وعدہ کرکے پہلے مجھے دھوکا دیا اور اب شہزادی آکٹیویا کو اپنی پر فریب محبت کے پھندے میں پھنسا رہا ہے۔

مجھ کو نہ کیا تو اسے کیا شاد کرے گا
اِس کو بھی مری طرح سے برباد کرے گا

بادشاہ : مارکس۔ سنتا ہے۔ اٹھ کھڑا ہو۔ اس کا جواب دے۔ ورنہ بدترین قسم کی سزائے موت تیرے لیے تیار ہے۔

مارکس : بے شک غلام اس کا خطاوار ہے۔ اور عاجزی کے ساتھ حضور والا سے رحم کا امیدوار ہے۔

بادشاہ : رحم یہ کرسکتی ہے میں نہیں کرسکتا۔

بروٹس : خاقانِ عالم۔

بادشاہ : بس۔

بروٹس : عالی جاہ۔

بادشاہ : کچھ نہیں۔

بروٹس : یہ نہ ہونا چاہیے۔

بادشاہ : یہ ضرور ہوگا۔

بروٹس : میری یہ عرض ہے کہ قانون گمراہوں کے واسطے ہے۔ نہ کہ بادشاہوں کے واسطے۔

بادشاہ : اگر بادشاہ گمراہ ہے تو اُسے بھی قانون کی رسی میں جکڑا جائے گا۔ اگر شہزادہ چور ہے تو چوری کی علت میں ضرور پکڑا جائے گا۔

بروٹس : میں پھر کہتا ہوں کہ عام رعیت سے ایک شہزادہ زیادہ قابلِ توقیر ہے۔ جس ہتھیار سے غلام پر ضرب لگائی جائے اسی ہتھیار سے آقا کو قتل کرنا رتبہ اور شان کی تحقیر ہے۔

بادشاہ : مگر انصاف کی تلوار آقا اور غلام دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔ ؎

یہاں تمیز نہ آقا میں ہے نہ بندے میں
کہ صاف دونوں کی گردن ہے ایک پھندے میں

بروٹس : عشق کا جوش ایک طرح کا جنون ہوتا ہے۔

حنا : اس خوشامد بازی سے انصاف کا خون ہوتا ہے۔

بروٹس : اری چپ چپ.... تو ایک بھکمنگے کنگال یہودی کی ذلیل چھوکری اور خاندانِ شاہی کی توہین کا ارادہ۔ ایک ننگ و نادم آوارہ لڑکی اور چراغ سلطنت کے بجھانے پر آمادہ۔

حنا : تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیروں کے سر تو تاج زر کے لیے ہیں اور غریبوں کے سر امیرو ں کی ٹھوکروں کے لیے ہیں۔

بروٹس : بے شک۔

عزرا : واہ رے مذہب۔ اور واہ رے مذہبی پیشوا۔

تمھارا غم ہے غم مفلس کا غم بس اک کہانی ہے
تمھارا عیش ہے عیش اور ہمارا عیش فانی ہے
یہاں بچپن بڑھاپا واں بڑھاپا بھی جوانی ہے
تمھارا خون ہے خون اور ہمارا خون پانی ہے
یہ نخوت اور یہ زر کیا لے کے اپنے ساتھ جائے گا
یہیں رہ جائے گا سب یاں سے خالی ہاتھ جائے گا

حنا : عادل سلطان۔ اب مجھے انصاف ملنے میں کیا دیر ہے؟ اگر آپ نے ابھی تک نہ سنا ہو تو میں اس سے بھی زیادہ بلند آواز سے انصاف انصاف پکار سکتی ہوں۔

بادشاہ : اُف کیا کروں۔ اور کیا نہ کروں؟

گھڑی شادی کی جو شاد آئی تھی ناشاد جاتی ہے
اِدھر انصاف جاتا ہے ادھر اولاد جاتی ہے
اندھیرے میں پڑا تھا کیا خبر تھی مجھ کو اس دن کی
جوانی اِس کی اور محنت مری برباد جاتی ہے

عزرا : عادل بادشاہ۔ کیا بیٹے کی محبت اور انصاف میں جنگ ہو رہی ہے؟

بادشاہ : ہاں۔ مگر فتح انصاف ہی کو ملے گی۔

حنا : تو پھر انصاف ملنا چاہیے۔

بادشاہ : ضرور ملے گا۔

حنا : آپ سے؟

بادشاہ : ہاں مجھ سے۔

حنا : کہاں؟

بادشاہ : یہاں۔

حنا : کب؟

بادشاہ : اسی وقت۔ بڑھو اے شاہی حکم کے پرستارو۔ اس ناخلف کو حراست میں لے لو اور کل مذہبی عدالت میں انصاف کے لیے پیش کرو۔

بروٹس : حضور والا۔

بادشاہ : خبردار۔ جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔

(موسیقی)

دوسرا ایکٹ - تیسرا سین

کرامت کا مکان

(نصیبن کا داخل ہونا)

نصیبن : توبہ توبہ۔ منوا۔ ارے منوا۔ بولتا کیوں نہیں۔ کیا کر رہا ہے؟ کہاں مر رہا ہے؟

منوا : سرکار حاضر ہوں میں۔ سرکار..... سرکار....

نصیبن : کیوں رے موے حرام خور۔ سو آوازوں پر ایک جواب۔ تیرا خانہ خراب۔ تانا شاہ کا پوتا ہے یا نادر شاہ کا نواسا؟

منوا : آپ تو مفت خفا ہوتی ہیں۔ ناحق گالیاں دیتی ہیں۔

نصیبن : ارے موئے بد ذات ہم مفت خفا ہوتے ہیں۔ ناحق گالیاں دیتے ہیں۔ کیا تو تنخواہ نہیں پاتا؟

منوا : تو کیا میں گالیاں کھانے کی بھی تنخواہ پاتا ہوں؟ میں نے ہاتھ بیچا ہے یا ذات؟

نصیبن : ہائے ہائے۔ جی چاہتا ہے موئے کو پھانسی لگا دوں پھانسی۔

منوا : اب میں سمجھا۔شاید ہائی کورٹ کے اختیارات بھی آپ اپنے ساتھ جہیز میں لائی ہیں۔

نصیبن : کیوں رے گستاخ نفر۔ پھر کھجایا تیرا سر۔ لوں جوتا۔ کروں مرمت؟

منوا : خبردار وہیں ٹھہر جانا۔ قدم آگے بڑھایا تو تم جانتا۔ زبان سنبھالو۔ اپنی نوکری بھاڑ میں ڈالو۔

(منوا کا جانا)

نصیبن : موے نوکروں پر اسی طرح رعب و داب قائم رکھنا چاہیے۔ بلکہ نوکروں پر ہی کیا منحصر ہے، تمام مردوں سے اسی طرح پیش آنا چاہیے۔ ورنہ مرد کی ذات ذرا سا منھ لگانے سے سر چڑھ جاتی ہے۔ عورت کو لازم ہے کہ مرد کی ڈور کبھی ڈھیلی نہ چھوڑے۔ ان سے ذرا دب کر نہ رہے۔ مرد ایک کہے تو عورت دس سنائے۔ اگر مرد ہاتھ اٹھائے تو عورت بھی اپنا چھل فریب دکھائے۔ روئے چلائے، دہائی مچائے اور کچھ بس نہ چلے تو دانت ہی کاٹ کھائے۔ میں اپنی تمام بہنوں کو صلاح دیتی ہوں کہ مرد سے ہرگز دب کر نہ رہیں۔ کیونکہ ہم عورتوں کو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے اور مردوں کو کنٹریکٹر سے بنوایا ہے۔ مردوں کا فرض ہے کہ عورتوں کا ہاتھ دبائیں پاؤں دبائیں۔ بستر بچھائیں۔ کھانا کھلائیں اور ہاں میں ہاں ملائیں۔ بس اور کیا۔

(نصیبن کا جانا اور کرامت کا آنا)

کرامت : جان بچی اور لاکھوں پائے۔ یارو ہماری نامراد بیوی نے مار تو ضرور کھلوائی مگر ساتھ ہی ساتھ رقم بھی دلوائی۔ زبردستی کا حکیم بننے یا بے ایمانی کرنے میں بڑا ہی مزا ہے۔ خدا بخشے ہمارے ابا جان جہنم مکان بھی یہی فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں جو بے ایمانی کے غبارے اڑائے گا وہی تر نوالے کھائے گا۔ کیا کریں ایسا کام کرنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر بزرگوں کی نصیحت پر عمل کرنا بھی عین سعادت مندی ہے۔ اس لیے میں نے بھی اب یہی راستہ اختیار کرلیا ہے۔ ؎

اے امانت، بر تو لعنت، از تو رنجے یافتم
اے خیانت، بر تو رحمت، از تو گنجے یافتم

منوا : ارے او بیٹا منوا۔

منوا : سرکار حاضر ہوں میں۔ سرکار... سرکار...

کرامت : کیوں بیٹا یہ تو بتا کہ آج کل ہماری بیوی کے مزاج کا تھرمامیٹر کتنی ڈگری پر ہے۔

منوا : سرکار۔ ان کے مزاج کا قوام ہمیشہ کڑا ہی رہا کرتا ہے۔ آج صبح ہی صبح وہ گالیوں کا تار بندھا وہ گالیوں کا تار بندھا کہ الاماں۔ میرا جی تو اس نوکری سے بالکل بیزار ہو گیا ہے۔

کرامت : ٹھہر جا بچہ کیوں گھبراتا ہے۔ اس شیطان زادی کو ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سمجھانے سے سمجھ جائے گی۔ مگر لوہے سے نرمی اور برف سے گرمی کی امید فضول ہے۔ اس نے تو جھوٹ موٹ بیوی ہونے سے انکار کیا تھا۔ مگر میں سچ مچ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کی فکر کر رہا ہوں۔ اچھا دیکھ اس سے بدلہ لینے کی ترکیب تجھے بتلاتا ہوں۔

(دونوں کانا پھوسی کرتے ہیں کہ نصیبن آ جاتی ہے)

نصیبن : کیوں جی یہ کیا کانا پھوسی ہو رہی ہے؟

کرامت : جی جی کچھ نہیں۔

نصیبن : جی کچھ نہیں۔ دیکھو میں تم دونوں کے کان اچھی طرح کھولے دیتی ہوں۔ آئندہ میرے گھر میں یہ کھسر پھسر نہ ہونے پائے۔

کرامت : اجی کھسر پھسر کیسی۔ یہ تو ذرا مشورہ ہو رہا تھا۔

نصیبن : مشورہ۔ مشورہ بیوی سے کرتے ہیں یا خدمت گار سے؟ دو ٹکے کے نفرے کو یار غار بناؤ گے تو خطا پاؤ گے۔ جوتیاں مار کر نکالو۔ موئے کتے کے منھ پر خاک ڈالو۔

منوا : دیکھیے دیکھیے کتیا مجھے کتا بنا رہی ہے۔

نصیبن : ارے تو کھڑا کھڑا سنتا ہے اور کچھ نہیں بولتا؟

کرامت : مگر میں کیا بولوں اپنا سر؟

نصیبن : تو سنتا نہیں ہے بڈھے جھڑوس؟

کرامت : کیا ہے بیوی فانوس۔

نصیبن : موئے بے حیا، دیکھ یہ کیا ہو رہا ہے؟
کرامت : ہوکیا رہا ہے۔ میری عزت کا نیلام؟
منوا : جو بڑھے سو پائے۔
نصیبن : ہت تجھے خدا خاک میں ملائے۔
منوا : دیکھیے سرکار۔
نصیبن : تیرے سر پر خدا کی مار۔
کرامت : یہ کیا۔ منوا کی خطا اور ہم کو سزا؟
نصیبن : چل موئے مشعلچی۔ ایک مداری ایک ڈفلچی۔
کرامت : تم تو یوں ہی خالی خولی خفا ہو رہی ہو۔
نصیبن : بیٹا خالی بھرے کے بھروسے نہ رہنا۔ مارے جوتیوں کے بھیجا بہا دوں گی۔ میاں اور نوکر دونوں کو مزا چکھا دوں گی۔
کرامت : یا اللہ جو کوئی میری حالت دیکھ کر ہنسے خدا کرے وہ بھی اسی آفت میں پھنسے۔
نصیبن : ذرا موے کو دیکھ تو سہی۔ صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل۔ خدا تجھے غارت کرے۔ نیست و نابود کرے۔ الٰہی مجھ کو رانڈ کر دے رانڈ۔
کرامت : (خود کلامی) ٹھہر جا کیوں گھبراتی ہے۔ تو رانڈ ہو اس سے پہلے میں رنڈوا ہوجاتا ہوں (مخاطب کرکے) کیوں بے منوا نہیں مانتا ہے۔ ہماری اکلوتی بیوی کے منھ لگتا ہے۔ تو نہیں جانتا کہ ہماری بیوی کیا ہے؟ ایک بچھی کا اوتار ہے۔ جب سے اس کا قدم گھر میں آیا ہے سارا محلّہ اُجاڑ ہے۔
نصیبن : کیا کہا؟ کیا کہا؟
کرامت : ارے آباد ہے۔ آباد ہے۔ لو چلو اب میں نے اس حرام زادے کو اچھی طرح ڈانٹ دیا ہے۔
نصیبن : نہیں ہرگز نہیں۔ اسے ابھی ابھی میرے گھر سے نکال دو۔
منوا : اونھ۔ جیسے ان کے باپ کا گھر ہے۔ اسے نکال دو۔ اُسے نکال دو۔ نہیں نکلتے۔

نصیبن : دیکھو دیکھو۔ موا کیا کہتا ہے؟

کرامت : کیوں بے غلام، پاجی، نافرجام، بے ایمان، کام چور، حرام خور، ہماری بیوی کو منھ چڑھاتا ہے۔ اب ذرا بھی بولا تو منھ مار کر تھوتھو توڑ دوں گا۔

نصیبن : اچھا دیکھو۔ دوسرا آدمی ملے یا نہ ملے، مگر دو دن کے اندر اسے میرے گھر سے نکال دو۔

کرامت : اجی توبہ کرو۔ دو دن کس کے۔ میرا دم بھی ناک میں آگیا ہے۔ جب تک یہ بلا میرے گھر سے نہ جائے گی تب تک میری طبیعت چین نہ پائے گی۔

نصیبن : اور ہاں خوب یاد آیا، کیوں جی تم نے میرے گلے کے ہار کا وعدہ کیا۔ وہ اب تک نہ لائے۔

کرامت : ہاں۔ ہاں۔ ابھی لاتا ہوں۔

نصیبن : آج سے کل، کل سے پرسوں، یوں ہی ٹالتے جاؤ گے برسوں؟

کرامت : پیاری خدا جانتا ہے۔ مجھے تو رات دن تیرے ہار ہی کی فکر رہتی ہے۔

نصیبن : جھوٹی بات ہے۔ میرا تم پر زور ہے تو ابھی ابھی منگواؤں گی۔

کرامت : ہاں۔ ابھی ابھی آجائے گا۔ یہ دیکھو تمھارے ہار ہی کے لیے تو یہ سو روپیہ کا نوٹ لایا ہوں۔

نصیبن : کیا۔ نوٹ۔ دیکھوں دیکھوں۔ میں دیکھوں نوٹ۔" (نوٹ دیتا ہے)

کرامت : دیکھ چکیں۔ لاؤ مجھے واپس دے دو۔

نصیبن : اجی بس جاؤ ہوا کھاؤ۔ بندی ایسی بھولی بھالی نہیں جو آیا ہوا نوٹ ہاتھ سے کھوئے گی۔

کرامت : جب ہی تو اپنی قسمت کو روئے گی۔

نصیبن : اب تو بندی خود جاتی ہے۔ سنار سے ہار لے کر آئے گی۔

کرامت : دیکھ یہ بات اچھی نہیں۔ دھوکا کھا جائے گی۔

نصیبن : اجی جاؤ۔ کسی اور کو بناؤ۔ میں ابھی جاتی ہوں اور ہار لے کر آتی ہوں۔

(نصیبن کا جانا)

کرامت : جا کم بخت۔ ہار تو تیری قسمت میں ہے۔ کیوں بچہ منوا کچھ سمجھا؟
منوا : کیا خاک سمجھا۔ آپ تو کہتے تھے میں اس کو نکالنے کی فکر میں ہوں۔ بجائے اس کے نکالنے کے اور الٹا کھٹ سے سو روپیہ کا نوٹ اسے نکال کر دے دیا۔
کرامت : بچہ۔ اس نوٹ کو اس کا رخصتانہ سمجھو۔ جب تک میں یہ نوٹ نہ نکالتا۔ یہ بھی یہاں سے نہ نکلتی۔ سمجھا؟
منوا : اوں ہوں۔ میں تو کچھ نہیں سمجھا۔
کرامت : تو تو بچہ ہے۔ کیا سمجھے گا۔ حکیم بننے یا عقل آنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ اچھا تو جا دوڑ کر ایک بوتل وسکی تو لے آ...... مگر ہاں۔ ذرا سنبھال کے۔ بغیر پرمٹ کے لائے گا نا؟ ایسا نہ ہو کہ بوتل تیرے ہاتھ میں ہو اور تو پولیس کے ہاتھ میں۔
منوا : ابھی میں کہیں ہوں مگر بوتل آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔
کرامت : شاباش۔

(منوا جاتا ہے اور گھبرایا ہوا واپس آتا ہے)

منوا : ارے میاں۔ غضب ہوگیا۔
کرامت : کیا ہوا؟
منوا : پولیس کے جوان اِدھر آرہے ہیں۔
کرامت : آرہے ہیں تو آنے دے۔
منوا : ارے میاں بیگم بھی ان کے ساتھ ہیں۔
کرامت : بیگم بھی ساتھ ہیں۔ بس تو تیر نشانے پر پڑا۔ یاروں کا ایک ہی فقرہ اسے پاگل خانے پہچانے کو کافی ہوگا۔ اچھا دیکھ تو ایک کام کرنا۔ فقط میری ہاں میں ہاں ملائے جانا۔

(نصیبن کا پولیس کے ساتھ آنا)

نصیبن : لو ان سے پوچھ لو یہ نوٹ کس کا ہے؟
کرامت : ہاں تو کیا بتلایا تو نے۔ آلو چھ پیسے سیر۔
جمعدار : کیوں جی یہ نوٹ تمھارا ہے؟
کرامت : ابے ترئی ہمیشہ سڑی ہوئی لاتا ہے۔ یہ ٹماٹر ہیں یا بندر کے گال؟
جمعدار : اجی میں پوچھتا ہوں یہ نوٹ تمھارا ہے؟
کرامت : اجی ہونٹ۔ ہونٹ سردی سے پھٹ گئے ہیں۔
جمعدار : ہونٹ نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ نوٹ تمھارا ہے؟
کرامت : کیا نوٹ۔ جناب کیا آپ مجھ سے دلگی کرتے ہیں۔ دیکھیے اگرچہ میں ایک غریب آدمی ہوں مگر کسی کا حرام کا مال نہیں لینا چاہتا۔ کیوں بیٹا منوا؟
منوا : بجا ہے قبلہ۔
نصیبن : تو کیا تم مجھے نہیں جانتے؟
کرامت : آپ کو پہلے کہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شاید کہیں میلے ٹھیلے میں دیکھا ہو۔ کیوں بیٹا منوا؟
منوا : ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ماہم کے عرس میں۔
نصیبن : اگر مجھے نہیں جانتے تو یہ بھی کہہ دو کہ میں تمھاری بیوی نہیں ہوں۔
کرامت : کیا بیوی۔ ارے بیوی غریب دکھیاری، آفت کی ماری، یا جناب باری یہ کون ہوگی لاوارث بے چاری؟
نصیبن : تو کیا تم میرے شوہر نہیں ہو؟
کرامت : کیا کہا شوہر؟ مائی تجھے دھوکا ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میری صورت تیرے شوہر سے ملتی ہو۔ دیکھو دیکھو۔ اچھی طرح دیکھو۔ شاید تم آدمی بھول گئی ہو۔
نصیبن : ارے مذاق جانے دو۔ دلگی ہو چکی۔
کرامت : بائی۔ ہم تجھ سے مذاق کیوں کرنے لگی۔ پرائی عورت کو تو میں ماں بہن سمجھتا ہوں۔ کیوں بیٹا منوا؟
منوا : درست ہے قبلہ۔
نصیبن : ارے غضب۔ کیا تم نے ابھی ابھی مجھے یہ نوٹ نہیں دیا؟

کرامت : جمعدار صاحب۔ یہ عورت کیا کہتی ہے۔ آخر آپ کا مطلب کیا ہے؟
جمعدار : یہ عورت بازار میں جعلی نوٹ چلانے آئی۔ اس لیے سرکار کی مجرم قرار پائی۔
کرامت : جعلی نوٹ؟
منوا : جعلی نوٹ؟
کرامت : کیا دنیا میں ایسی ایسی بھی بے ایمانی ہونے لگی؟
منوا : کیا عورتیں بھی یہ سب کام کرنے لگیں؟
نصیبن : جمعدار صاحب یہ جھوٹا ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں۔
کرامت : بائی تیرے منھ کو اختیار ہے۔ تو جو چاہے کہہ دے۔ لیکن میں تو تجھے سگی بہن سمجھتا ہوں۔
نصیبن : ہائے ہائے۔ موا کیا انجان بنتا ہے۔ اپنی خالہ کو اتنی جلدی بھول گیا۔ جی چاہتا ہے کہ موئے کی بوٹیاں نوچ کھاؤں۔
کرامت : جمعدار صاحب۔ پکڑیے پکڑیے۔ ورنہ کسی کا خون کردے گی۔
جمعدار : یہ دیوانی ہے اس کو باندھ لو۔ ورنہ کسی کو کاٹ کھائے گی۔
نصیبن : جمعدار صاحب۔ آپ مجھے کیوں باندھتے ہیں۔ میں کوئی دیوانی ویوانی نہیں ہوں مجھے تو اس بے ایمان کی بات پر غصہ آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ...
جمعدار : بس چپ رہو۔ ہم تیرے پاگل پن کے گواہ ہیں۔
نصیبن : موئے پاگل کہنے والے تیرا ستیاناس ہو، تیرا مردہ نکلے۔ تو ملیامیٹ ہوجائے۔ تجھ پر کڑکڑی بجلی گرے۔ تجھے گہری گور میں گاڑوں۔ تیرا نام لیوا پانی دیوا نہ رہے تجھے رووں۔ تجھے پیٹیوں، تجھے کھاؤں، تجھے چباؤں۔
جمعدار : لے جاؤ۔ لے جاؤ۔

(جمعدار اور سپاہی نصیبن کو پکڑ کر لے جاتے ہیں)

کرامت : ہت تیرا ستیاناس۔ کیوں بیٹا منوا۔ دیکھا کس صفائی سے پاگل خانے پہنچا دیا۔

منوا : واقعی سرکار۔ آپ نے تو کمال کر دکھایا۔
کرامت : ابے یہ تو جورو تھی۔ کبھی موقع پڑے گا تو بندہ اپنے آپ سے انکار کر دے گا۔
منوا : مگر سرکار۔ اس نے دعویٰ کیا۔ اور تحریری شہادت کا سہارا لیا تو؟
کرامت : ابے جب دعویٰ کرے گی تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو جانے دے۔ ۔

کیا ہاتھ صاف ہے، کبھی خالی گیا نہ وار
میں اپنے آپ کرتا ہوں تعریف بار بار

(کرامت کا گانا)

میں آفت کا پرکالا ہوں۔
سو حکمت فطرت والا ہوں۔
رگڑے جھگڑے کی ہنڈیا میں میں ہلدی مرچ مسالہ ہوں۔
آفت کا مارا بیٹا ہوں۔ میں پھر بھی شیخ کرامت ہوں۔
لچے، شہدے، گنڈے، بدمعاشوں کا تو میں دادا ہوں۔
تم مجھ کو سانپ سمجھو۔ بھوتوں کا باپ سمجھو۔
دنیا کا پاپ سمجھو۔ جو چاہو آپ سمجھو۔
میں آفت کا پرکالا ہوں۔

دوسرا ایکٹ - چوتھا سین

محل

(حنا کا غزل گانا)

غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا
بت کافر ہمارا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا
جب اتنی بے وفائی پر اسے دل پیار کرتا ہے
تو یا رب وہ ستم گر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
کوئی لذت نہیں ہے پھر بھی دنیا جان دیتی ہے
خداوند محبت میں مزا ہوتا تو کیا ہوتا
سنا ہے حشر وہ ذکر وفائے غیر کرتے تھے
جو میں بھی بیچ میں کچھ بول اٹھا ہوتا تو کیا ہوتا

(آکٹیویا کا آنا)

آکٹیویا: میری پیاری بہن، اتنی سخت نہ بن۔ نرمی اور رحم جو عورت کی بہترین صفتیں ہیں، ان کو غصے پر قربان نہ کر۔ بُرے کے ساتھ تو بھی بُری نہ بن۔ ؎

بے قراری تری، چاہت کا نشان دیتی ہے
بجھ گئی آگ مگر اب بھی دھواں دیتی ہے
دل میں کچھ ہونٹ پہ کچھ، رسم دغا عام نہ کر
تو بھی اس کی طرح اس عشق کو بدنام نہ کر

حنا : نہیں ہرگز نہیں۔ اب اس کے لیے ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔

آکٹیویا : دیکھو میں بھی تمھاری طرح ایک عورت ہوں۔ اور معزز قوم کی عورت ہوں۔ ساتھ ہی ایک بادشاہ کی بیٹی اور دوسرے بادشاہ کی بھتیجی ہوں۔ مگر اس پر بھی اس کی زندگی بھیک میں پانے کے لیے ایک فقیرنی کی طرح تمھارے سامنے دامن پھیلاتی ہوں۔ ـ

وفور یاس سے ہے اب عجیب حال مرا
فقیر جان کے پورا کرو سوال مرا

حنا : بچاؤں گی۔ بچاؤں گی۔ جب تم اور یہ دل دونوں اس کی طرفداری کرتے ہیں، تو ضرور بچاؤں گی۔ ـ

جاؤ اور کہہ دو وفا کی شرط پوری کر گئی
تم رہو جیتے کہ تم پر مرنے والی مر گئی

(حنا کا گانا)

پیار کرکے نہ جانا نبھانا رے۔
بے وفا ہے یہ جھوٹا زمانہ۔
سب ہیں مطلب کے یار۔ یہ ہیں پورے عیّار۔
کسی ظالم سے دل نہ لگانا۔ پیار...
چھین ہی لیتے ہیں یہ گیسوؤں والے دل کو
کیسا برباد کیا نازوں کے پالے دل کو
کوئی کم بخت بھلا خاک سنبھالے دل کو
بے وفاؤں کے خدا پالے نہ ڈالے دل کو
سب ہیں مطلب کے یار۔ پیار...

دوسرا ایکٹ - پانچواں سین

مذہبی عدالت

(مارکس اور حنا کا الگ الگ کٹھ گھروں میں کھڑے دکھائی دینا
ایک طرف عزرا اور دوسری طرف آکٹیویا کا بیٹھے ہوئے نظر آنا۔
بروٹس کا اجلاس کی کرسی پر بیٹھنا۔ چند سپاہیوں کا حنا اور مارکس کو
اپنی حراست میں لینا)

بروٹس : حنا تو ہوش میں ہے؟

حنا : ہاں۔

بروٹس : تجھ پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا گیا؟

حنا : نہیں۔

بروٹس : تو بنا جبر و اکراہ، اپنا پہلا بیان واپس لیتی ہے؟

حنا : بے شک۔

عزرا : حنا۔ حنا۔ کیوں محبت میں اندھی بن رہی ہے؟

حنا : اس لیے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

عزرا : کیوں اپنے ہاتھوں سے قبر تیار کر رہی ہے؟

حنا : اس لیے کہ قبر میں جاؤں گی تو ایک بے وفا کے ظلم سے نجات پاؤں گی۔

عزرا : عدالت اس کی باتوں کا یقین نہ کرے۔ یقیناً اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

بروٹس : حنّا۔ میں روم کے قانون کے مطابق تجھ سے تیسری مرتبہ دریافت کرتا ہوں کہ تو شہزادہ مارکس پر لگائے ہوئے تمام الزامات واپس لیتی ہے؟

حنّا : ہاں۔ لفظ بہ لفظ۔

عزرا : آہ۔ ۔

ضبط کی طاقت بھی کھو دیتی ہے اور اوسان بھی
آگئی جب ضد تو یہ آندھی بھی ہے طوفان بھی
جوش میں آگے بڑھی عورت، تو پھر رکتی نہیں
دِل تو دِل چاہت میں دے دیتی ہے اپنی جان بھی

بروٹس : یہودی۔ چونکہ تم بھی اس دعوے کی تائید کرنے والے تھے۔ اس لیے اب تم کیا کہتے ہو؟

عزرا : جس قدر افریقہ کے بیابان میں ریت کے ذرے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ میرے پاس بولنے کے لیے الفاظ تھے لیکن اس ناعاقبت اندیش چھوکری کی وجہ سے میں اب کچھ کہنا نہیں چاہتا اور قسمت کے فیصلے کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔

بروٹس : تو اب میرا صرف اتنا فرض رہ گیا ہے کہ اپنا آخری حکم سنادوں.... شہزادہ مارکس آپ کو عزت و آبرو کے ساتھ رہا کیا جاتا ہے... اور حنّا اور عزرا، تمھیں ایک رومن شہزادے پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں زندہ آگ میں جلائے جانے کی سزا دی جاتی ہے۔

حنّا : سزا۔ کس کو؟ مجھ کو یا میرے باپ کو؟

بروٹس : دونوں کو۔

حنّا : مگر یہ انصاف کے خلاف ہے۔

بروٹس : میرا یہ فیصلہ مطابق انصاف ہے۔

حنّا : ارے نہیں نہیں۔ ۔

غارت کرو مجھے مرے پھوٹے نصیب کو
لیکن بچاؤ بخش دو بوڑھے غریب کو

بروٹس : قانون اپنے فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں دیکھتا.... جاؤ اور اپنی قسمت کے موجودہ فیصلے کو صبر کے ساتھ برداشت کرو۔

مارکس : بزرگ باپ۔ اپنے شہزادے اور اس ملک کے ہونے والے بادشاہ پر ایک عنایت۔

بروٹس : کیا؟

مارکس : تھوڑی شفقت۔

بروٹس : یعنی۔

مارکس : اپنی طاقت اور اثر کو کام میں لایئے۔ جس طرح ممکن ہو ان دونوں کی جان بچایئے۔

بروٹس : مگر عدالت؟

مارکس : وہ آپ کے قبضے میں ہے۔

بروٹس : قانون؟

مارکس : وہ آپ کا حکم ہے۔

بروٹس : موجودہ فیصلہ؟

مارکس : وہ آپ کی رائے ہے۔

بروٹس : بادشاہ کی مرضی؟

مارکس : وہ آپ کی مٹھی میں ہے۔

بروٹس : اپنے فیصلے کی آخری سطریں لکھتے وقت جب میں نے اس یہودی دوشیزہ کے بھولے چہرے کی طرف دیکھا تھا تو ایک نامعلوم جذبے کے اثر سے میری انگلیاں تھرتھرانے لگی تھیں۔ اور اب بھی جب کہ یہ موت کی طرف جارہی ہے۔ اپنی روح میں ایک عجیب ولولہ اور اضطراب محسوس کر رہا ہوں... اچھا آپ جایئے۔ مجھ سے جو ممکن ہوگا وہ کروں گا۔

مارکس : تو میں ان دونوں کی زندگی آپ کو بطور امانت کے سپرد کرتا ہوں۔

بروٹس : میں کوشش کروں گا کہ دیانت دار امین ثابت ہوں (مارکس جاتا ہے) حنا تم اپنے باپ کو پیار کرتی ہو؟

حنا : اپنے مذہب کی طرح۔

بروٹس : اس کی زندگی محفوظ رکھنا چاہتی ہو؟

حنا : اپنی عصمت و عزت کی طرح۔

بروٹس : تب اس خیال پر قائم رہنا۔ (عزرا کو مخاطب کر کے) یہودی یہ تمھاری اولاد ہے؟

عزرا : بے شک۔

بروٹس : اولاد کے لیے ماں باپ اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں؟

عزرا : یقیناً۔

بروٹس : تو اولاد کی سلامتی کے لیے تمھیں روایت پرستی کے عقاید کو نثار کرنا ہوگا۔ جان بچانا چاہتے ہو تو اپنے بزرگوں کا مذہب چھوڑ کر تم دونوں کو رومن دین اختیار کرنا ہوگا۔

عزرا : فکر، دکھ، بیماری اور بڑھاپے کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی زندگی کی قیمت، مذہب سے ادا کروں؟ اس چند روزہ دنیا کے لیے ابراہیم اور موسیٰ کے خدا سے دغا کروں؟ ۔

اک یہودی لاکھ دکھ ہوں دین سے ٹلتا نہیں
یہ ہے وہ فولاد جو بھٹی میں بھی گلتا نہیں
غم نہیں، کچھ بھی ہو، خوش ہوں شاد بھی ناشاد بھی
دین پر صدقے ہوں میں بھی اور مری اولاد بھی

بروٹس : مذہبی دیوانے۔ موقعے کی نزاکت پر دھیان کر۔ تعصب اور جہالت پر، اپنی اور اس کی زندگی نہ قربان کر۔

عزرا : زندگی؟ زندگی دنیا کا دھوکا ہے۔ ایک بوڑھا جو اس مکار دنیا کے سینکڑوں دھوکے کھا چکا ہے اب اس نئے دھوکے میں کبھی نہ آئے گا۔ ۔

کوئی جیتا ہے جہاں میں جاہ و دولت کے لیے
کوئی جیتا ہے فقط رعب و حکومت کے لیے

کوئی عزت کے لیے اور کوئی شہرت کے لیے
میں فقط جیتا ہوں اپنے دین و ملت کے لیے
ہے نجات دائمی کی، زندگی میں راہ ایک
قبر کے منھ سے بھی بولوں گا کہ ہے اللہ ایک

بروٹس : عزرا بے وقوف نہ بن۔ یہ میری مہربانی ہے جو اس وقت تیری جان بچانے کو تیار ہوں۔ ورنہ تو جانتا ہے کہ میں یہودیوں کی صورت تک سے بیزار ہوں۔

عزرا : اور یہ اسی نفرت اور بیزاری کا نتیجہ ہے کہ قدرت نے تمھارا غرور توڑ دیا ہے۔ تمھارا گھر بار، بیوی، بچہ سب کچھ چھین کر تمھیں اس دنیا میں تنہا جلنے اور کڑھنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

بروٹس : میری پچھلی زندگی کے حالات تو کیسے جانتا ہے؟

عزرا : بیدرد رومن۔ عزرا آج سے نہیں تجھے سولہ برس سے پہچانتا ہے۔ ۔

ہم یہودی آپ کے لطف و کرم بھولے نہیں
آپ بھولے آپ کو صید ستم بھولے نہیں
دل کے داغوں کو سمجھتے ہیں نشانی آپ کی
یاد ہے ہم سب کو اک اک مہربانی آپ کی

بروٹس : میں نے تیری قوم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ اسی کی مستحق تھی۔ مگر اب میری رحم دلی دیکھ کہ تجھے سراسر مجرم پاتا ہوں اور پھر بھی تیری جان بچاتا ہوں۔

عزرا : جان۔ جان کی اب مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ البتہ اتنی آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے، ایک قاتل، پُر فن، بے رحم رومن کا سب کس بل نکال دوں۔ اس کے پتھر جیسے کلیجے میں چٹکیاں لے لے کر سوراخ ڈال دوں۔ ۔

میں ہنستا، اور کلیجہ تھام کر رَوتا ہوا تو ہو۔
مری آنکھوں میں نفرت اور تری آنکھوں میں آنسو ہو

بروٹس : میں تجھے سخت بیوقوف پاتا ہوں۔

عزرا : میں تجھے آج سے سولہ برس پہلے کا واقعہ یاد دلاتا ہوں۔ جس وقت شاہ نیرو کے حکم سے شہر روما میں چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی، اُس وقت تیرے گھر میں ایک خوبصورت بیوی اور اس کی گود میں ایک چھ ماہ کی بچی تھی۔

بروٹس : اس بات کی یاد دلانے سے تیری مراد کیا ہے؟

عزرا : میں پوچھتا ہوں کہ ان دونوں کے آگ میں جل جانے کا واقعہ تو تجھے یاد ہے؟

بروٹس : ہاں۔ میں اُس منحوس دن کو، جس روز موت نے میری بیوی اور بچی کو مجھ سے چھین لیا، کبھی نہیں بھول سکتا۔

ابھی تک غم سے کڑھتا ہے، ابھی تک یاد کرتا ہے
مرا ٹوٹا ہوا دل، آج تک فریاد کرتا ہے

عزرا : نیرو کی آگ تیری بیوی کے لیے آتشیں کفن ثابت ہوئی مگر اس کے سینے سے لپٹی ہوئی تمھاری چھ ماہ کی معصوم بچی، جو مردہ لاش پر قدرت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا افسوس کا آنسو معلوم پڑتی تھی....

بروٹس : کیا وہ زندہ رہی؟

عزرا : ہاں۔

بروٹس : اور ابھی تک زندہ ہے؟

عزرا : ہاں۔

بروٹس : اسے کس نے بچایا؟

عزرا : خدا کی ذات نے۔

بروٹس : کس نے آگ سے نکالا؟

عزرا : ایک رحم دل یہودی کے ہاتھ نے۔

بروٹس : اُس کا نام؟

عزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : اس کا ٹھکانہ؟

عزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : اُس سے ملنے کا طریقہ؟

عزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : نہیں عزرا تجھے بتانا ہوگا۔

عزرا : ہرگز نہیں۔ یہ میرا راز ہے، جو میری جان کا دم ساز ہے۔

بروٹس : عزرا۔ عزرا۔ مجھ پر رحم کر۔

عزرا : رحم۔ رحم۔ آج یہ پہلا روز ہے کہ رحم کا لفظ تمھاری زبان سے نکلا۔ اب تو تمھیں معلوم ہوگا کہ رحم کی ضرورت مظلوم یہودیوں ہی کو نہیں بلکہ ظالم رومنوں کو بھی ہوا کرتی ہے۔ ایک کنگال مفلس یہودی کے پاس رحم کہاں سے آیا۔ جاؤ اپنے بیدرد قانون سے مانگو۔ اپنی ظالم قوم سے طلب کرو۔ اپنے نامنصف دیوتاؤں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔ بھیک مانگو۔ گڑگڑاؤ۔ ؎

کیا کیا ہے غیب سے جو رحم کی سوغات آئے
بیج ہی بویا نہیں تو پھل کہاں سے ہاتھ آئے

بروٹس : بتادے عزرا۔ بتا دے میں اپنے پچھلے قصوروں کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور یہ سر جو مذہبی پیشوا کا تاج پہننے کے بعد اس ملک کے بادشاہ کے سامنے بھی نہیں جھکا، آج تیرے قدموں پر جھکاتا ہوں۔

عزرا : کیوں؟ کیسا جھٹکا لگا؟ ؎

اپنے اوپر آئی تو بھولا سبق یاد آگیا
غیب سے گھونسا پڑا تو کیسا سر چکرا گیا
بیٹھنے دیتے نہ تھے مکھی بھی کل جس ناک پر
سر جھکا کر اب رگڑتے ہو اسی کو خاک پر

جس کو دہراؤں، سبق ہی ایسا سکھلایا نہیں
کیوں ترس کھاؤں میں جب تم نے ترس کھایا نہیں

بروٹس : تو انکار؟

عزرا : لاکھ بار۔

بروٹس : نہیں جواب دے گا؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : نہیں بتائے گا؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : نہیں رحم کرے گا؟

عزرا : نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔

بروٹس : اچھا نہیں تو نہیں سہی۔ اب میں زبردستی تیرے سینے سے یہ راز اگلواؤں گا۔ تیری ایک ایک بوٹی کا قیمہ کرکے اپنے کتوں کو کھلاؤں گا۔ جاؤ۔ لے جاؤ۔

جلادو، پھونک دو، جھگڑا ہی پاک کر ڈالو
شجر کے ساتھ ثمر کو بھی خاک کر ڈالو
رکھے اسے بھی وہیں، جس جگہ یہ آپ رہے
اب اس زمین پہ بیٹی رہے نہ باپ رہے

حنا : اے رومن سردار۔

بروٹس : مُردار۔

عزرا : خبردار۔

(پردہ)

تیسرا ایکٹ - پہلا سین

راستہ

(حنا سپاہیوں کے ساتھ قیدخانے کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے)

---÷---

تیسرا ایکٹ - دوسرا سین

دارالعذاب

بروٹس : عزرا۔ تو دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی ہم رومنوں سے مذہب، نیکی اور فراخ دلی میں افضل ہیں؟

عزرا : بے شک۔

بروٹس : تو اس کا ثبوت دے۔

عزرا : کس طرح؟

بروٹس : ثابت کر کہ تو درگذر اور نیکیوں کا دلدادہ ہے۔ ثابت کر کہ تیری روح میں انتقام سے رحم کا مادہ زیادہ ہے۔

عزرا : مگر میں رحم کس پر کروں؟

بروٹس : مجھ پر۔ ؎

مرہم ہے ترے پاس مرے زخمِ جگر کا
بتلا دے مجھے حال، میری نورِ نظر کا

عزرا : سب ہوگا۔ یہی نہیں ہوگا۔ ؎

تماشا دیکھتے تھے تم غریبوں کے تڑپنے کا
پڑا ہے صبر، اب اُن بے گناہوں کے کلپنے کا
کڑھو معلوم ہو تاکہ ستم کیا ہے جفا کیا ہے
تمھیں بھی تو خبر ہو کہ تڑپنے میں مزا کیا ہے

بروٹس : عزرا جو مفلس ہے وہ دولت چاہتا ہے۔ جس کے پاس دولت ہے وہ خطاب

چاہتا ہے۔ جس کے پاس خطاب ہے وہ حکومت چاہتا ہے۔ میں تمھیں یہ تمام چیزیں بیک وقت دینے کو تیار ہوں۔ یہ سب لے لے اور اپنے دل کا راز مجھے دے دے۔ ؎

تری اُجڑی ہوئی قسمت کی دنیا پھر سے بستی ہے
بتا۔ اک ہاں سے تجھ پر دولت و عزت برستی ہے

عزرا : خود غرض رومن۔ تیرے ظلم و ستم کا کفارہ دولت سے ادا نہیں ہو سکتا۔ دولت اور خطاب زندگی کے خیالی سائے ہیں۔ اگر تو تمام دنیا کی دولت سمیٹ کر مجھے دے دے، تو بھی یہ ان آنسوؤں کی قیمت نہیں ہوسکتی جو تیرے ظلم و ستم نے مظلوموں کی آنکھوں سے ٹپکائے ہیں۔ ؎

تو ہی ہے، چھین لیا جس نے سکھ نصیبوں کا
تو ہی ہے، جس نے اُجاڑا چمن غریبوں کا
کبھی بلکتے تھے وہ، آج تو بلکتا ہے
انھیں کا خون ہے جو آنکھ سے ٹپکتا ہے

بروٹس : تو ظلم کر رہا ہے۔

عزرا : تجھ سے تھوڑا۔

بروٹس : تو بے رحم ہے۔

عزرا : تجھ سے کم۔

بروٹس : تو جہنم میں جائے گا۔

عزرا : تیرے بعد۔

بروٹس : تو نہیں؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : کب تک؟

عزرا : موت تک۔

بروٹس : اچھا تو دونوں کو حوالۂ عذاب کرو۔ موت کے کڑوے پیالے کو اور زیادہ کڑوا

بتانے کے لیے، باپ سے پہلے بیٹی کو کباب کرو۔ ؎

اس طرح بھونو کہ ٹوٹے کوہِ غم گمراہ پر
لاکھ لاکھ آنسو بہائے اس کی اک اک آہ پر

حنا : لبّا پیارے لبّا۔ مرنے سے پہلے مجھے برکت دو کہ میرے دل سے موت کا خوف نکل جائے اور عورت کی فطرت بات پر جان دینے والے مرد کے ارادے سے بدل جائے۔ ؎

بل نہ تیور پہ پڑے، دل نہ گھٹے، آن نہ جائے
جان اس طرح سے دوں بات رہے شان نہ جائے
کر دوں حیرت زدہ جرأت سے جفاکاروں کو
پھول سمجھوں میں، دہکتے ہوئے انگاروں کو

عِزرا : اُف۔ اس لڑکی کی محبت اور میرے ارادے میں جنگ شروع ہو گئی۔ بچاتا ہوں تو یہودی مذہب کی برکت اور نجات سے محروم رہی جاتی ہے اور نہیں بچاتا تو جنگل کی سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح بھاڑ میں جھونک دی جاتی ہے۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ ؎

میں راہ کون سی بول اے دلِ شکستہ لوں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا، کدھر کا رستہ لوں
اُسے حوالے کروں، یا جفا پسندوں کو
خدا کو سونپ دوں اس کو کہ اس کے بندوں کو

بروٹس : عِزرا۔ دنیا کے کسی باپ کے کلیجے میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنی اولاد کی دردناک موت اپنی آنکھ سے دیکھ سکے۔ عقل سے پھر صلاح لے۔ تو دو حرف دے کر اس کی زندگی مجھ سے مول لے سکتا ہے۔ ؎

راز جس صندوق میں ہے بند اُس کو توڑ دے
کھول دے دل کی گرہ، یہ لب ہلا، ضد چھوڑ دے

عزرا : یہ دنیا بڑی دل چسپ اور خوب صورت ہے۔
حنا : بے شک لیکن اس وقت تک جب تک دل کے ساتھ امید و مسرت ہے۔
عزرا : ایک جوان آدمی کو دنیا چھوڑتے وقت، بوڑھے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔
حنا : سچ ہے۔ لیکن جو انسان مصیبت کے شروع ہوتے ہی مصیبت کا خاتمہ کر دے۔ اُس کے فہم و دور اندیشی کی تعریف ہوتی ہے۔
عزرا : اگر تو چاہے تو اس دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔
حنا : بغیر خوشی کے۔ بغیر اُمید کے۔ بغیر تمھارے؟ نہیں پیارے ابا نہیں۔ ؎

نفرت ہے مجھ کو شہد سے اور سم قبول ہے
یہ ہولناک موت، یہ ماتم قبول ہے
تنہا جو ہوں، تو چھوڑ کے بھاگوں بہشت کو
تم ساتھ ہو تو مجھ کو جہنم قبول ہے

عزرا : حنا۔ زندگی ایک سلطنت۔ روح اس کی بادشاہ۔ اور مذہب اس بادشاہ کے سر کا تاج ہے۔ اگر زندگی کو موت کے حملے سے بچانا چاہتی ہے تو سر کا تاج اتار کر پیروں سے مل ڈال۔ اپنا مذہب اور ایمان بدل ڈال۔ ؎

دین و دنیا دونوں، منھ بھر دیتے ہیں محتاج کا
اس کا وعدہ پر ہے کل کا، اِس کا وعدہ آج کا

حنا : ابا جان۔ ؎

کروں ایمان پر قربان، دنیا کی بہاروں کو
مرے گھر میں ہے جب سورج تو کیا دیکھوں ستاروں کو
خضر نے عمر اور قاروں نے زر پایا تو کیا پایا
اُسے دنیا میں سب کچھ مل گیا، جس نے خدا پایا

بروٹس : جب اسے تبدیل مذہب سے انکار ہے، تو دیر بیکار ہے۔ ڈال دو کڑھاؤ میں۔
عزرا : بروٹس۔ اس پر رحم کر۔

بروٹس : نہیں۔

عزرا : اسے چھوڑ دے۔

بروٹس : ہرگز نہیں۔

عزرا : اس کی زندگی بھیک میں دے دے۔

بروٹس : کبھی نہیں۔ اگر اپنی اور اس کی زندگی کا پیار ہو تو وہ سوال جس کو میں دہراتے دہراتے تھک گیا ہوں اس کا جواب دینے کو تیار ہو۔

عزرا : اچھا بتاتا ہوں۔

بروٹس : بتاتا ہوں؟

عزرا : ہاں۔

بروٹس : تو بول۔

عزرا : ایک شرط سے۔

بروٹس : بیان کر۔

عزرا : ان کو تاکید کردے کہ جس وقت میں تیری لڑکی کا حال بیان کرچکوں تو پس و پیش کے خیال کو دل سے نکال دیں اور بغیر دوسرا حکم پائے اس لڑکی کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیں۔

بروٹس : میں اس شرط کو منظور کرتا ہوں۔

عزرا : دل و جان سے؟

بروٹس : دین و ایمان سے۔

عزرا : اچھا تو سنو۔ شہر روما کے جلنے سے دو برس پہلے کا واقعہ ہے کہ تو نے محض سلام نہ کرنے کے جرم میں میری پانچ برس کی بچی کو اس کی ماں کی گود سے زبردستی چھین کر شیروں کے پنجرے میں ڈال دیا تھا۔ مگر اب ایک یہودی کا سلوک دیکھ کہ اُس وقت جب کہ ظالم نیرو کے حکم سے تمام شہر میں آگ لگی ہوئی تھی میں نے تیرے جلتے ہوئے محل میں گھس کر تیری چھ ماہ کی اکلوتی بچی کو موت کے منھ سے باہر نکالا۔ اور انتقام اور کینہ کو جس سے میرا سینہ جل رہا تھا، بھول گیا۔ اور اسے اپنی اولاد کی طرح پالا۔

بروٹس : تو نے نکالا؟ تو نے پالا؟

عزرا : ہاں میں نے۔ میں نے۔ ظالم رومن۔ ایک یہودی نے اور اس یہودی نے جسے تم ٹھوکریں مارتے تھے۔ جسے کتا سمجھ کر دھتکارتے تھے۔ ؎

روئی جو اُس کے حال پہ، اُس چشم نم کو دیکھ
اپنے ستم کو دیکھ، ہمارے کرم کو دیکھ

بروٹس : مگر وہ کہاں ہے؟

عزرا : کیا جن آنکھوں سے خدا کی ہزاروں قوتوں کو دیکھ کر بھی اُسے شناخت نہیں کرسکتے، ان آنکھوں سے اپنی لڑکی کو بھی نہیں پہچان سکتے؟ دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ خون آپ سے آپ جوش مارے گا۔ اگر تمھارا ہی لہو ہوگا تو رگوں کے اندر سے پکارے گا۔

بروٹس : نہیں عزرا نہیں۔ تو مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ تیر و تلوار سے نہیں مار سکتا، اس لیے جھوٹی خوشی دلا کر دیوانہ بنا دینا چاہتا ہے۔ ؎

شکل دکھلا دے کہ نور آئے خجل آنکھوں میں
شوق دیدار سے کھنچ آیا ہے دل آنکھوں میں

عزرا : وہ دیکھ۔ تیرے سامنے ہڈی اور خون سے بنا ہوا ایک آئینہ کھڑا ہے۔ اُسی آئینے میں تجھے، تیری کھوئی ہوئی لڑکی کی صورت نظر آئے گی۔ جو تیرے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے گی۔

بروٹس : یہ تو ایک یہودن لڑکی ہے۔

عزرا : یہودن نہیں، رومن نژاد ہے۔ میری نہیں تیری اولاد ہے۔

بروٹس : میری؟

عزرا : ہاں تیری۔ یہی وہ لڑکی ہے جسے میں نے بھڑکتی ہوئی آگ سے باہر نکالا اور اپنی اولاد بنا کر حنا کے نام سے پالا۔

بروٹس : اس کا ثبوت؟

عزرا : تیرے خاندان کی یادگار یہ تعویذ و عقیق کی مالا۔ ؎

خدا کی دین ہے ملتا ہے یہ نصیبوں سے
ہے رحم سیکھنا تو سیکھ ہم غریبوں سے

بروٹس : ٹھیک۔ یہ وہی مالا ہے۔ جو پیدائش کے روز نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے لڑکی کے گلے میں پہنائی تھی۔ پہچان لیا۔ وہی۔ وہی.... آ... میرے دل کا سرور... میری آنکھوں کا نور.... آ۔

حنا : ابا جان۔

عزرا : ٹھہرو۔ میرا وعدہ پورا ہوچکا۔ اب تمھارا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا۔ چلو۔ فکر و حیرت کو دل سے نکال دو۔ اور باپ کے سامنے بیٹی کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دو۔

بروٹس : نہیں عزرا۔ اب یہ نہیں ہو سکتا۔

عزرا : نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟ ۔

جب تلک یہ جانتے تھے، غیر کی اولاد ہے
تب تلک یہ تھا زباں پر قابل بیداد ہے
جب کھلا یہ کون ہے، کیا ذات، کیا بنیاد ہے
تب یہ چلانے لگے، فریاد ہے فریاد ہے
کیا ہوئی وہ ضد، کہاں ہے زور و شور اب آپ کا
سامنے بیٹی کے ملنے دو کلیجہ باپ کا

حیرت اور خوف کی تصویریں بن کر حرکت کرنا کیوں بھول گئے؟ ثابت کرو کہ تم زندہ ہو۔

بروٹس : نہیں عزرا نہیں۔ میری غرور کی زندگی ختم ہو گئی۔ میرے اقتدار کا سر بلند قلعہ ایک ہی زلزلے میں ریزہ ریزہ ہوکر اپنی خاک میں کفن پوش ہو گیا۔ ۔

جب پڑی خود اپنے سر پر ضرب، عبرت ہو گئی
غیر کا بھی دکھ ہے دکھ، مجھ کو نصیحت ہو گئی

تیسرا ایکٹ - تیسرا سین

دربار

(سب کا خوشی میں بیٹھے ہوئے دکھائی دینا)

بروٹس : میرے محسن عزرا۔ میرے عزیز بھائی۔ اگرچہ محبت پدری کا کچھ اور ہی ارادہ ہے۔ مگر حنا پر مجھ سے تمھارا حق زیادہ ہے۔ اس لیے جس دین و مذہب میں اس نے پرورش پائی ہے اُسی دین و مذہب میں رہے گی۔ جس طرح آج تک تمھیں اپنا باپ کہتی رہی ہے، اُسی طرح ہمیشہ کہے گی۔

مارکس : پیاری حنا۔ میں تمھارا گنہ گار ہوں۔ اور جو سزا تجویز کرو اس کو بخوشی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

حنا : میں تمھیں یہی سزا دیتی ہوں کہ جس طرح مجھے دھوکا دیا ہے، اُسی طرح آئندہ کسی اور عورت کو دھوکا نہ دینا۔

آکٹیویا : پیاری بہن۔ جب تم رومن نسل اور رومن باپ کی اولاد ہو تو تمھارا بادشاہ تمھارے لیے شادی کے قانون میں ضرور ترمیم کر دے گا۔

بادشاہ : ایسا ہی ہوگا۔

آکٹیویا : اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اب جو دور تھا وہ قریب ہو۔ میری خوشی اور راحت میں تم بھی برابر کی شریک ہو۔

حنا : بس اب میں راحت، خوشی، آرام، اِس جھوٹی دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہتی..... تم دونوں جیو اور خوش رہو۔

آکٹیویا : تو بہن۔ تم اس جھوٹی دنیا میں تنہا رہ کر کیونکر زندگی بسر کروں گی؟

حنا : میں......

(حنا کا گانا)

اپنے مولا کی میں جوگن بنوں گی۔
جوگن بنوں گی، بروگن بنوں گی۔ اپنے مولا....
تیرے عشق میں پہنی کفنی چھوڑا زیور گہنا
تو جس رنگ میں خوش ہو پیارے اُسی رنگ میں رہنا۔ اپنے مولا...
کوئی جائے مسجد میں اور کوئی جائے مندر
ہم نے تیرا جلوہ پایا پیارے دل کے اندر۔ اپنے مولا...
کوئل بن کر جنگل ڈھونڈھا، بلبل بن کر گلشن،
کلیاں چُن چُن میں نے دیکھی بن کر تیری مالن۔ اپنے مولا...

(پردہ)

ترکی حور

ترکی حور (1922)

یہ ڈراما بھی آغا حشر کی اس اصلاحی مہم سے متعلق ہے، جو انھوں نے 'سلور کنگ' سے شروع کی تھی۔ اس ڈرامے میں بھی 'سلور کنگ' ہی کی طرح شراب نوشی، قمار بازی اور طوائفوں سے تعلق رکھنے کے برے نتائج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسے مڈنس کمپنی کے رستم جی سیٹھ کے اصرار پر لکھا گیا تھا اور انھیں کی کمپنی نے اسے پہلی بار اسٹیج بھی کیا۔ اس ڈرامے میں ہندوستانی بیوی کا مثالی کردار پیش کیا گیا ہے، جو شوہر کے انتہائی ناروا سلوک اور حد درجہ پریشانی کے باوجود شوہر پرستی ترک نہیں کرتی اور ہمیشہ اپنی وفاداری کا ثبوت دیتی رہتی ہے۔ آغاحشر کو اپنا یہ ڈراما بے حد پسند تھا اور وہ اسے اپنا شاہ کار کہا کرتے تھے۔ اس کا زبان اور بیانیہ ادبی شان لیے ہوے ہے اور مکالموں کا فکری پہلو اس فن میں آغا صاحب کی مہارت اور مشاقی کی بہترین مثال ہے۔ اس ڈرامے کا نام 'ترکی حور' کیوں رکھا گیا ہے، قاری یا ناظر کو اس کا جواب پورا ڈراما دیکھنے کے بعد بھی نہیں ملتا۔ بعض محققین نے اس سلسلے میں رستم جی سیٹھ کی ضد کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے یہ بات ہی درست ہو۔ کیونکہ خود آغاحشر کا ایسا کرنا ان کے مزاج کے منافی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے پس پشت بھی وہی بات رہی ہو کہ اس عہد کے شائقین' غیر ملکی چیزوں کو اسٹیج پر دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے اور یہ بات بھی ڈرامے کی کامیابی میں کہیں نہ کہیں معاون ہوا کرتی تھی۔ شاید ترکی حور ہندوستانی عورت کے مقابلے میں ان کے لیے زیادہ باعث کشش ہو۔ شاید رستم جی کی ضد میں بھی یہی پہلو شامل رہا ہو اور حالات کے تحت آغاحشر ان کی بات مان لینے پر مجبور ہوگئے ہوں۔

اس ڈرامے کے چار مسودے اور تین مطبوعہ نسخے آغا صاحب کے ذخیرے سے برآمد ہوئے۔ یہ نسخے اردو مرکز، لاہور سے (مقدمہ عشرت رحمانی) 1954 میں، آئینہ ادب، لاہور سے 1982 میں اور رتن اینڈ کو، دہلی سے شائع ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مسودات آغا حشر کے انتقال کے بعد ثانوی ذرائع سے حاصل کیے گئے ہوں گے۔

دستیاب چار مسودوں میں سے پہلا مسودہ مجلد کاپی کی شکل میں ہے۔ اس کے آخر میں تاریخ تحریر 9 دسمبر 1932 درج ہے۔ لیکن کاتب کا نام موجود نہیں۔ مشمولہ ڈراما اسی مسودے پر مبنی ہے۔ دوسرا مسودہ 300 صفحات کی ایک کاپی میں منقول ہے۔ اسے 1962 میں راجا ماسٹر نے نقل کیا ہے۔ اس کی حالت اچھی ہے لیکن ظاہر ہے یہ آغا حشر کے انتقال کے بعد کا نسخہ ہے۔ تیسرا مسودہ نامکمل ہے۔ یہ کاپی کے کل 26 صفحات پر لکھا ہوا ہے۔ اس میں پہلے باب کے صرف چار سین ہیں۔ چوتھا مسودہ محمد صدیق عرف ججن کا لکھا ہوا ہے، جو 124 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں کلکتہ، مورخہ 9 جون 1951 لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نسخہ بھی کافی بعد کا ہے۔

کردار

مرد

عارف	ایک فضول خرچ رئیس زادہ
فرید بیگ	معزز رئیس۔ عارف کا خسر
انور	فرید بیگ کا بیٹا۔ ترکی فوج کا کپتان
ایاز	عارف کا وفادار ملازم
غانم	ایک آوارہ نوجوان۔ عارف کا دوست
زیاد	ایک عیاش رئیس۔ ترکی سلطنت کا ماتحت جاگیردار
طارق/نعمان	زیاد کے مصاحب
التمش/جلال	انور کے فوجی دوست
ناظم	ایک دولت مند عیاش

پولیس افسر۔ جیل کا جمعدار۔ قیدی۔ ہوٹل مالک، خانساماں اور دیگر ملازم

خواتین

رشیدہ	عارف کی وفادار بیوی۔ فرید بیگ کی لڑکی
لیلیٰ	باعصمت گل فروش
شمیم	طوائف
نسیم	شمیم کی ماں

رشیدہ کی سہیلیاں اور کنیزیں وغیرہ

پہلا ایکٹ - پہلا سین

دیوان خانہ

(رشیدہ غور سے کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس کی دو ہم جولیاں پاس بیٹھی ہوئی اخبار دیکھ رہی ہیں)

رشیدہ : کتاب ہی تنہائی کے وقت مرد کے لیے سب سے اچھا دوست اور کتاب ہی عورت کے لیے سب سے اچھی سہیلی ہے۔ کتاب ماں کی طرح دل و دماغ میں عمدہ خیالات کی پرورش کرتی ہے۔ استاد کی طرح نیکی و اخلاق کی تعلیم دیتی ہے۔ جہاں‌دیدہ سیاح کی طرح انسان کے ماضی و حال کا افسانہ کہتی ہے۔ رہنما ستارے کی طرح دنیا کے پیچ دار اور تاریک راستوں میں روشنی بن کر زندگی کے آگے آگے چلتی ہے۔ ؎

جلوے ہیں علم و عقل کے یوں حرف حرف میں
جیسے کرن چمکتی ہے شفاف برف میں
ذرے میں کائنات ہے، دریا حباب میں
دنیا بسی ہے چند ورق کی کتاب میں

(دوبارہ کتاب کے مطالعے میں مصروف ہوجاتی ہے)

سہیلی ۱ : بہن رشیدہ۔ ہم تم سے بات کرنے آئے اور تم کاغذ میں چھپے حرفوں سے باتیں کر رہی ہو۔

سہیلی ۲ : سیاہی کو سوختہ جذب کرتا ہے اور تمھاری نظروں کو ان حرفوں کی سیاہی نے جذب کرلیا ہے۔

سہیلی ۱: بڑے شوق و غور سے دیکھ رہی ہو۔ کون سی کتاب ہے؟

رشیدہ : ایک نو تصنیف اخلاقی ناٹک۔

سہیلی ۲: اے ہے بہن۔ پھینکو بھی۔ تم ناٹک پڑھتی ہو؟

رشیدہ : تو کیا ناٹک کا مطالعہ گناہ میں داخل ہے؟

سہیلی ۲: بے شک۔

رشیدہ : باجی۔ اگر وہمی اور بزدل بنانے والی دیو پری کی کہانیاں، گندی غزلوں کے دیوان اور حیاسوز ناول پڑھنا گناہ نہیں ہے تو کسی اچھے شاعر کا سبق آموز ناٹک پڑھنا کیوں گناہ ہے؟

سہیلی ۲: گناہ نہ ہوتا تو لوگ ناٹک دیکھنا کیوں بُرا سمجھتے؟

رشیدہ : یہ اعتقاد کا زمانہ نہیں ہے، عقل اور تجربے کا زمانہ ہے۔ اس نئے زمانے میں جب کہ دنیا آندھی کی طرح پرانے خیالات کو اڑاتی ہوئی آگے بڑھی جارہی ہے، ناٹک کو برا سمجھنا سمجھ کی غلطی ہے۔

سہیلی ۲: کیا۔ غلطی؟

رشیدہ : ہاں، جن ناٹکوں میں غلط زبان، مہمل شاعری، سطحی خیالات اور اخلاق و مذاق بگاڑنے والی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، وہ بے شک توجہ اور قدر دانی کے حق دار نہیں ہیں۔ لیکن بہترین ناٹکوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا علم اور عقل کا گلا گھونٹنا ہے۔

سہیلی ۲: موے ناٹک بدتر ہوں یا بہتر، مگر یہ تو کہو کہ ان سے فائدہ کیا ہے؟

رشیدہ : ناٹک بھی سوئے ہوؤں کو جگانے اور گرے ہوؤں کو اٹھانے کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ جو ترقی کا جوش اور اصلاح کا جذبہ سینکڑوں وعظ اور ہزاروں لکچر سن کر برسوں میں پیدا نہیں ہوتا، وہی جوش و جذبہ انسان کے اندر، بہتر ناٹک صرف ایک رات میں پیدا کردیتا ہے۔

سہیلی ۲: تم نے تو میرا خیال ہی بدل دیا۔ ناٹک اور خوبیاں، میں تو انھیں برائیوں کا پوٹ سمجھتی تھی۔

سہیلی ۱: تم جو ناٹک پڑھ رہی ہو، اس کا نام کیا ہے؟

رشیدہ : "ترکی حور"۔
سہیلی ۲ : مصنف کون ہے؟
رشیدہ : آغا حشر کاشمیری۔
سہیلی ۲ : یہ تو مشہور شاعر ہے۔ میں نے اخباروں اور رسالوں میں اس کی نظمیں پڑھی ہیں۔
سہیلی ۱ : اس ناٹک میں کیا دکھایا گیا ہے؟
رشیدہ : شراب خوری اور فضول خرچی کا نتیجہ۔
سہیلی ۲ : یعنی؟
رشیدہ : بہن ہمارا ملک جو سادہ کھانا، سادہ پہننا اور سادے طور پر زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے، آج نمود و نمائش کا بندہ، فیشن کا غلام اور شراب کے نجس پیپوں کی مکھی بن رہا ہے۔ امیر تو امیر، غریب مزدور تک اپنی دن بھر کی کمائی کا ایک حصہ چائے اور سگریٹ پر اور دو حصے شام کے وقت شراب کی دوکان پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ فضول خرچی اور شراب خوری کی لہروں میں تندرستی، دولت، عزت سب کچھ تنکے کی طرح بہی جارہی ہے۔ ان برائیوں کا بیان۔ یہی اس ناٹک کا مضمون اور ان برائیوں کی اصلاح کی طرف ملک کو توجہ دلانا، یہی اس ناٹک کا مقصد ہے۔
سہیلی ۱ : (دوسری سے) آپا دولھا بھائی آفس سے آگئے ہوں گے۔ اب گھر جانے کی اجازت لو۔
رشیدہ : اے بیٹھو۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟
سہیلی ۲ : نہیں بہن وہ میرا راستہ دیکھ رہے ہوں گے۔ مگر دیکھو تم نے پرسوں آنے کا وعدہ کیا ہے۔ وعدہ بھولیں تو پانچ سیر مٹھائی جرمانہ کردوں گی۔
رشیدہ : اور جو میں نے جرمانہ نہ دیا؟
سہیلی ۲ : تو مجھے وصول کرنے کا طریقہ معلوم ہے۔ مٹھائی کے جتنے روپے ہوتے ہیں اتنے ہی روپے پر تمھیں تمھارے میاں کے ہاتھ بیچ ڈالوں گی۔
رشیدہ : بڑی مہربانی۔

(رشیدہ دونوں کو دروازے تک پہنچانے جاتی ہے اور اندر سے
عارف اور غانم آتے ہیں)

عارف : بے شک تم بھروسے اور دوستی کے لائق ہو اور اسی لیے میں تمھیں اپنا سچا خیر خواہ اور سچا دوست سمجھتا ہوں۔

غانم : آپ کی قدر دانی ہے جو مجھے اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے ہیں۔ ورنہ میرے خاص خاص مہربانوں نے تو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ جس کا میں دوست بنوں اُسے دنیا میں دشمن ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عارف : میں حیران ہوں کہ دنیا تم جیسے شریف آدمی کو کیوں بُرا سمجھتی ہے۔ یہی نا کہ تم غریب ہو، شرابی ہو۔ لیکن غریبی کوئی جرم نہیں ہے۔ اپنا کمایا ہوا خرچ کرنا چوری نہیں ہے۔ اور جیسا کہ تم نے مجھ سے کہا، اگر ڈاکٹر کے مشورے سے صرف تندرستی قائم رکھنے کے لیے بطور دوا کے شراب پیتے ہو تو یہ مجبوری کا پینا بدچلنی نہیں ہے۔

غانم : جناب مجھے خود تعجب ہے کہ دنیا میرے ساتھ اتنی ناانصافی کیوں کر رہی ہے۔ صورت دیکھتے ہی اکثر منھ پھٹ تڑ سے بدمعاش کہہ دیتے ہیں۔ گویا میرا چہرہ بدمعاشی کی دوکان کا سائن بورڈ ہے۔ جس پر موٹے حرفوں میں پاجی لکھا ہوا ہے۔

عارف : اچھا کہو۔ کل کا کیا پروگرام ہے؟

غانم : دنیا میں ایک امیروں کا پروگرام ہوتا ہے اور ایک غریبوں کا۔ جو پسند ہو وہی پروگرام تیار کروں۔

عارف : غریبوں کا کیا پروگرام ہوتا ہے؟

غانم : صبح چھ بجے اٹھنا۔ دن بھر محنت کرنا۔ شام کو گھر آکر بیوی بچوں سے ہنسنا کھیلنا اور دس بجے رات سے پہلے کھا پی کر مردوں سے شرط باندھ کر سو جانا۔ یہ غریبوں کا پروگرام ہے۔

عارف : اور امیروں کا پروگرام؟

غانم : گیارہ بجے سو کر اٹھنا۔ بارہ بجے ناشتہ کرنا۔ اِدھر اُدھر کی زٹل بازی کے بعد پونے تین بجے کھانا کھانا۔ تین سے سات بجے شام تک بھر خرانٹے لینا اور ساری رات تھیٹر، جلسے، ہاہو میں کاٹ کر سورج کے جاگنے کے وقت ٹانگیں لبی کرکے پلنگ پر انٹا چت ہوجانا، یہ امیروں کا پروگرام ہے۔

عارف : پروگرام سے میرا یہ مطلب ہے کہ کل تھیٹر میں نیا تماشا بھی ہے اور زیاد پاشا کے یہاں دعوت بھی ہے۔ ایک جگہ آنکھوں کو خوراک ملے گی اور دوسری جگہ پیٹ کو، کہاں کا ارادہ ہے؟

غانم : ہینڈل کا چکر گھما کر جس طرف ڈرائیور پھک پھک اور پم پم کرتی ہوئی موٹر کا رخ پھیر دے گا، اُسی طرف چل پڑیں گے۔

عارف : تو میں کل شام کو سات سے آٹھ تک تمھارا منتظر رہوں گا۔

غانم : آداب۔

عارف : بھولنا نہیں۔

غانم : اطمینان رکھیے۔ جیسے وکیل مقدمے کی فیس لینا اور رنڈی بے وفائی کرنا نہیں بھولتی ویسے ہی میں بھی اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔

(غانم کا جانا)

عارف : کیا دل چسپ آدمی ہے۔ آج کا غم اور کل کی فکر دونوں کو پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ اس کا قول ہے کہ زندگی شراب کا پیالہ ہے۔ اُسے منھ بنا بنا کر نہیں مزے لے لے کر ختم کرنا چاہیے۔

(رشیدہ واپس آتی ہے)

رشیدہ : (سائڈ میں) یہ محبت کا قیدی کہاں بھاگا جارہا ہے؟

(پیچھے سے عارف کی آنکھیں بند کرلیتی ہے)

عارف : (آنکھوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوے) ارے دن کو ڈاکہ کیسا؟ یہ کون؟

رشیدہ : (سامنے آکر) نہیں پہچانتے؟ میں گھر کی کوتوال۔

عارف : تو یہ مجھے تو چور کا دھوکہ ہوا تھا۔

رشیدہ : صدقے اس سمجھ کے۔ کوتوال کو چور سمجھ لیا۔

عارف : ہاں میں سمجھا کہ کوئی چور میری آنکھیں بند کرکے سینے کے پاکٹ سے دل کی نقدی نکال رہا ہے۔

رشیدہ : مگر آپ کے پاس دل ہے کہاں؟ جو چوری ہوگا۔ دل تو پہلے ہی آپ ایک شریف کی لڑکی کو نذر کر چکے ہیں۔

عارف : وہ کون؟ اس کا نام؟

رشیدہ : شادی سے پہلے اس کا نام تھا رشیدہ اور اب اس کا نام ہے جورو۔

عارف : یعنی تم؟

رشیدہ : واہ۔ میں کیوں۔ میرا نام کیا جورو ہے؟ میرا نام تو بیوی ہے۔

عارف : لیکن تم تو ابھی اپنے کو گھر کا کوتوال کہتی تھیں۔

رشیدہ : کہتی تھی نہیں۔ کہتی ہوں، بولو، کوتوال کا کیا کام ہے؟

عارف : انتظام اور حفاظت۔

رشیدہ : ٹھیک ہے۔ تم جواب میں فیل ہونے کے بدلے پاس ہوگئے۔ اب سنیے شریف بیویاں بھی شوہر کے گھر کا انتظام اور شوہر کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہیں۔ اسی لیے انھیں گھر کا کوتوال کہتے ہیں۔ سمجھے یا کوتوال کی طرح ڈانٹ کر سمجھاؤں؟

عارف : تم پیار کرنے والی بیوی ہی نہیں، میرے گھر کی روشنی اور میرے دل کے دنیا کی ملکہ ہو۔

رشیدہ : میرے مالک میں صرف تمھاری لونڈی ہوں۔

(گانا)

رشیدہ : بلم میں تو پریم کی بھئی پیاسی۔
تمھاری میں ہوں داسی۔
نین کے سیں سے ہر لیو سیّاں۔ مورے گرے ڈارے بہیاں۔

عارف : من ہر ناری۔ بھولی ناری۔
رشیدہ : ہر لیت مورے تن من دکھ شوک روگ اُداسی۔
عارف : میں ہوں تیرا دیوانہ۔
رشیدہ : بس رہنے دو پھسلانا.... بلم میں تو....

(دونوں کا جانا)

پہلا ایکٹ - دوسرا سین

جشن گاہ

(زیاد پاشا صوفے پر لیٹا ہے۔ ایک نازنین پیچھے کھڑی پنکھا جھل رہی ہے اور دوسری پیروں کے پاس بیٹھ کر شراب کا گلاس پیش کر رہی ہے۔ مصاحبین، احباب اور حبشی غلام حاضر ہیں۔ سامنے خوبصورت لڑکیوں کا غول ناچ رہا ہے۔

ناظم : ۔

ہماری رات بھی دن ہے پری جمالوں سے
کھلی ہے چاندنی محفل میں گورے گالوں سے
پڑا ہے عکس جو اُن کے گلابی گالوں کا
شفق کے حُسن پہ ہنستا ہے رنگ پیالوں کا

زیاد پاشا : مضمون بھی خوبصورت اور لفظ بھی خوبصورت۔ دو شعر مجھے بھی یاد آئے۔

مصاحب : ارشاد۔

زیاد : ۔

ازل سے چاند کی کرنوں نے جن کو سینچا ہے
انھیں ستاروں کے پھولوں کا عطر کھینچا ہے
عجیب چیز برائے سرور پیتے ہیں
ہم آج گھول کے سوڈے میں نور پیتے ہیں

طارق : اے سبحان اللہ۔ روح تازہ ہو گئی۔

ناظم : بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ شاعر نے ستاروں کی دنیا کا تمام حسن لوٹ کر اپنے دو شعروں کو دے دیا ہے۔

غلام : (آکر) عارف آفندی تشریف لائے ہیں۔

زیاد : خوش آمدید کہو۔

(غلام واپس جاتا ہے)

ناظم : و اللہ۔ جب سے آپ کی دوستی کا فخر حاصل ہوا ہے، تب سے زندگی بڑی ہی پر لطف ہوگئی ہے۔

زیاد : اس شہر کی دل چسپی اور دوستوں کی محبت ہی ہے جو میرے قلعے اور ریاست سے بار بار مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے۔

(عارف اور غانم آتے ہیں)

عارف : نیاز مند کی تسلیم قبول ہو۔

غانم : خادم بھی آداب کی نذر پیش کرتا ہے۔

زیاد : اخاہ۔ عارف کے ساتھ غانم بھی۔

غانم : جناب میں ان سے کس طرح الگ رہ سکتا ہوں۔ جہاں آقا ہوگا وہاں خادم بھی ہوگا۔ کیونکہ یہ مارچ کا مہینہ ہیں تو میں گڈ فرائی ڈے ہوں۔ یہ دسمبر ہیں تو میں کرسمس ہوں، یہ نئے برس ہیں تو میں نئے برس کا کیلینڈر ہوں۔

مصاحب : غانم کا منھ مذاق کا فوارہ ہے۔ جس سے ہر وقت دل لگی کے لفظوں کی پھوار پڑتی رہتی ہے۔

زیاد : بڑا ہی زندہ دل آدمی ہے۔ (عارف سے) مگر عارف چاند کے اوپر سے گذرتے ہوے بادل کے ٹکڑے کی طرح اس وقت آپ کے چہرے پر اداسی کا تاریک سایہ کیوں دکھائی دیتا ہے۔ خیریت تو ہے؟

عارف : کیا کہوں۔ میرے پچھلے قرضوں میں صرف پانچ ہزار کا قرض باقی رہ گیا تھا جس کی بے باقی کے لیے میرے سسر نے آج ہزار ہزار کے پانچ قطعہ

نوٹ دیے تھے۔ قرض خواہ کے آفس میں پہنچ کر دیکھا تو ایک دم چونک پڑا۔ جیب موجود اور نوٹ غائب۔

زیاد : کیا ہوئے؟

عارف : نہ جانے کیسے گئے اور کہاں گئے؟

غانم : (سائڈ میں) قرض خواہ کی تجوری میں پہنچنے کے بدلے غانم کی پاکٹ میں پہنچ گئے۔

زیاد : ساتھ کون تھا؟

عارف : میرا دوست غانم۔

غانم : بے چارہ غانم کیا کرتا۔ اس شہر میں تو ایسے ایسے پاکٹ مار رہتے ہیں، جو پاکٹ سے نوٹ کیا، کتے کی دم سے ٹیڑھاپن اور سیانی رنڈی کے دل سے چھل کپٹ نکال لیں۔

عارف : آپ نے سنا ہوگا کہ میرے مرحوم والد مکانات اور زمین کے علاوہ آٹھ لاکھ نقد چھوڑ کر مرے تھے، جس کو میں نے چند ہی برسوں کے اندر بری صحبتوں اور فضول خرچیوں میں آتش بازی کے انار کی طرح پھونک کر ختم کر دیا۔ چونکہ میرے سسر کو ابھی تک میرے نیک چلن ہو جانے کا پورا اطمینان نہیں ہے اس لیے انھیں ضرور خیال ہوگا کہ یہ نوٹ بھی پہلی جیسی حرکتوں میں غارت ہوئے ہیں۔ بس یہی ایک فکر ہے، اور یہی فکر چہرے کی اداسی کا باعث ہے۔

غانم : میرے دوست۔ دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ نہ سخی کے پاس رہتی ہے نہ کنجوس کے۔ فرق یہ ہے کہ سخی کی دولت اس کی زندگی ہی میں اس کے ہاتھ سے کھانے کھلانے میں خرچ ہوتی ہے اور کنجوس کی دولت اس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکوں کے ہاتھوں رنڈی بازی یا مقدمہ بازی میں تباہ ہوتی ہے۔ اس لیے جانے والی دولت چلی گئی تو اب رنج سے کیا فائدہ۔ جس نے نوٹ لیے خدا اُس کا بھلا کرے۔

عارف : دولت کے رہتے ہوئے چاہے دولت کی قدر نہ ہو مگر ضائع ہوجانے کے بعد

دولت کو سنبھال کر نہ رکھنے کا رنج ضرور ہوتا ہے۔

غانم : لیکن رنج کے مرض کا صبر کے سوا علاج کیا ہے (پاشا سے) میں تو یہی دوا جانتا ہوں۔ (بوتل سے گلاس میں شراب انڈیلنے کا اشارہ کر کے) کیا آپ کے پاس اس بیماری کی کوئی اور دوا ہے؟

زیاد : نہایت مفید اور نہایت لذیذ (مصاحب سے) طارق گلاس میں رنج کی دوا کا ایک ڈوز انڈیلو۔

طارق : (شراب کا گلاس پیش کرکے) لیجیے نوش کیجیے۔ یہ رنج اور فکر بھلانے کی پیٹنٹ دوا ہے۔ ؎

حلق سے اُتری کہ بس آرام پایا جان نے
یہ دوا ایجاد کی ہے ڈاکٹر لقمان نے

عارف : معاف کیجیے۔

ناظم : کیوں؟ یہ تو مردے کو زندہ کرنے والا آب حیات ہے۔

عارف : لیکن میں اسے ساری بیماریوں کا ست اور تمام خوفناک زہروں کا نچوڑ سمجھتا ہوں۔

ناظم : اجی اس کی رنگت تو دیکھیے۔

عارف : یہ رنگت نہیں، شیطان کے چہرے کی چمک ہے۔

ناظم : اس کی خوشبو تو سونگھیے۔

عارف : یہ خوشبو نہیں۔ گناہ کے پرنالے کی بدبو ہے۔

ناظم : اس کی لذت تو چکھیے۔

عارف : یہ لذت نہیں، موت کے پیالے کی کڑواہٹ ہے۔

زیاد : آخر انکار کی وجہ؟

عارف : گلاس منھ سے لگانے کے بعد انسان انسان نہیں رہتا۔ ایک عالم کا قول ہے کہ پیٹ میں شراب پہنچتے ہی عقل انسان کے دماغ سے نکل کر باہر کھڑی ہوجاتی ہے۔ کیا آپ کی یہ خواہش ہے کہ میں آدمی سے جانور بن کر بندر

کی طرح اچھل کود کرنے لگوں؟

زیاد : شراب غمگین روح اور ست پڑ گئے ہوئے دل کے لیے ایسی ہی ہے، جیسے بجھتے ہوئے چراغ کے لیے تیل یا بند ہو گئی ہوئی گھڑی کے لیے چابی۔ دنیا میں ایسی کون دوا ہے جو دو منٹ کے اندر دل میں جوش، خون میں گرمی، بدن میں پھرتی، آنکھوں میں سرور، ہونٹوں پر ہنسی اور جھریاں پڑے ہوئے چہرے پر جوانی کی رونق پیدا کردے۔ مجھے شراب میں خوبیوں کے سوا کوئی نقصان دکھائی نہیں دیتا۔

عارف : شراب کے نقصان اول پولیس کے سپاہیوں سے پوچھیے جو ہر روز سڑک پر پڑے ہوئے شرابیوں کو لے جا کر حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔ شراب کے نقصان ان غریب عورتوں سے پوچھیے جن کے شرابی شوہر آدھی رات کو جھومتے ہوئے گھر میں آکر بیوی بچوں کے ساتھ لاتوں اور گالیوں سے اپنی محبت ظاہر کرتے ہیں۔ شراب کے نقصان ان بدنصیبوں سے پوچھیے جو پھیپھڑا، معدہ، دل، دماغ، جسم کی مشین کا ایک ایک پرزہ خراب کرنے کے بعد رعشہ، گٹھیا، فالج میں گرفتار ہو کر کسی اسپتال میں یا عقل و ہوش کھو کر کسی پاگل خانے میں یا نشے کی حالت میں خون اور جرم کرکے کسی جیل میں زندگی کے باقی دن سسک سسک کر پورے کر رہے ہیں۔

شراب راحت نہیں ہے غم ہے، شراب امرت نہیں ہے سم ہے
شراب دروازہ موت کا ہے، شراب سیدھی رہِ عدم ہے
نہ زر، نہ طاقت، نہ تندرستی، کسی طرح سانس چل رہی ہے
شراب غٹ غٹ جو تھے نگلتے، شراب انھیں اب نگل رہی ہے

غانم : آپ شراب پینے والوں کا قصور بیچاری شراب کے سر تھوپ رہے ہیں۔ جس طرح شراب خریدنے کے لیے روپے کی ضرورت ہے ویسے ہی شراب پینے کے لیے تمیز کی ضرورت ہے۔ اناج سے زندگی ہے لیکن پاؤ بھر کی بھوک میں ڈیڑھ سیر ڈکار جاؤ تو یقیناً ہیضے کی بیماری ہوجائے گی۔ پانی بدن کا جزو ہے

لیکن گلاس دو گلاس کے بدلے پورا گھڑا غٹ غٹا جاؤ تو ضرور پیٹ پھول کر کُپا ہوجائے گا۔ شراب پینے کا پروگرام یہ ہے کہ دوا سمجھ کر پیو، کبھی کبھی پیو اور حد کے اندر پیو۔ اور ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ پینے کا مزا چاہتے ہو تو کسی معشوق کے ساتھ پیو۔

عارف : دنیا میں سب ممکن ہے لیکن شرابی ایک گلاس کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا گلاس نہ مانگے یہی بات ناممکن ہے۔

بھول جاتا ہے نتیجہ چل گئے جب دور دو
بس یہی رٹتا ہے پھر وہ، اور دو ہاں اور دو

غانم : بڑھاپے سے سٹھیایا ہوا ایشیا یورپ سے بڑھ کر عقل مند نہیں ہے۔ اگر شراب میں نقصان، یا شراب کا حد کے اندر پینا ناممکن ہوتا تو آج یورپ میں پانی سستا اور شراب مہنگی نہ ہوتی۔

عارف : شراب سے یورپ کی اخلاقی و جسمانی صحت کس طرح خراب ہورہی ہے، جرم اور موت کی تعداد کس رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ وہسکی اور بیئر کے ریلوں سے سوسائٹی کی بنیادیں کیوں کر کٹ کٹ کر گر رہی ہیں۔ اگر یہ جاننا ہے تو یورپ کے اخباروں کے آرٹیکل، پولیس کی رپورٹ، ججوں کے فیصلے، ڈاکٹروں کے بیان، ٹیمپرنس سوسائٹیوں کے لکچر پڑھو۔ تب تمھیں معلوم ہوگا کہ اب وہاں کے لوگ بھی چیخ چیخ کر شراب کو دنیا کی مصیبت اور سوسائٹی کی لعنت کہہ رہے ہیں۔

شرابی کا ٹھکانہ ہے نہ گوروں میں نہ کالوں میں
نہ جانے پائے مسجد میں، نہ گرجوں اور شوالوں میں
پھرا کرتا ہے پاگل کی طرح واہی خیالوں میں
کبھی گرتا ہے سڑکوں پر، کبھی سڑتا ہے نالوں میں
بھلا غیروں کا کیا شکوہ اگر توہین کرتے ہیں
کہ اُس کے باپ بھائی تک اسے نفرین کرتے ہیں

غانم : (طارق سے) بڑی دون کی لے رہا ہے۔ آج اسے شراب سے ضرور چشمہ دینا چاہیے۔

طارق : اس کی ترکیب؟

غانم : نارنگی کے عرق میں وہسکی ملا کر شربت کے نام سے پلا دو۔

طارق : زندہ باش، اچھی سُجھائی۔ (عارف سے) جناب رندوں کی محفل میں گلاس تو ہاتھ میں لینا ہی ہوگا۔ شراب نہیں تو شربت ہی سے شوق کیجیے۔

عارف : آپ ہر شخص کے ہاتھ میں ایک گلاس دیکھنا چاہتے ہیں۔ خواہ شراب کا ہو خواہ شربت کا۔ بہتر ہے۔ لائیے۔

(غانم چپکے سے نارنگی کے عرق میں وہسکی ملا کر طارق کو دیتا ہے اور طارق عارف کو دیتا ہے)

طارق : شوق کیجیے۔ مگر دیکھیے۔ شرابیوں کے قانون کے مطابق، پورا گلاس ایک سانس میں ختم ہونا چاہیے۔ (زیاد سے) خداوند آپ بھی گلاس کی پری کو اپنے ہونٹوں کا بوسہ لینے دیجیے۔

(عارف شربت کے دھوکے میں سب کے ساتھ گلاس پی کر خالی کر دیتا ہے)

غانم : (سائڈ میں) وہ بارود میں چنگاری پڑی۔ بس قلعہ فتح۔ اب اس کے پیسے ہیں اور میرے مزے۔

عارف : عجیب طرح کا مزہ تھا۔ یہ کیا۔ سینے میں گرمی کیوں معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے مجھے کیا پلا دیا؟

ناظم : پینے کے بعد دوا کا نام پوچھنے سے فائدہ۔ اور پوچھنا ہی ہے تو آنکھوں میں سرور آنے کے بعد پوچھیے گا۔

عارف : تو کیا یہ شراب تھی؟

ناظم : اور آپ کیا سمجھے کہ نارنگی کا شربت تھا۔

عارف : اُف۔ غضب کیا۔ تم نے میری گرستی کے سکھ کا خاتمہ کر دیا۔ آرام اور آبرو کا

گلا گھونٹ دیا۔ تباہی اور بربادی کے لیے میرے مکان کا دروازہ کھول دیا۔ تم نے شراب پلا کر آج میرے آرام و خوشی کے انبار میں چھوٹی سی چنگاری ڈال دی ہے۔ جو آج چنگاری ہے، کل انگارہ ہوگی، پرسوں شعلہ بنے گی۔ اور ترسوں دہک دہک کرتی ہوئی آگ کی شکل اختیار کر لے گی۔ اور اس آگ میں میرا سب کچھ جل جائے گا۔ خوشی بھی، عزت بھی، زندگی بھی۔

قائم : بھائی جان، جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ پرانی زندگی کا بائکاٹ کر کے آج سے نئی زندگی شروع کیجیے (طارق سے) یار منہ کیا دیکھتے ہو۔ انڈیلو نہ۔ اتنے برسوں کی پیاس کیا ایک ہی گلاس میں بجھ جائے گی۔

عارف : بس اور نہیں۔

زیاد : توبہ ٹوٹنے کے بعد بھی انکار۔

عارف : مجھے نشہ ہو چلا۔

زیاد : تھوڑی۔ وہ بھی میری خاطر سے۔ (ناچنے والیوں سے)

عاشق ہے آج ایک زمانہ شراب کا
ہاں مل کے گاؤ کوئی ترانہ شراب کا

(گانا شروع ہوتا ہے۔ زیاد پاشا کے اشارے سے ناچنے والیاں عارف کو جھرمٹ میں لے کر شراب پلاتی ہیں۔)

پہلا ایکٹ - تیسرا سین

رشیدہ کے باپ کا مکان

(رشیدہ پریشان اور اُداس صورت کے ساتھ سر جھکائے ہوئے آتی ہے)

رشیدہ : تمام شب کا جاگا ہوا چاند ستاروں کی روشنی گل کرکے سوگیا۔ رات کی سیاہ چادر میرے آنسوؤں سے دھل کر سفید ہو گئی۔ روشن دن مشرق کی کھڑکی کھول کر جھانکنے لگا۔ لیکن وہ جن کا انتظار کرتے کرتے ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی، ابھی تک نہ آئے۔ ؎

دیکھیے کب دیکھتے ہیں مڑکے وہ گھر کی طرف
کان آہٹ پر لگے ہیں اور نظر در کی طرف

(بوڑھا ایاز آتا ہے)

ایاز : بیٹی رشیدہ۔ انتظار میں شام سے صبح ہوگئی۔ جاؤ ذرا آرام کر لو۔ کب تک جاگو گی اور کب تک پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے رہو گی۔

رشیدہ : جب ایک وفادار کتا بھی، گھر سے باہر گئے ہوئے مالک کے واپس آنے تک، اس کے انتظار میں دروازے پر بیٹھا رہتا ہے تو میں ان کی بیوی اور لونڈی ہوکر کس طرح اپنے آرام کی پروا کرسکتی ہوں۔ آہ ایاز۔ مجھے دو دن سے ڈراونے خواب اور بدشگونیاں نظر آرہی ہیں۔ گھر، دولت، سکھ، سب کچھ تباہ ہوچکا۔ کہو کہو اب اور کون سی تباہی ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے والی ہے۔ ؎

آسماں کی گردشیں ہیں کس نئی تدبیر میں
اور کیا لکھا ہے اس پھوٹی ہوئی تقدیر میں

ایاز : کل شام کو گھر سے کس کے ساتھ گئے تھے؟

رشیدہ : غانم کے ساتھ۔

ایاز : کیا کروں۔ غانم تمھارا دور کا رشتہ دار ہے۔ ورنہ میں اس بے اصول یار مار آدمی کو کبھی اس گھر کے دروازے کے اندر قدم نہ رکھنے دیتا۔

رشیدہ : لیکن وہ اسے رشتہ دار ہی نہیں، اپنا سب سے بڑا خیر خواہ دوست بھی سمجھتے ہیں۔

ایاز : لیکن یہ دوست ہی ان کا سب سے بڑا دشمن ہوگا۔ وہ میری مانیں یا نہ مانیں لیکن میں نے انھیں خبردار کر دیا ہے۔ کہ زہر اور آگ سے دوستی کرو، سانپ اور بچھو سے دوستی کرو لیکن اس غانم سے دوستی نہ کرو۔ یہ دوستی کے غلاف میں چھپی ہوئی تلوار ہے۔ آج حلک کر لے گا اور کل گلا کاٹ کر الگ ہوجائے گا۔

(رشیدہ کا بوڑھا باپ فرید بیگ غصے میں آتا ہے)

فرید : بس آج سب ختم ہو گیا۔ قسمت پر بربادی کی مہر لگ گئی۔ امید کی آخری کرن بھی تاریکی میں ڈوب گئی۔

رشیدہ : ابّا جان.....

فرید : رشیدہ۔ خدا نے تجھے خوبصورتی دی، نیکی دی، لیاقت دی، محبت دی، شوہر پرستی دی لیکن افسوس اچھی قسمت نہ دی۔ معلوم نہیں کس قصور پر ناراض ہوکر زندگی کے سکھوں نے تیری طرف سے منھ پھیر لیا۔

ایاز : خیر تو ہے؟

رشیدہ : پیارے ابا کیا ہوا؟

فرید : کیا کہوں۔ ڈر ہے کہ تو سنتے ہی پاگل ہو جائے گی۔ میں دیوان خانے کی کھڑکی سے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی رئیس کی شاندار

گاڑی، جس میں سُرنگ جوڑی جُتی ہوئی تھی، دروازے پر آکر ٹھہری۔ پٹ کھلا اور اندر سے پائدان پر پاؤں رکھ کر پہلے غانم اُترا اور پھر اس نے ہاتھ پکڑ کر عارف کو اُتارا۔

رشیدہ : تو وہ آگئے؟

فرید : ہاں۔ دروازہ کھلنے پر غانم کچھ کہہ کر سڑک کی طرف مڑا اور عارف کے بار بار بلانے پر بھی ہاتھ سے نہیں نہیں کا اشارہ کرتا ہوا چلا گیا۔

ایاز : اور عارف؟

فرید : وہ دروازے سے پیٹھ لگائے ہوئے ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔ مگر جانتے ہو کس حالت میں؟ عقل سے خارج۔ ٹانگوں پر کھڑے ہونے سے مجبور۔ شراب کے نشے میں بالکل چور۔

رشیدہ : کیا نشے میں؟

ایاز : شراب پی لی۔

رشیدہ : آہ میں برباد ہوگئی۔

(صدمے سے صوفے پر گر پڑتی ہے)

فرید : جس گھر میں شراب آئی۔ وہاں بربادی ضرور آئے گی۔

ایاز : بدذات غانم۔ یہ تیری دوستی کے درخت کا پہلا کڑوا پھل ہے (رشیدہ سے) اٹھو میری بچی اٹھو۔ قسمت کا فیصلہ سب کو منظور کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کسی عدالت میں اس کے حکم کی اپیل نہیں ہوسکتی۔

رشیدہ : بگڑا ہوا گھر بن چلا تھا۔ آج بنتا ہوا گھر پھر بگڑ گیا۔ ؎

جو میرا ناخدا تھا خود بہا جاتا ہے دھارے پر
الٰہی کس طرح پہنچے گی اب کشتی کنارے پر

(لڑکھڑاتا ہوا عارف آتا ہے)

عارف : غانم بھی کیسا ڈرپوک ہے۔ گھر والوں کی ناراضی کے خوف سے دروازے ہی

پر سے لوٹ گیا۔

فرید : افسوس۔ ان آنکھوں کو یہ بھی دیکھنا تھا۔

عارف : کوئی چیز صاف نہیں دکھائی دیتی۔ دماغ گھوم رہا ہے یا زمیں کے ساتھ گھر گھوم رہا ہے۔

رشیدہ : (قریب جاکر) شام کو گئے اور صبح کو لوٹے۔ (منھ پھیر کر) اُف کیسی بدبو۔ انسان عقل رکھ کر ایسی گندی اور غلیظ چیز کیوں پیتا ہے۔ (عارف سے) کہاں تھے؟

عارف : کیا کہا؟

رشیدہ : کہاں تھے؟

عارف : نہ میں مجرم نہ تم جج اور نہ یہ گھر عدالت کا اجلاس۔ پھر کس حق سے یہ سوال کرتی ہو؟

ایاز : اُسی حق سے، جو محبت کے رشتے اور شادی کے قانون کی رو سے بیوی کو حاصل ہے۔

عارف : یعنی؟

ایاز : بیوی شوہر کا نصف۔ اُس کے قسمت کی شریک، اس کے دکھ سکھ کی ساتھی، اس کے گھر کے امن و امان کی نگہبان اور اس کے برائی بھلائی کی ذمہ دار ہے۔ جو شوہر کے واپس آنے تک تمام گھر کے سو جانے پر بھی بھوکی پیاسی انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ جو شوہر کے چہرے پر ذرا سی اداسی دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے۔ جو شوہر کے دکھ اور بیماری میں لونڈی کی طرح خدمت کرتی ہے اور پروانے کی طرح پلنگ کے گرد پھرتی رہتی ہے۔ کیا اُس بیوی کو "کہاں تھے" اتنا بھی پوچھنے کا حق نہیں ہے۔

عارف : کیا کہہ گئے۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔

رشیدہ : نہ حواس قابو میں نہ پاؤں قابو میں (عارف سے) سنبھلو۔ گر پڑو گے۔

فرید : عارف مجھے امید تھی کہ دنیا میں ٹھوکر کھانے کے بعد اب تم دیکھ کر اور سنبھل کر چلوگے۔ مگر آج معلوم ہوا کہ بربادی ہی تمھارا آخری راستہ اور آخری

انجام ہے۔ ـ

گھر میں آئے لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
شرم بھی تم کو نہ آئی سامنے آتے ہوئے
کیا رہا، ہنستا ہے تم پر بے نوا، محتاج بھی
عقل، دولت کھوچکے تھے آج کھو دی لاج بھی

عارف : بے شک میں نے دولت بھی پھونکی اور شراب بھی پی۔ لیکن نہ دولت آپ کی تھی اور نہ شراب آپ کی۔ بزرگ سمجھ کر معاف کرتا ہوں۔ آئندہ ایسے سخت لفظ نہ کہیے گا۔

فرید : تب کیا کہوں۔ کن لفظوں میں اس نالائقی اور بدچلنی پر ملامت کروں۔ بدبخت آدمی، تو نے صرف اپنی ہی نہیں، اپنے ساتھ اس غریب کی مٹی بھی برباد کر دی۔ اگر میں جانتا کہ تو ایک دن دولت، عزت، شرم، سب سے مفلس ہوجائے گا تو کبھی اس کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں نہ دیتا۔

عارف : اگر ایسا داماد چاہیے تھا جو کبھی مفلس نہ ہو تو مجھ سے شادی کرنے کے بدلے ایک سونے کا پتلا بنا کر اس کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی ہوتی۔

فرید : دیکھو ایاز دیکھو۔ یہ ہے شراب پینے کا پہلا نتیجہ۔ پینے کے ساتھ ہی آدمی کے منھ سے گندی باتوں اور گالیوں کا پرنالہ بہنے لگ جاتا ہے۔

ایاز : (عارف سے) ہوش کیجیے۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

عارف : ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے اپنی خوشی سے داماد پسند کیا ہے۔ میں ان کے دروازے پر شادی کی بھیک مانگنے نہیں آیا تھا۔

فرید : (ایاز سے) سن لیا۔ اور منع کروگے۔ شرابی تھوڑی پینے پر احمق، زیادہ پینے پر جانور اور حد سے زیادہ پینے پر پاگل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اس وقت نشے میں پاگل ہو رہا ہے۔

عارف : میں رشتے اور بزرگی کا خیال کر رہا ہوں۔ اپنی عزت کی حفاظت کیجیے اور چلے جائیے۔

فرید : چلے ہی جانا ہوگا۔ کیونکہ یہ حالت نہ دیکھ سکتا ہوں نہ برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر جانے کے پیشتر تجھ کو ہوشیار کرتا ہوں کہ زندگی کے درخت کی جڑ میں شراب کا زہر نہ ٹپکا۔ ورنہ اس سے صرف تکلیف کے کانٹے اور بربادی و موت کے پھل پیدا ہوں گے۔ اور تجھے ان کانٹوں کو اپنے دل میں جگہ دینا اور ان پھلوں کو چکھنا ہوگا۔ ؎

اسے پہچان آفت اک نئی صورت میں آئی ہے
نہ ڈال اس آگ میں ایندھن جو قسمت نے جلائی ہے
گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ اُبھرے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں

(جاتا ہے)

رشیدہ : (ایاز سے) پاؤں قبضے میں نہیں۔ انھیں سہارا دے کر کمرے میں لے چلو۔

ایاز : خدا تمھاری مصیبت پر رحم کرے۔ اور انھیں نیک ہدایت دے۔ (عارف سے) اٹھیے۔

عارف : ہٹ جاؤ۔ مجھے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ (تھوڑا بڑھ کر) کدھر ہے راستہ؟ وہ رہا۔

(عارف دو قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ اور رشیدہ اور ایاز اسے سنبھالنے کے لیے دوڑتے ہیں)

ایاز : حضور۔ حضور۔

رشیدہ : ہائے قسمت۔

ایاز : روتی ہو روؤ۔ شراب کی بدولت اپنے شوہر اور گھر کی بربادی دیکھ کر آج اس بدقسمت ملک میں ہزاروں شریف بیویاں اسی طرح آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہیں۔ ؎

کوئی چارہ نہیں آنکھوں سے بس ندیاں بہاتی ہیں
کلیجہ اور گھر جلتا ہے آنسو سے بجھاتی ہیں

رشیدہ : شراب۔ شراب۔ ارے شیطان کی بیٹی۔ گناہوں کی ماں۔ بوتل میں رہنے والی چڑیل۔ تو نے اس ملک کی کیا حالت کر دی۔ آج مسجد، گرجے، شوالے آدمیوں سے خالی اور ہوٹل اور شراب کی دکانیں آباد ہو رہی ہیں۔ دولت اور تندرستی دے کر موت خریدی جا رہی ہے۔ بیوقوف اور پاگل بننے کو زندگی کا مزہ سمجھا جا رہا ہے۔ جا۔ جا۔ جہاں سے پیپوں اور بوتلوں میں بند ہوکر ہزاروں بیماریوں اور برائیوں کو ساتھ لیے ہوئے آئی ہے۔ وہیں واپس جا۔ ۔

بے کسوں اور بے بسوں کی التجا منظور کر
یا الٰہی ملک سے تو اس بلا کو دور کر

پہلا ایکٹ - چوتھا سین

طوائف کا مکان

(شمیم کی ماں نسیمہ جھنجھلاتی ہوئی آتی ہے)

نسیمہ : ہائے ہائے۔ یہ لونڈیا تو اِن لچھنوں سے تین پشت کی جمی جمائی دوکان چوپٹ کر دے گی۔ رنڈیوں میں بدنصیب کون؟ جس کے گھر لڑکا پیدا ہو۔ اور خوش نصیب کون؟ جس کے گھر لڑکی پیدا ہو۔ لڑکا بڑا ہونے پر، یا جوتے مار مار کر ماں بہن سے روپے چھینے گا یا تماش بینوں کی چلمیں بھرے گا۔ یا بہن کے ساتھ سارنگی بجائے گا۔ اور لڑکی تو جوان ہو کر سونے کا ڈلا بن جاتی ہے۔ جس سیٹھ ساہوکار کے پاس چاہو، بیچ کر روپے کھرے کر لو۔ لیکن میری کوکھ سے گھر بناؤ کے بدلے گھر اجاڑ پیدا ہوئی ہے۔ دس کی جیبیں کاٹتی ہے اور ایک کی جیب بھرتی ہے۔ اسے نازبرداری، روپیہ، خوشامد کچھ نہیں چاہیے۔ بس دنیا میں دو چیزیں چاہئیں۔ ایک وہ مفت خور غانم اور دوسرے وہسکی کا گلاس۔ ارے جنم جلے غانم تیرا ستیاناس۔

(شمیم آتی ہے)

شمیم : کیا لغس ہے۔ چیز رکھو اور غائب (ماں سے) اماں۔ سنگار میز پر لالی اور پاؤڈر کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ کیا ہوا؟

نسیمہ : میں اٹھالے گئی تھی۔ میرے کمرے میں آئینے کے پاس رکھا ہوا ہے۔

شمیم : جوانی ڈھلی۔ جھریاں پڑیں۔ سائیکل سے چرخا بن گئیں۔ لیکن ابھی تک لالی

اور پاوڈر کا شوق نہیں گیا۔ دنیا کو دھوکا دے چکیں، اب بڑھاپے کو دھوکا دے رہی ہو۔

نسیمہ : نزلے سے دوچار بال چاندی کے تار بن گئے تو کیا میں بڑھیا بن گئی۔ اب بھی جب کسی دن بن سنور کر کھڑکی سے چلمن اٹھا کے سڑک کی طرف جھانکتی ہوں تو رستہ چلتوں کے منہ سے نکل جاتا ہے۔ ہائے مار ڈالا۔

شمیم : وہ کوئی اندھے ہوں گے جنھیں پاوڈر کے پیچھے بڑھاپے کی جھریاں دکھائی نہیں دیتیں۔ میں تو جب تمھیں کھڑکی میں دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ پنجرے میں پر کٹی چیل بیٹھی ہے۔

نسیمہ : تو گورے رنگ اور رسیلی آنکھوں کے سوا بتو تم میں اور کون سے لعل جڑے ہیں۔ ہاں اتنا ہے کہ جوان ہو۔ لیکن جوانی میں تو گدھی بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔

شمیم : اچھا بُرا نہ مانو۔ آج تک تمھیں لوگ بڑھیا سمجھ کر میری ماں اور مجھے جوان سمجھ کر تمھاری بیٹی کہتے تھے۔ لیکن اب کوئی پوچھے گا تو میں کہہ دوں گی کہ یہ میری بیٹی ہیں اور میں ان کی ماں ہوں۔

نسیمہ : منہ پھٹ۔ ماں سے بھی دلگی کرتی ہے۔ خیر یہ تو بول۔ یہ تجھے کیا ہوگیا ہے۔ رنڈی کا گھر فقیر کی جھولی ہے۔ جب مانگے گی نہیں اور لوگ دیں گے نہیں تو گھر بھرے گا کیسے؟

شمیم : تو کیا لوگوں کا گلا گھونٹ کرلوٹ لیا کروں؟

نسیمہ : جب لوگ خوشی سے دینے کو تیار ہیں تو لوٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن تیری نظر میں تو بس غانم ہی چاند کا ٹکڑا ہے۔ اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔

شمیم : کیا خاک دیکھوں۔ دیکھنے لائق صورت بھی تو ہو۔ ایک موا وہ بڈھا جوہری آتا ہے۔ جھاڑو جیسی بھنویں۔ چیاں جیسی آنکھیں۔ کوڑھی کے بدن جیسی چتکبری داڑھی۔ پاس بٹھاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فاختہ کی بغل میں جنگلی چوہا بیٹھا ہوا ہے۔ دوسرا شیئر مارکیٹ کا دلال، ہر وقت پیپے کی طرح

پیٹ سے منھ تک شراب سے بھرا رہتا ہے اور اس پر بیگن جیسی ناک ہے۔ اس طرح پھوں پھوں سانس لیتا ہے گویا پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا انجن سیٹی دے رہا ہے۔ تیسرے یہ....

نسیمہ : بس میں عاشقوں کی فہرست سننا نہیں چاہتی۔ ارے پاگل شکاری بندوق چلانے کے وقت یہ تھوڑی دیکھتا ہے کہ شکار خوبصورت ہے یا بدصورت۔ ہمیں شکل نہیں دولت چاہیے۔ وہ خوبصورت نہ سہی ان کا روپیہ تو خوبصورت ہے۔

شمیم : چپ چپ۔ وہ موا ناظم آرہا ہے۔ میں نے سونے کے ہار کی فرمائش کی تھی۔ لایا ہے تو اوپری دل سے دوچار بچارے کے ہاتھ پھیر دوں گی اور خالی ہاتھ آیا ہے تو سر کے درد کا بہانہ کر کے یہیں سے چلتا کردوں گی۔

نسیمہ : مگر دیکھو۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ ہمیشہ کے لیے یہ ڈربہ ہی بھول جائے۔

(ناظم داخل ہوتا ہے)

ناظم : (شمیم سے) سرکار بندگی (نسیمہ سے) اماں جان تسلیم۔

نسیمہ : جیتے رہو بیٹا۔ ابھی تمھیں شمیم یاد ہی کر رہی تھی کہ تم آگئے۔ بہت دن جیو گے۔

ناظم : یہ تو ان کی مہربانی پر موقوف ہے۔ چاہے ماریں۔ چاہے جلائیں۔

نسیمہ : (شمیم سے) لو جن کے لیے تڑپ رہی تھیں، اب ان سے جی بھر کے باتیں کرو۔ (ناظم سے) بیٹا میں جاتی ہوں۔ جہاں بیٹی داماد ہوں۔ وہاں ساس کو نہ رہنا چاہیے۔

ناظم : (سائڈ میں) خدا تیری جیسی ساسوں کا ستیاناس کرے۔ نہ جانے حرام زادی ساس بن کر کتنے دامادوں کا گلا کاٹ چکی ہوگی۔

نسیمہ : اچھا لال میں چلی۔

(نسیمہ جاتی ہے)

ناظم : (سائڈ میں) جہنم کے حوالے۔ (شمیم سے) مائی لارڈ اینڈ جیوری، اُدھر کہاں دیکھ رہی ہیں اس گنہ گار کی طرف دیکھیے۔

شمیم : کیا دیکھوں۔ دیکھ تو لیا۔ ایک آدمی آیا ہے۔ دُم لگی ہوتی تو سمجھتی کہ جانور آیا ہے۔

ناظم : آپ کے دربار سے چاہنے والوں کو جانور کا خطاب ملتا ہے تو مجھے نہیں چاہیے۔ اس عزت کے بلّے کو کسی اور بیوقوف کے سینے پر دیوانی کچہری کے سمّن کی طرح چپکا دیجیے۔

شمیم : تو آپ کو کس خطاب سے پکاروں؟

ناظم : بیوی، ہوتیں تو میاں کہتیں۔ بہن ہوتی تو بھائی کہتیں۔ صرف پیاری ہو اس لیے پیارے کہہ کر پکارو۔

شمیم : رنڈی کا پیارا بننے کے لیے لاکھوں خرچ کرنے پڑتے ہیں اور آج کل کے پیارے بننے والوں کی یہ حالت ہے کہ جان دیں گے، دل دیں گے، کلیجہ دیں گے، پھیپھڑا دیں گے مگر ٹکا نہ دیں گے۔ تم اپنے ہی کو دیکھو۔ میرا پیار چاہتے ہو مگر میری فرمائش دینا نہیں چاہتے۔ گدھے کی سینگ کی طرح فرمائش دیتے وقت غائب۔ اور تار لانے والے ڈاکیے کی طرح سلام بی بی صاحب کہہ کر انعام مانگنے کو موجود۔

ناظم : بگڑیے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جیسے نیکیاں ساتھ لیے بغیر جنت میں نہیں جا سکتے ویسے ہی جب تک جیب میں روپیہ اور بغل میں فرمائش نہ ہو رنڈی کے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ یہ لیجیے آپ کی فرمائش۔

(شمیم کو ہار دیتا ہے)

شمیم : واہ جیسا چاہتی تھی ویسا ہی ہے۔ اب تم مجھے پیارے معلوم ہوتے ہو۔

ناظم : (سائڈ میں) کیا جانوں۔ میں پیارا معلوم ہوتا ہوں کہ میرا روپیہ پیارا معلوم ہوتا ہے۔

شمیم : بڑا ہی خوبصورت ہے۔ کس سنار سے بنوایا ہے؟

ناظم : سنار سے بنوانے میں آٹھ دن صرف ہوتے اور تم نے تو مجھے کل دو دن کی مہلت دی۔

شمیم : پھر؟

ناظم : یہ ہار میری بیوی کا ہے۔ میں نے دوسرا بنوا دینے کے وعدے پر پہلے منھ سے مانگا اور جب وہ رکی تو ہاتھ جھٹک کر زبردستی گلے سے اتار لیا۔

شمیم : اس طرح چھیننے سے تو بیوی رونے لگی ہوگی؟

ناظم : اور بیوی کے رونے کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ ہم تو تمھیں ہنستا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔

شمیم : (سائڈ میں)اف کتنی بے وفائی۔ میں گھر کی بیوی ہوتی تو ایسے شوہر کو چوراہے پر گولی مار دیتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مرد خود اتنے بے وفا ہیں وہ رنڈی کو کس منہ سے دغا باز کہتے ہیں۔

ناظم : اب ذرا صراحی دار گردن میں پہن کر ان آنکھوں کو تو خوش کرو۔ (گلے میں ہار پہناتا ہے)

شمیم : کیا کہوں۔ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ بس ہوتا تو دل کے اندر رکھ لیتی۔

ناظم : برا نہ ماننا۔ اس دل میں تو ہزاروں کپٹ اور پاپ پاؤں پھیلائے سورہے ہیں۔ مجھے جگہ کہاں ملے گی۔

شمیم : پیارے۔ تم نے میری گردن میں سونے کا ہار پہنایا ہے۔ میں تمہارے گلے میں اپنی گوری گوری کلائیوں کا ہار پہناتی ہوں۔

(گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہے)

(گانا)

شمیم : بانکے رسیا۔ من بسیا۔ سونی من موہنی توری صورتیا۔

ناظم : پھولوں سے گالوں پہ کیا لالیاں۔ رس والیاں ہیں توری بتیاں۔

شمیم : سوتن سے ناہیں نیناں لگانا۔ پریت کی ریت نبھانا۔ سجن موسے۔

ناظم : ہیں لعل جڑے جوبن میں۔
شمیم : یہ روپ رہے تن من میں۔ البیلے چھپ کھیلے من میں۔
ناظم : نیاری شان۔ پیاری آن۔ میری جان۔ میں قربان
بانکے رسیا.....

پہلا ایکٹ - پانچواں سین

فرید بیگ کا مکان

(رشیدہ کشیدہ کاری کرتے ہوئے ایاز سے باتیں کررہی ہے)

رشیدہ : پاؤں تھام کر منتیں کیں۔ رو رو کر قسمیں دیں۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بھیانک انجام کی تصویر کھینچی۔ اب کیا کروں؟

ایاز : آٹھ دن سے بڑے حضور نے بھی سمجھانا اور بولنا چھوڑدیا۔ کبھی سامنا ہوا بھی تو ٹھنڈی سانس لے کر ہاتھ ملتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

رشیدہ : بیکار دماغ، ڈگمگاتے پاؤں، بدبودار منھ کے ساتھ نصف انسان اور نصف حیوان کی حالت میں بارہ بارہ بجے رات کو گھر آنا۔ نوکروں کو گالیاں دینا۔ بیوی کے سامنے اول فول بکنا۔ جوتے کپڑوں کے ساتھ پلنگ پر گر کے بیمار کی طرح کراہ کراہ کے سانس لینا، ایک مہینے سے روز یہی نظارہ دیکھتی ہوں، کڑھتی ہوں اور روتی ہوں۔

ایاز : افسوس، دنیا میں جب دن کا آدھا کاروبار ختم ہوچکتا ہے، تب بڑی مشکلوں سے کئی مرتبہ آنکھیں کھولنے اور بند کرلینے، سر اٹھانے اور تکیے پر گرادینے کے بعد جاگتے ہیں۔ اور اس وقت ان کے اترے ہوے چہرے پر مردنی، ہونٹوں پر پپڑی، ہاتھ پاؤں میں اینٹھن، لال انگارہ بنی ہوئی آنکھوں کے نیچے سیاہی کی موٹی لکیر دکھائی دیتی ہے۔ گھڑی گھڑی پانی پیتے اور بار بار درد کی تکلیف سے پیشانی پر گھونسے مارتے ہیں..... اور طبیعت میں سکون آنے کے بعد....

رشیدہ : اور اس کے بعد رات کی حرکتوں پر شرمندہ ہوتے، افسوس کرتے، نوکروں سے معافیاں مانگتے اور شراب پینے پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن شام ہوتے ہی پھر اپنی توبہ اور عقل کو شراب کے گلاس میں غرق کردیتے ہیں۔

ایاز : قسمت رحم کر۔

(دونوں اندر جاتے ہیں۔ باہر سے شراب پیے ہوئے عارف و غانم آتے ہیں)

عارف : کس نے؟ کس نے کہا؟ ایاز نے؟

غانم : جی ہاں۔ جو پرانا ملازم ہونے کے حق سے ڈگری دار کی طرح آپ کے گھر پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ اسی ایاز نے۔

عارف : گھونسا دکھا کر تمھیں دھمکی دی؟

غانم : کل جب آپ گاڑی میں بیٹھ گئے اور میں اوورکوٹ لینے کے لیے دوبارہ گھر میں آیا، تب اس نے اوورکوٹ میرے کندھے پر پھینکنے کے بعد زور سے میری کلائی پکڑی۔ اور ڈھائی سیر کا گھونسا ناک کے سامنے کر کے کہنے لگا کہ جی چاہتا ہے کہ ایک ہی گھونسے میں تیری ناک پچکا دوں۔

عارف : پھر؟

غانم : پھر جیسے گھوڑا لگام چباتا ہے، ویسے ہی دانت پیس کر بولا کہ اے پاجی اس گھر میں آنا چھوڑ دے۔ ورنہ میں کسی دن لاٹھی مار کر تیری دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔

عارف : تب تم نے کیا کہا؟

غانم : میں نے کہا کہ ٹانگیں توڑنے سے پہلے ایک سائکل دلادینا۔ ورنہ میں اسپتال سے تمھارا شکریہ ادا کرنے کیسے آؤں گا؟

عارف : میں بے شک اس کی باپ کے برابر عزت کرتا ہوں لیکن اس عزت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ آقا کا آقا بن کر اس کے دوستوں کی بے عزتی کرے۔

غانم : جس گھر میں خود آپ کی عزت نہیں، اُس گھر میں آپ کے دوستوں کی کیا

عزت ہوسکتی ہے۔ سسر کو غرّا ہے کہ میں داماد کو روٹیاں دیتا ہوں۔ بیوی کو گھمنڈ ہے کہ میاں میرے باپ کے دروازے پر پل رہے ہیں۔ گھر کے نوکروں کا خیال ہے کہ ہمارے مالک کی خیرات سے ایک فقیر پرورش پا رہا ہے۔ آپ تو سیدھے اور بھولے آدمی ہیں۔ لوگوں کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ مگر چہرے کی کھال سے جھانکتی ہوئی حقارت کو نہیں دیکھ سکتے۔

عارف : میں بیوی کے سمجھانے اور مجبور کرنے سے سسرال میں رہنے آیا ہوں۔ حقارت کا برتاؤ دیکھتا تو ایک دن بھی یہاں نہ ٹھہرتا۔ سب کچھ کھو دینے پر بھی میرے رہنے کے لیے ابھی ایک باغ اور دو عالی شان مکان موجود ہیں۔

غانم : (سائڈ میں) اُسی باغ اور مکان کو بکوا کر ہاتھ رنگنے کے لیے تو یہ جاں نثار دوست تجھے سسر سے لڑوانا چاہتا ہے۔ (جیب سے چھوٹا سا گلاس اور وہسکی کا ادھا نکالتا ہے) گلا سوکھ گیا ہوگا، ذرا تر کر لیجیے۔

عارف : گھر والوں کے خوف سے میں نے دن کو کبھی نہیں پی۔ تم نے آج سے دن کا پینا بھی شروع کرا دیا۔

غانم : پیجیے، دن کا پینا گناہ میں شمار نہیں ہوتا۔

عارف : کیوں؟

غانم : جس طرح پولیس کے سپاہی رات بھر پہرہ دیتے اور صبح کو وردی پیٹی کھول کر خراٹے لیتے ہیں، ویسے ہی شرابیوں کا گناہ لکھنے والے فرشتے بھی رات بھر شراب کی دکانوں اور ہوٹلوں میں جاگتے اور دن کا کھاتا سر کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں۔

(غانم گلاس میں شراب انڈیلتا ہے)

عارف : تھوڑی۔ ہم دو میں ایک بوتل تو ختم ہوچکی۔ (پیتا ہے)

غانم : آپ جانتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ آپ کا کوئی خیرخواہ دوست نہیں ہے۔ اگر کوئی فائدے کی نیک رائے دوں تو مانیے گا؟

عارف : تم میری عقل کی ریل گاڑی کے انجن ہو۔ جدھر کھینچو گے ادھر ہی چلوں گا۔

غانم : محتاج بن کر دوسرے کے ہاتھ کی طرف کب تک تکا کیجیے گا۔ کھوئی ہوئی دولت پیدا کرنے کے لیے اُس باغ اور مکان کو بیچ کر میری ترکیب اور صلاح کے موافق کسی مبارک دھندے میں روپے لگا دیجیے۔

عارف : رائے تو اچھی ہے۔ لیکن آفس جانا، آرڈر دیکھنا، کھاتا سمجھنا، منیم سے لڑنا، گاہکوں سے مغز پچی کرنا، نفع نقصان کی فکر میں جان گھلانا اور دن بھر ننانوے کے پھیر میں رہ کر رات کو تھکے بیل کی طرح آدھے جاگتے، آدھے اونگھتے ہوئے گھر آنا، یہی تو دھندا ہے۔ اتنی محنت مجھ سے ہو سکے گی؟

غانم : اجی محنت کرکے پیدا کرنا مزدور کا کام ہے۔ میں تو آپ کو ایسا دھندا بتاتا ہوں کہ دس بجے بازار گئے۔ گیارہ بجے سودا کیا اور بارہ بجے دس پانچ ہزار جیب میں ڈال کر گھر لوٹ آئے (پھر گلاس بھر کر دیتا ہے) دماغ کا ٹائر ڈھیلا ہوگیا ہوگا، ذرا ہوا بھر لیجیے۔

عارف : دو گلاس پینے کے بعد ضرور گر جاؤں گا۔ (پیتا ہے) اچھا کون سا دھندا سوچا ہے؟

غانم : میرے ایسا دوست کبھی آپ کو نقصان کا دھندا نہیں بتائے گا۔ گاہک جوت لاتا ہوں، باغ اور مکان بیچ کر جو روپے ملیں، ان سے سٹہ کھیلنا شروع کیجیے۔

عارف : سٹہ۔ ارے اس دھندے میں تو سینکڑوں کے ٹاٹ الٹ گئے۔

غانم : کون بیوقوف کہتا ہے۔ میں ہزاروں کو جانتا ہوں جو ایک ہی دن میں سٹے کی بدولت بھکاری سے کروڑپتی بن گئے ہیں۔ سٹہ کھیت اور روپیہ بیج ہے۔ تھوڑے سے بیج چھڑکیے اور سٹے کے کھیت سے گاجر مولی کی طرح مٹھی بھر بھر کر روپے توڑیے۔

عارف : سٹے میں اتنا فائدہ ہے تو ہر مہینے انسالونسی کورٹ میں دوچار سٹہ کھیلنے والوں کی طرف سے دیوالیہ کی درخواست کیوں گذرتی ہے؟

غانم : وہ دیوالیہ کی درخواست نہیں امیر بننے کا سرٹیفکٹ ہے۔ جائداد بیوی بھائی کے

نام لکھ کر اور جھوٹے کھاتے بنا کر دوسروں کے لاکھوں روپے مار لینا اور دیوالیے ہوچکنے کے بعد کسی اور کے نام سے پھر نیا دھندا شروع کردینا، یہ آج کل کا فیشن ہوگیا ہے۔

عارف : تب میں ضرور سٹے کا دھندا کروں گا۔ میرے بیوپاری بننے کی خوشی میں ایک گلاس بھر۔

(غانم گلاس میں شراب ڈالتا ہے)

غانم : پیے جیسے۔ یہ مزے دنیا ہی میں ہیں۔ جنت میں یہ سب کچھ نہیں ملے گا۔ وہسکی نہیں ملے گی۔

عارف : (پی کر) آہا۔ کیا دھندا بتایا۔ دس بجے بازار گئے۔ گیارہ بجے سودا کیا اور بارہ بجے دس پانچ ہزار جیب میں ڈال کر گھر آگئے۔ آہا ہا ہا۔ سٹہ بھی امیر بنانے کی مشین ہے۔

غانم : ایسی اچھی صلاح میرے سوا آپ کا نوکر، بیوی، سسر کوئی نہیں دے سکتا۔

عارف : جہنم میں گئے وہ سب۔ مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ میرا دوست ہے تو تو ہے۔ نوکر ہے تو تو ہے۔ سسر ہے تو تو ہے۔ بیوی ہے تو تو ہے۔

غانم : اچھا تو اس مونچھوں والی بیوی کے ہاتھ سے ایک محبت کا جام اور چڑھا لیجیے۔

(گلاس میں شراب ڈالتا ہے کہ ایاز داخل ہوتا ہے)

ایاز : یہ کیا؟..... دن کو...... اور وہ بھی گھر میں۔ (غانم سے) خبردار گلاس نہ دینا۔

غانم : کیوں۔ کیا اس گلاس میں زہر بھرا ہوا ہے؟

ایاز : ہاں۔ یہ زہر ہی ہے۔ اور ایسا زہر جو پھن اٹھا کر ناچتے ہوئے سانپ کی طرح پہلے تماشہ دکھایا کرتا، پھر ڈس کر بے ہوش کر دیتا ہے، اور آخر میں جان لے لیتا ہے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ اس ملک کے جج زہر کھلانے والوں کو کالے پانی اور پھانسی کی سزا دیتے ہیں، لیکن تم جیسے قاتلوں کو جو

بوتل کے زہر سے ہزاروں کی جان لے رہے ہو، ٹکٹکی سے باندھ کر دس بید لگانے کا بھی حکم نہیں دیتے۔

غانم : (عارف سے) دیکھ لیجیے۔ یہ میرا کتنا دشمن ہے۔ میں گھر میں آتا رہا تو ضرور کسی دن کوئی لوٹا یا دیگچی تھما کر پولیس کے حوالے کر دے گا۔

عارف : ایاز تم بہت گستاخ ہوگئے ہو۔ میں پیتا ہوں، میری خوشی، یہ پلاتا ہے، اس کی مہربانی۔

غانم : (بات کاٹ کر) تھینک یو

عارف : اس کو بُرا کہنے اور مجھے روکنے کی وجہ۔ یہ میرا دوست ہے، تم کون ہو؟

ایاز : جس ایاز کے سامنے پیدا ہوئے، جس ایاز کی گود میں پل کر بڑے ہوئے، جس ایاز کے ہاتھوں سے اس سر پر شادی کا سہرا بندھا، وہ ایاز تمھارا کوئی نہیں۔ اور یہ پیسوں کا یار، دسترخوان کی مکھی، سو پاجیوں کا ایک پاجی، آج تمھارا دوست ہوگیا۔ زوف ہے تمھاری سمجھ پر۔

غانم : سن لیجیے۔ ابھی زوف کہا ہے، تھوڑی دیر میں گالیاں دے گا۔

عارف : ایاز چلے جاؤ۔ میں اس وقت نشے میں ہوں۔ زیادہ بولوگے تو اس بوڑھے منھ پر بوتل کھینچ کر مار دوں گا۔

ایاز : اس منھ پر بوتل نہیں جوتیاں مارو۔ اس منھ پر بوٹ کی ٹھوکر لگاؤ۔ اس منھ پر تھوک دو۔ لیکن یہ منھ جس نے چالیس برس تک تمھارے باپ کا نمک کھایا ہے، جو نصیحت کرے وہ سن لو۔ شراب تندرستی میں گھن لگاتی ہے۔ امیروں سے بھیک منگواتی ہے۔ شریفوں سے جرم کراتی ہے۔ پڑھے لکھوں کو کتے کی طرح کیچڑ میں لٹاتی ہے۔ بھائی بیٹے کے منھ سے ماں بہنوں کو گالیاں سنواتی ہے۔ شوہروں کے ظلم سے تنگ آئی بیبیوں کو بازار کی رنڈی بنا کر کوٹھوں پر بٹھاتی ہے۔ ایسی گندی اور خوفناک چیز کو مت چھوؤ۔ اس منھ پر تھوکنے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس بوتل پر بھی تھوک دو۔

عارف : بول چکے یا کچھ اور بولنا ہے؟ جتنی ضد دلاؤ گے اتنی ہی پیوں گا۔ (غانم سے) لا گلاس بھر کے۔ کنارے تک بھر کے۔

غانم : (گلاس دیتے ہوئے) غٹ سے اتار جائیے۔

(ایاز غانم کا ہاتھ پکڑ کر مروڑتا ہے)

ایاز : وہ رہا دروازہ۔ آج سے اس گھر میں قدم رکھے گا تو دسوں انگلیاں گردن میں دھنسا کر دم نکال دوں گا۔ (گردن میں ہاتھ دے کر) نکل جا حرام زادے۔

عارف : ہائیں۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے دوست پر حملہ۔ گھر کے پالتو کتے میں اتنی ہمت۔ بدمعاش کمینے۔

(ایاز کو مارنے کے لیے کرسی اٹھاتا ہے۔ فرید بیگ اور رشیدہ کا داخلہ)

رشیدہ : یہ کیا۔ یہ کیا؟

فرید : یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔

غانم : (سائڈ میں) غانم اب کھسک جا۔ اس نے گردن توڑی۔ یہ دونوں مل کر سر توڑ دیں گے۔

(جاتا ہے)

رشیدہ : (عارف سے) تمھیں کیا ہوگیا؟ تم چند ہی دنوں میں کتنے بدل گئے۔ یہ کیا ہے؟

ایاز : میری زندگی بھر کی خدمت کا مجھے انعام دے رہے ہیں۔

عارف : یہ اپنے کو بھول گیا ہے۔ میں اسے سکھانا چاہتا ہوں کہ یہ میرا مالک نہیں نوکر ہے۔

فرید : شرم کر۔ بوتل کے بندے۔ نشے کے غلام شرم کر۔ انسان کی صورت اور حیوان کی حرکتیں۔ آج تو نے اس وفادار فرشتے پر کرسی اٹھائی، کل بیوی کو لاتیں مارے گا، پرسوں مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا۔

سمجھ اندھی، نظر بیکار، سر چکر میں رہتا ہے
سجھائی کچھ نہیں دیتا نشہ جب سر میں رہتا ہے

نہ رنج اوروں کے صدمے کا، نہ شرم اپنی خرابی سے
ہر اک جرم اور بدی ممکن ہے پاگل اور شرابی سے

عارف : حد کے اندر رہو۔ غصے کی باتیں صرف تمھارا خریدا ہوا غلام سن سکتا ہے۔ پاگل میں نہیں، پاگل یہ بوڑھا ہے، پاگل تمھاری لڑکی ہے، پاگل تم ہو۔

فرید : بے شک میں پاگل ہوں۔ پاگل نہ ہوتا تو اتنی نالائقی پر تیرا بھلا کیوں چاہتا۔ پاگل نہ ہوتا تو اپنے روپیوں سے تیرے قرض کیوں ادا کرتا۔ پاگل نہ ہوتا تو برائیوں سے بچانے اور نیک راستہ دکھانے کے لیے اپنے گھر میں لاکر کیوں رکھتا۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ انسان، وحشی ریچھ اور خونی بھیڑیے کے ساتھ گذر کرسکتا ہے لیکن شرابی کے ساتھ ایک منٹ بھی بسر نہیں کرسکتا۔

عارف : تو کون ہاتھ جوڑتا ہے۔ ساتھ نہیں رہنا چاہتے، نہ رہو۔ میں دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اس گھر پر بھی اور گھر والوں پر بھی۔

فرید : پتھر کا دل بھی اس سے زیادہ صدمے کی چوٹ نہیں سہ سکتا۔ اچھا تو چلا جا۔ نکل جا۔ اسی وقت نکل جا۔ تیرا دنیا میں ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہے۔ میں سمجھوں گا کہ نالائق عارف شراب پیتے پیتے مر گیا اور اس کی بدقسمت بیوی جوانی میں بیوہ ہو گئی۔

رشیدہ : ابا۔ابا۔کس پر غصہ کر رہے ہیں۔یہ آپے میں نہیں ہیں۔

ایاز : حضور اس کی نالائقی کی طرف نہیں۔اپنی بزرگی کی طرف دیکھیے ۔

فرید : چپ رہو۔اگر یہ آج میرے گھر سے نہ گیا تو میں گھر کو آگ لگا کر خود کسی طرف چلا جاؤں گا۔اسے میری، اس کی، تمھاری ضرورت نہیں۔شراب کی، شراب خانوں کی،شرابی دوستوں کی ضرورت ہے۔ (عارف سے) جا ذلت اور تباہی تیرا انتظار کر رہی ہے۔

عارف : بس۔اور ایک حرف نہیں۔ایاز گاڑی۔رشیدہ اپنے گھر چل۔

فرید : گھر چلیں-کیوں؟رونے کے لئے،کڑھنے کے لیے۔انجام میں فاقہ کرنے اور بھیک مانگنے کے لیے۔ نہیں اب یہ باپ کے گھر کا سکھ چھوڑ کر تیرے دکھوں

میں حصہ لینے نہیں جائے گی۔

عارف : نہیں جائے گی؟

فرید : ہاں نہیں جائے گی۔ یہاں باندیاں ہیں، کپڑا ہے، زیور ہے، خوشی ہے، سکھ ہے۔ لیکن تیرے پاس نشہ، غریبی، اور دکھ کے سوا کیا رکھا ہے۔ رشیدہ۔ ایک طرف شوہر ہے اور ایک طرف باپ ہے۔ بول تو کس کا حکم سنے گی۔

سکھ سے رہنا ہے تو امید اور رشتے توڑ دے
جس طرح میں چھوڑتا ہوں تو بھی اس کو چھوڑ دے

رشیدہ : چھوڑ دوں۔ کیسے چھوڑ دوں؟ ابا جان ۔شادی کا رشتہ دو خود غرض آدمیوں کی شرکت میں شروع کیا ہوا بیوپار نہیں ہے کہ نفع ہو تو شریک رہیں اور نقصان ہو تو الگ ہو جائیں۔ جسے ماں باپ شادی کا دن کہتے ہیں، وہ لڑکی کی قربانی کا دن ہوتا ہے۔ جیسے ندی سمندر میں گر کر اپنی ہستی کو کھو دیتی ہے، ویسے ہی عورت بھی شادی کے دن اپنا دل ، ہستی، سکھ، سب کچھ شوہر کو نذر کر کے ہمیشہ کے لئے اسی کی ہو جاتی ہے۔

جہاں تک دم میں دم ہے میں بھروں گی صرف دم ان کا
نہ جب تک ہاتھ کٹ جائیں نہ چھوڑوں گی قدم ان کا
کھلی، پھولی، پھلی اب تک انھیں کے چھاؤں کے نیچے
مری دنیا، مری جنت ہے ان کے پاؤں کے نیچے

فرید : یہ قبر کے کنارے آپہنچا ہوا بیمار۔ ڈوبتی ہوئی کشتی، گرتی ہوئی چھت، جلتا ہوا مکان ہے۔ اس کا ساتھ نہ دے۔ یہ خود بھی تباہ ہوگا اور تجھے بھی تباہ کر دے گا۔

بند ہونے کے نہیں جاری جو یہ سوتے ہوئے
ختم ہوگی زندگی تقدیر کو روتے ہوئے

رشیدہ : وفادار بیوی سکھ کے لالچ سے شوہر کی محبت اور خدمت نہیں کرتی۔ شوہر اس کا مجازی خدا، شوہر کی محبت اس کا ایمان اور شوہر کی خدمت اُس کی عبادت ہے۔

ہزاروں دوست بن جاتے ہیں آ کر خوش نصیبی میں
مگر وہ دوست ہے جو ساتھ دے دکھ اور غریبی میں
وہی بیوی ہے جو دکھ درد میں دے ساتھ شوہر کا
ہنسی چھوڑے خوشی چھوڑے نہ چھوڑے ساتھ شوہر کا

فرید : تو کیا میرا حکم نہ سنے گی۔ شوہر کا سب حق ہے اور باپ کا کوئی حق نہیں؟

رشیدہ : شادی کے بعد لڑکی کو رخصت کرنے کے وقت جب ماں باپ یہ کہتے ہیں کہ میری لڑکی تمھاری جنم کی لونڈی اور تم اس کی زندگی اور قسمت کے مالک ہو، اس دن وہ اپنے منھ سے اپنے سارے حق دوسرے کو دے دیتے ہیں۔ پھر بھی اس حکم کے سوا کہ ''دکھ میں شوہر کا ساتھ نہ دو''، میں آپ کا ہر حکم ماننے کے لیے تیار ہوں۔ ؎

میرا سکھ ان میں ہے، ان کے گھر نہ ان کے مال میں
ہو امیری یا غریبی، شاد ہوں ہر حال میں
بے وفائی آنہیں سکتی مرے نزدیک بھی
آپڑا گر وقت تو مانگوں گی مل کر بھیک بھی

فرید : باپ کے منع کرنے پر بھی اس کی قسمت کے کڑوے پیالے سے زہر کے گھونٹ پینا چاہتی ہے۔ اس کے ہاتھ کے کھودے ہوئے کنویں میں اس کے ساتھ گرنا چاہتی ہے۔ جس چھری سے یہ اپنی قسمت کو زخمی کر رہا ہے، وہی چھری تو اپنے گلے پر ریتنا چاہتی ہے۔ تو جا۔ تو بھی جا۔ اسی وقت جا۔ ؎

دکھوں میں ڈوب مر خوش ہے اگر خود کو ڈبونے میں
نہ مانے گا جو دل رولوں گا، جا کر ایک کونے میں

ایاز : حضور جوش سے کام نہ لیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ انتہائی دُکھ، انتہائی مایوسی یا انتہائی غصے میں بدل جاتا ہے۔ ؎

غصے میں مگر شر ہے، کبھی خیر نہیں ہے
اولاد ہیں، دونوں میں کوئی غیر نہیں ہے

عارف : شراب برف کو آگ، بے حس مرد اور مچھر کو شیر بنا دیتی ہے۔ لیکن میں اتنے نشے میں بھی ضبط کر کے در گذر کر رہا ہوں۔ اگر تم اسے نہیں بھیجنا چاہتے تو میں بھی اسے نہیں لے جانا چاہتا۔ ؎

کیوں ذلیل و خوار ہو ساتھ اک ذلیل و خوار کے
تم نے بھیجا بھی تو لوٹا دوں گا ٹھوکر مار کے

فرید : سُن سُن۔ شوہر کے منھ سے اپنی قسمت کا فیصلہ سُن۔ بیوی شوہر کے لیے ساری دنیا کو چھوڑ دیتی ہے۔ بیوی شوہر کے دکھ کے وقت کھانا، سونا، پہننا، ہنسنا بھول جاتی ہے۔ شوہر کا گھر روشن رکھنے کے لیے اپنے کو چراغ کی طرح دھیرے دھیرے جلا کر ختم کر دیتی ہے۔ لیکن بدچلن شوہر سے اسے کیا انعام ملتا ہے۔ یہی جو یہ تجھے دے گا۔ نفرت، گالی اور ٹھوکر۔ ؎

چبھیں گے رات دن نشتر جگر میں اس کی باتوں سے
ترے سب پیار کے قرضے چکائے گا یہ لاتوں سے

رشیدہ : جو بیوی شوہر سے سکھ چاہتی ہے، پیار چاہتی ہے، عزت چاہتی ہے، لیکن شوہر کا غصہ برداشت کرنا نہیں چاہتی، اسے بیوی نہیں بازار کی خود غرض عورت سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ بیوی شوہر کا سکھ دیکھتی ہے اور بازاری عورت اپنا سکھ ڈھونڈھتی ہے۔ بیوی سو رکھائیوں پر بھی جان چھڑکتی ہے۔ اور بازاری عورت ایک بے رخی پر برسوں کے دشمن کی طرح منھ پھیر لیتی ہے۔ ؎

یہ ماریں یا جلائیں، ساتھ ہوں اور ساتھ رہنا ہے
میں ان کے ہاتھ کے زخموں کو سمجھوں گی کہ گہنا ہے
نہ بھولی ہوں، نہ بھولوں گی، کبھی پہلے کرم ان کے
یہ لاتیں بھی جو ماریں گے تو چوموں گی قدم ان کے

فرید : رشیدہ۔ تو اس کے لیے میری محبت ہی نہیں، سب کچھ کھو رہی ہے۔ یاد رکھ میری لاکھوں کی دولت سے تجھے ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔

رشیدہ : ابا جان۔ مجھے دولت کا لالچ نہ دیجیے۔ شریف بیویاں شوہر کی محبت ہی کو

سب سے بڑی دولت سمجھتی ہیں۔ آپ کی دی ہوئی دولت کو چور چرا سکتا ہے اور ڈاکو لوٹ سکتا ہے۔ لیکن اس دولت کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ۔

پھنس نہیں سکتی ہے دام زر میں ناداری مری
سلطنت بھی ہو تو ٹھکرا دے وفاداری مری

فرید : اگر میری دولت کی پروا نہیں ہے تو یہ میرا دیا ہوا موتیوں کا ہار اور طلائی چوڑیاں بھی اتار دے۔

رشیدہ : یہ ہار اور چوڑیاں شوہر کے پیار سے زیادہ قیمتی نہیں۔ عورت کے گلے کی خوبصورتی موتیوں کے ہار سے نہیں محبت کے طوق سے اور ہاتھ کی خوبصورتی سونے کی چوڑیوں سے نہیں، وفاداری کی زنجیر سے ہے۔ لیجیے۔ اٹھائیے۔

(رشیدہ ہار اور چوڑیاں اتار کر پھینک دیتی ہے)

امیری مال و زیور میں سمجھنا کم نگاہی ہے
جہاں مل کر رہیں دو دل وہیں پر بادشاہی ہے
امیروں کے محل سے بڑھ کے ٹوٹے گھر کا کونا ہے
خوشی کی شے محبت ہے، نہ موتی ہے، نہ سونا ہے

فرید : آٹھ لاکھ نقد اور جائداد تو پھونک چکا۔ ایک باغ اور مکان رہ گئے ہیں، انھیں بھی چند دنوں میں شراب خانے کی نذر کر دے گا۔ پھر دیکھوں گا کہ اسے فاقے سے کون بچاتا ہے؟

رشیدہ : کیا یہ انگلیاں کشیدہ نہیں کاڑھ سکتیں، کیا یہ آنکھیں رات کے وقت چراغ کے سامنے نہیں جاگ سکتیں۔ کیا یہ ہاتھ محنت نہیں کرسکتے۔ میں سوئی کے ساتھ آنکھیں پھوڑوں گی۔ کپڑے سیوں گی، دوسرے کے گھر میں نوکری کر کے جھوٹے برتن مانجوں گی، لیکن اپنے جیتے جی کبھی انھیں فاقہ نہ کرنے دوں گی۔ ۔

بہا دوں گی کلیجے کا لہو ان کے پسینے پر
انھیں فاقوں سے دیکھوں اور جیوں لعنت ہے جینے پر

فرید : تب جا غارت ہو، تباہ ہو، آج سے میں تیری صورت بھی نہ دیکھوں گا۔ انھیں قدموں میں تیری پامالی اور انھیں قدموں میں تیری موت ہے۔

رشیدہ : انھیں قدموں میں میری زندگی اور انھیں قدموں میں میرا سکھ ہے۔

(عارف کا پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ فرید غصے میں منھ پھیر لیتا ہے۔ ایاز حیرت سے رشیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اور عارف ہاتھ سے رشیدہ کو دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔)

پہلا ایکٹ - چھٹا سین

راستہ

(زیاد پاشا، طارق اور ایک مصاحب کے ساتھ آتا ہے)

زیاد : دیکھتے ہو کیسا دلفریب شہر ہے، ہر محلّہ ایک خوبصورت پھول کی پنکھڑی معلوم ہوتا ہے۔

طارق : واقعی حضور، مشرق کی متانت اور مغرب کی تراش خراش کو ایک ساتھ دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ مدت کے بچھڑے ہوئے ایشیا اور یورپ باسفورس کے کنارے آپس میں گلے مل رہے ہیں۔

زیاد : یہ دل کش آبادی پہلے بھی ایشیا کے خوبصورت شہروں کی شہزادی کہلاتی تھی، لیکن جیسے یورپ سے آئی ہوئی آزادی نے اس کے جسم سے عصمت کا قدیم لباس اور پرہیزگاری کے پرانے زیور اتار کر شراب میں غسل دینے کے بعد دنیا پرستی کی پوشاک اور عیاشی کے زیور پہنا کے منھ پر فضول خرچی اور فیشن کا پاوڈر مل دیا ہے، اس دن سے اس کے حُسن میں ایک نئی چمک دمک آگئی ہے۔

طارق : بجا ہے ولی نعمت۔

زیاد : جانتے ہو، میں اپنا قلعہ، محل، ریاست چھوڑ کر ایک معمولی رئیس کی طرح سال کے آٹھ مہینے اس شہر میں کیوں گذارتا ہوں؟

طارق : جانتا ہوں خداوند۔ حضور حُسن کے شکاری ہیں اور یہاں کے ہوٹلوں اور تھیٹروں میں تھوڑے خرچ اور تھوڑی کوشش سے حضور کو ہر ملک کے

خوبصورت شکار مل جاتے ہیں۔

زیاد : خوب سمجھے اور ٹھیک سمجھے۔ ؎

یوں ہی اپنی گذرتی ہے یہاں کے گل عذاروں میں
گھرا رہتا ہے جیسے چودھویں کا چاند تاروں میں
وہ خوشیاں ہیں بغل میں فاصلہ تھا جن سے کوسوں کا
نظر کو دید کا ملتا ہے لطف اور لب کو بوسوں کا

طارق : خاصے کا وقت ہوچکا۔ حضور دوپہر کا کھانا کہاں تناول فرمائیں گے؟

زیاد : کل والے ارمنی ہوٹل میں۔

(تینوں جاتے ہیں۔ لیلیٰ پھول بیچتی ہوئی آتی ہے)

لیلیٰ : (گاتا) مرے پھول رنگیلے۔ آؤ رسیلے لوٹو بہار۔
چن چن کلیاں میں بچن لائی، لے لو البیلے بیلے کا ہار۔
جو ہی چمبیلی کی دیکھو رے جوتی۔ دھاگے میں پردئے ہیں موتی
مند سگندھ تھکن سب کھوتی
بیچت ہوں میں سکھ اور سنگا ر۔ میرے پھول....
(اپنے آپ سے) ماں کے مرنے کے بعد دنیا کے سمندر میں ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح غریبی اور مصیبت کے طوفان کا مقابلہ کر رہی ہوں۔ باغ سے پھول چننا۔ گلدستے بنانا۔ گلی گلی پھر کر بیچنا، بدمعاشوں کی ناپاک نظر اور پاجیانہ حملوں سے اپنے کو بچانا اور عزت و حرمت سے چار پیسے مل گئے تو کچھ کھا لینا ورنہ بھوکی سوجانا، یہی میری زندگی ہے۔ اور یہی میری زندگی کے روزانہ کام ہیں۔ ؎

خداوند بس اتنی عرض تجھ سے دست بستہ ہے
اُدھر ہی مجھ کو لے جانا جدھر نیکی کا رستہ ہے

(لیلیٰ ایک طرف جاتی ہے اور انور اپنے دو فوجی دوستوں کے ساتھ آتا ہے)

انور : میرے دوست۔ جب ایک طرف غصہ اور ایک طرف گستاخی ہو تب یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ دونوں طرف سے کھینچنے میں ملے ہوئے دل تو کیا، آپس میں جوڑی ہوئی زنجیر کی کڑیاں بھی الگ ہوجاتی ہیں۔

آتش : آپ کو یہاں کا حال کیوں کر معلوم ہوا؟

انور : ایاز کے خط سے۔ جس دن سے خط ملا اسی دن دو مہینے کی چھٹی لی اور اسی شام کو چھاونی سے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔

جلال : اور گھر پہنچنے پر آپ کے والد اور عارف کسی نے آپ کی نیک صلاح قبول نہ کی۔

آتش : یہی تو صدمہ ہے۔

انور : آپ جانتے ہیں کہ رشیدہ میری سگی بہن ہے اور ایسا بھائی کون ہے جسے بہن کی بربادی کا صدمہ نہ ہوگا۔

جلال : وہ سامنے ارمنی کا ہوٹل ہے۔ آیئے چائے بھی پئیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔

(لیلیٰ واپس آتی ہے)

لیلیٰ : میں نظر کی تازگی اور دماغ کی فرحت بیچتی ہوں۔ کیا حضور موسم بہار کے یہ خوش رنگ جواہر خریدیں گے؟

انور : (ساتھی سے) کیسے ستھرے لفظوں میں سودا بیچتی ہے۔ (ایک گلدستہ لے کر) اس گلدستے کی کتنی قیمت ہے؟

لیلیٰ : غریبوں کی قسمت میں جتنی خوشی ہوتی ہے، اس سے بھی کم۔ صرف چار آنے۔

انور : جب کوئی لڑکی شائستہ لفظوں میں شرم و شرافت کے ساتھ پھول بیچتی ہے تو اُس پھول کا دام شریف آدمی کی نظر میں ایک سے چوگنا ہوجاتا ہے۔ یہ لو روپیہ۔

لیلیٰ : معاف کیجیے۔ میں زیادہ دام نہیں لے سکتی۔ کیونکہ یہ غریب لڑکی کے لیے

لالچ ہے اور لالچ ہی گناہ کا راستہ ہے۔

انور : کسی نیک لڑکی کو لالچ دینا، یہ شریف کی نہیں کمینے کی حرکت ہے۔

لیلیٰ : تو پھر کیا آپ مجھے بھیک دیتے ہیں۔ اگر یہ بھیک ہے تو اس روپیہ پر میرا نہیں یتیموں، بیواؤں اور ہاتھ پاؤں سے لاچار محتاجوں کا حق ہے۔ میں اپنی روٹی اپنی محنت سے پیدا کرسکتی ہوں۔

انور : پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے روپیہ دیتا ہوں۔

لیلیٰ : پیسے نہیں ہیں تو یہ گلدستہ آپ کی نذر ہے۔

(لیلیٰ گلدستہ دے کر چلی جاتی ہے)

انور : (حیرت سے) اتنا امیر دل اور اس کا جس نے ایک غریب کے گھر میں جنم لیا ہے۔

جلال : دنیا کو نیکی، شرافت، فیاضی کی تعلیم دینے والے تمام پیغمبر اور تمام بڑے آدمی غریب ہی کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

پہلا ایکٹ - ساتواں سین

ہوٹل

(مختلف میزوں پر بیٹھے لوگ شراب پی رہے ہیں۔ ایک طرف عارف اور زیاد بیٹھے ہیں۔ عارف کے پاس غانم اور زیاد کے پیچھے اُس کے مصاحب کھڑے ہیں۔ ہوٹل کی رقاصہ شمیم ناچ رہی ہے)

غانم : واہ میری لقا کبوتری۔ کیا کمانی کی طرح کمر لچک رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گھنگھرو پہن کر مور ناچ رہا ہے۔

عارف : دوست غانم۔ ناچ تو خوب ہے۔ لیکن نشے میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ناچ رہی ہے، مکان ناچ رہا ہے یا ہم تم ناچ رہے ہیں۔

غانم : (سائڈ میں) کوئی نہیں دماغ میں بوتل ناچ رہی ہے۔

ایک شخص :ذرا غریبوں کی طرف بھی آیئے گا۔ ناچ کا تو مول ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ دانتوں میں ہونٹ دبا کر مسکرانے کی قیمت ہے۔

(نوٹ دکھاتا ہے جسے شمیم آگے بڑھ کر لیتی ہے)

دوسرا : اِدھر بھی زندوں کی بستی ہے۔ یہ بھویں ٹیڑھی کرکے کن انکھیوں سے دیکھنے کا نذرانہ ہے۔ (نوٹ دیتا ہے)

غانم : اجی سنتی ہو۔ بہت سی بھوکی نگاہیں تر نوالہ سمجھ کر گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ منھ پر رومال ڈالو۔ نہیں تو نظر لگ جائے گی۔

عارف : غانم کیا ہو رہا ہے؟

غانم : حضور عشق بازی کی ریس میں روپے کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ آپ کی جیب میں بھی تو "ٹپ" موجود ہے۔ "ون" نہیں تو "پلیس" ہی کھیل لیجیے۔

عارف : سمجھ گیا۔ بے شک۔ ضرور انعام دینا چاہیے۔

غانم : جناب رنڈیوں کو انعام دینے سے بڑھ کر کوئی ثواب کا کام نہیں۔ کیونکہ یہ سب بے باپ کی یتیم بچیاں ہیں۔

زیاد : اچھا۔ اس روپیہ چگنے والی چڑیا سے پوچھو کہ نوٹ کھائے گی یا بینک کا چیک۔ بلا لاؤ۔

غانم : (شمیم کے پاس جاکر) لو چلو۔ ایک ہی لات مارنے سے نصیب کا پھاٹک کھل گیا۔ لیکن جو کچھ ملے داہنے ہاتھ سے لے کر بائیں ہاتھ سے اس کوٹ کے سیونگ بینک میں داخل کر دینا۔

شمیم : پہلے یہ بتاؤ۔ کیا کوئی اور خالہ مل گئی ہے؟ تم دو روز سے گھر کیوں نہیں آئے؟

غانم : کیا سر پھٹول کرنے آؤں۔ تمھاری ماں تو میری صورت دیکھتے ہی اس طرح گرم ہوجاتی ہے جیسے پیپل پر کی چڑیل کو بخار آجائے۔

شمیم : اجی جب میں تمھیں چاہتی ہوں تو بڑھیا کے لال پیلی ہونے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ رنڈی کی نائکہ تو گھر کی پالو بلی ہوتی ہے۔ جہاں نوچی نے ڈانٹ بتائی کہ دو دفعہ غرانے کے بعد دم دبا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

غانم : یہ تو سچ ہے۔ جب نائکہ بڑھیا ہوتی ہے تو اس کی قسمت بھی بڑھیا ہوجاتی ہے۔ اچھا چلو نوٹوں پر ہتھ مار لو۔ مگر دیکھنا محبت کے ڈاک خانے میں ایمان کی رجسٹری کرا چکی ہو۔ آدمی خوبصورت ہے۔ ڈاکیے کے تھیلے کی طرح گلے نہ پڑجانا۔

شمیم : (پاس جاکر) سرکار لوگ تو بوتل کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ادھر نظر کیجیے۔ اس رسیلی صورت کو دیکھ کر بھی نشہ ہو جاتا ہے۔

غانم : جی ہاں۔ عورت نہیں پورٹ وائن کی بوتل ہے۔

زیاد : آگئیں۔ خوب ناچتی ہو۔ لٹو بھی اتنی جلدی نہیں پھر سکتا۔

عارف : لو یہ ناچنے کا انعام۔

زیاد : یہ یہاں تک آنے کا انعام۔

(عارف اور زیاد شمیم کو نوٹ دیتے ہیں اور غانم شمیم سے لے کر پاکٹ میں رکھتا ہے)

عارف : یہ ہم دونوں دوستوں کی سلامتی کا انعام۔

شمیم : واہ۔ کیا دل ہے۔ میں نے آج تک ایسے سخی نہیں دیکھے۔

غانم : تجھے معلوم نہیں۔ داؤں جیتنے کے بعد جواری اور تھوڑی پی لینے کے بعد شرابی دونوں سخی بن جاتے ہیں۔

شمیم : ان نوٹوں میں سے کچھ مجھے بھی تو دو۔

غانم : جب میں تمھیں دل دے چکا تو اب دنیا میں دینے کو باقی ہی کیا رہا۔ جاؤ۔ دینے کے لیے بہت سے بیوقوف موجود ہیں۔

شمیم : واہ رے محبت کا اندھیر ــــ دنیا کو میں لوٹتی ہوں اور تم مجھے لوٹتے ہو۔

(شمیم ہنستی ہوئی جاتی ہے)

عارف : (زیاد سے) اچھا تو میں رخصت ہوتا ہوں۔

زیاد : اتنا جلد؟ کہاں جائے گا؟

عارف : میں نے اپنی ایک لاکھ کی جایداد ضرورت کے لیے ستر ہزار میں فروخت کر دی ہے۔ اس وقت غانم کے ساتھ عدالت میں اس کی رجسٹری کرانے جا رہا ہوں۔

(دونوں ہاتھ ملاتے ہیں۔ زیاد مصاحبوں کے ساتھ اندر جاتا ہے۔ ہوٹل کا بوائے بل لاتا ہے)

بوائے : (عارف کے سامنے بل پیش کرکے) حضور۔

غانم : (بوائے سے) روپے تیرہ آنے والے تو نہیں ہیں۔ کیونکہ ہوٹل والے شرابیوں کو نشے میں دیکھ کر کھوٹے روپیہ دے دیا کرتے ہیں۔ کتنے بچے؟

بوائے : حضور نے پچاس کا نوٹ دیا تھا۔ سینتیس روپے دس آنے کا بل ہوا۔ باقی بارہ روپے چھ آنے۔

عارف : کیا بچے۔ بارہ روپے چھ آنے۔ لے جاؤ تمھاری بخشش ہے۔

(بوائے سلام کرکے لوٹتا ہے۔ اور غانم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

غانم : ابے اے کہاں لے چلا۔ ایک وقت میں اتنے روپے کبھی تیرے باپ کو بھی انعام میں ملے تھے۔ رکھ۔ نہیں تو ڈاکے کے مقدمے میں دھروا دوں گا۔ اٹھا بے چونّی۔

(سب روپے اپنی جیب کے حوالے کرتا ہے)

بوائے : ایسے ہی کم بخت کسی کا بھلا ہونے نہیں دیتے۔ اچھا بیٹا کبھی تم میرے گھر کے پاس مل گئے تو محلے بھر کے کتے پیچھے لگادوں گا۔

غانم : کیا بھونکا۔ دو آنے کی جگہ چار آنے انعام پانے پر بھی میرے پیچھے کتے لگادے گا۔ اور چاہیے۔ لے انعام۔

(سر پر دھول مارتا ہے)

ہوٹل والا : یہ کیا بیہودگی۔ متوالے ہوکر میرے نوکر پر ہاتھ اٹھاتے ہو؟

غانم : ابے ہمیں متوالا کہتا ہے۔ ہم وہسکی کی دو بوتلیں تو ناس کی طرح سونگھ جاتے ہیں۔ یہ اس کی گستاخی کا انعام تھا۔ اور یہ دیکھ تیری حمایت کا انعام۔ (پھر مارتا ہے)

ہوٹل والا : تم جیسے بدمعاش آئیں گے تو اس ہوٹل میں ایک بھی شریف نہ آئے گا۔ لچے فسادی۔ نکل جا میرے ہوٹل سے۔

(دروازے کی طرف دھکا دیتا ہے)

عارف : (لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر) شریفوں سے یہ برتاؤ۔ دوست کی بے عزتی خود میری بے عزتی ہے۔ (ہوٹل والے کی گردن پکڑ کر) کتے۔ اس کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ نہیں تو گنے کی طرح گردن کے دو ٹکڑے کردوں گا۔

ہوٹل والا : ہوٹل میں خونی گھس آئے۔ پولیس۔ پولیس۔

عارف : بول کہ قصور ہوا۔ ورنہ پولیس کیا تیرے باپ کے آنے پر بھی گردن توڑے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔

(پولیس کا افسر دو سپاہیوں کے ساتھ آتا ہے)

افسر : یہ کیا؟ قانون اور عدالت سے اتنی بے پروائی۔

غانم : (اپنے سے) جیل خانے کے ایجنٹ آگئے۔ اب کھسک جاتا ہوں۔ باوا میں تو سکھ اور مزے کا ساتھی ہوں۔ مصیبت اور جیل کا ساتھی نہیں ہوں۔ (بھاگ جاتا ہے)

افسر : چھوڑ دو گردن۔ پولیس کا حکم نہیں سنتے۔ (گردن چھڑا کر) یوں کھڑے ہو (ہوٹل والے سے) کیا معاملہ ہے؟

ہوٹل والا : آپ ابھی نہ پہنچتے تو خون ہو جاتا۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) وہ دوسرا مجرم کہاں ہے؟

بوائے : پولیس کی صورت دیکھتے ہی بھاگ گیا۔

عارف : غانم بھاگ گیا؟ پولیس کا اتنا خوف؟ کیا چوری کی تھی؟

افسر : کیوں جھگڑا ہوا؟

ہوٹل والا : اس کے ساتھی نے میرے نوکر کو مارا۔ جب میں نے منع کیا تو اس نے اپنے دوست کی طرفداری میں مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ خیر گذری کہ آپ آگئے۔ ورنہ یہ ہوٹل کی چیزوں کو بھی نقصان پہنچاتا اور میرا بھی گلا گھونٹ دیتا۔

افسر : (عارف سے) تم کون ہو؟

عارف : تم پولیس مین ہوکر صورت دیکھ کے آدمی کو نہیں پہچان سکتے۔ میں ایک

شریف آدمی ہوں۔

افسر : شریف آدمی جن روپیوں سے غریبوں، یتیموں، بیواؤں کی مدد ہو سکتی ہے، ان روپیوں کو شراب کی بھٹی میں نہیں جھونکتے۔ لڑکھڑاتے ہوئے سڑکوں پر نہیں پھرتے۔ ایسے گناہ اور ناپاکی بھرے ہوٹلوں میں روپیہ دے کر بدنامی نہیں مول لیتے۔ عزت اور خاندان کا خیال بھُلا کر نشہ میں بدمعاشوں کی طرح مار پیٹ نہیں کرتے۔ تم صورت سے شریف ہو لیکن حرکتوں سے کبھی شریف نہیں ہو۔ اپنے کو ان سپاہیوں کے حوالے کرو۔

عارف : کیا تم مجھے گرفتار کرو گے؟

افسر : ہاں میں تمھیں گرفتار کروں گا۔ اور رات بھر حوالات میں بند رکھنے کے بعد کل صبح بدمستی اور حملے کے جرم میں مجسٹریٹ کے سامنے تمھارا چالان کروں گا۔

عارف : تم اتنا اختیار نہیں رکھتے۔

افسر : پولیس کے پاس کتنا اختیار ہے، ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ (سپاہیوں سے) باندھ لو مشکیں۔

(سپاہی رسّی سے عارف کی مشکیں باندھتے ہیں۔ اسی وقت ایاز داخل ہوتا ہے)

ایاز : یہ کیا؟ کیا میں یہی نظارہ دیکھنے کے لیے گھر سے انھیں ڈھونڈھنے کے لیے نکلا تھا؟ (افسر سے) ایک شریف آدمی کو کیوں گرفتار کیا ہے؟

افسر : آدمی شراب پینے سے پیشتر شریف رہتا ہے۔ لیکن پینے کے بعد پاجی بن جاتا ہے۔ اسے بدمستی اور مار پیٹ کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔

ایاز : (عارف سے) دیکھ لیا غانم جیسے کمینوں کی دوستی کا نتیجہ۔ دیکھ لیا شراب پینے کا انجام۔ کہتے تھے کہ سانپ سے دوستی نہ کرو۔ کہتے تھے کہ زہر کو شربت سمجھ کے نہ پیو۔ باپ سے زیادہ محبت کرنے والے سسر نے سمجھایا۔ میں نے سمجھایا۔ پیروں پر سر رکھ کر اور رو رو کر بیوی نے سمجھایا۔ لیکن تم نے کسی کی

پکار اور کسی کی دہائی نہ سنی۔ آج اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ شریف باپ اور شریف گھرانے کے لڑکے ہوکر چور اور گرہ کٹ کی طرح رسیوں میں بندھے پولیس کے گھیرے میں کھڑے ہوئے ہو۔ ؎

نشہ لاتا ہے اپنے ساتھ ذلت اور خرابی کو
یہی عزت ملا کرتی ہے دنیا میں شرابی کو

افسر : جس کوٹھری میں چور اور بدمعاش بند ہوتے ہیں اسی کوٹھری میں بدمست شریفوں کو بند کرتے ہوئے ہمیں افسوس ہوتا ہے۔ لیکن خود ان شریفوں کو اپنے حال پر افسوس نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ دن کو مجسٹریٹ کی کچہری میں جرمانہ دینے کے بعد شراب کو لعنت سمجھ کر چھوڑ دیتے اور شام ہوتے ہی پھر اسی لعنت کو گلاسوں میں بھر بھر کے پینے لگتے ہیں۔

ایاز : خاندان اور آبرو کے دشمن، اپنی حالت دیکھو اور شرم کرو۔ جس بیوی نے تمھارے لیے گھر، باپ، بھائی، بہن، سب کو چھوڑ دیا۔ جب وہ یہ ذلت سنے گی تو اس کا کیا حال ہوگا؟ جب تم رسیوں میں بندھے ہوئے پولیس کے ساتھ بازار سے گذروگے تو دیکھنے والے کیا کہیں گے؟ ؎

یہی کہیں گے، نشے نے کیا خراب اس کو
چلی ہے لے کے حوالات میں شراب اس کو

افسر : (سپاہیوں سے) بڑھو۔

ایاز : ٹھہرو۔ یہ خون اور چوری کا نہیں معمولی لڑائی کا مقدمہ ہے۔ میں ملزم کی طرف سے ضمانت دینے کو تیار ہوں۔

افسر : ضمانت یہاں نہیں ہوسکتی، تھانے پر آؤ۔

ایاز : اے شراب کے متوالو، اے گھر، دولت، عزت برباد کرنے والو، ایک شریف کا حال دیکھو اور اپنے انجام پر غور کرو۔ ؎

نہ ڈسنے دو انھیں آجاؤ اب بھی تم حواسوں میں
بھرے ہیں سانپ بچھو بوتلوں میں اور گلاسوں میں

(پولیس کے ساتھ ہوٹل مالک، ایاز اور عارف کا جانا۔ زیاد، طارق اور ایک مصاحب کا آنا)

زیاد : (طارق سے) دیکھو، دروازے پر موٹر حاضر ہے؟

طارق : بہت خوب (دروازے کی طرف بڑھ کر رُکتا ہے) خداوند دیکھیے۔ پھول والی کے بھیس میں ایک پرستان کی پری چلی آتی ہے۔

زیاد : (دیکھ کر) کتنا شاندار حُسن۔ آج تک آنکھوں نے اتنی حسین صورت نہیں دیکھی۔

(لیلیٰ آتی ہے)

لیلیٰ : (حیرت سے) میں ایک شریف کا گھر سمجھ کر پھول بیچنے آئی تھی۔ لیکن یہ تو شراب خانہ معلوم ہوتا ہے چھی۔ چھی۔ کیسی گندی جگہ ہے۔ مجھے ابھی لوٹ جانا چاہیے۔

(لیلیٰ لوٹتی ہے۔ زیاد آگے بڑھ کر روکتا ہے)

زیاد : اچھا شعر، خوش رنگ پھول اور خوبصورت چہرہ کون نہیں پسند کرے گا۔ لیکن ان پھولوں سے زیادہ (گالوں کی طرف اشارہ کر کے) ان پھولوں میں دلفریبی ہے۔ بتاؤ ان کی کیا قیمت ہے؟

یہ دونوں چاند کے ٹکڑے بھی ہیں اور شمع محفل بھی
کرو سودا، میں زر بھی دوں گا، زر کے ساتھ یہ دل بھی

لیلیٰ : ہٹ جاؤ۔ دور ہو جاؤ۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ جگہ، جہاں میں دھوکے سے آگئی ہوں، اس شہر کا ناپاک دوزخ ہے۔ اور تم اس دوزخ کی لعنتی روح ہو۔

زیاد : غصہ بھی حسن کا زیور ہے۔ گالوں پر غصے کی سرخی آجانے سے تمھارا خوبصورت چہرہ اور بھی زیادہ خوبصورت ہوگیا ہے۔

ہاں کہو۔ کیا چاہیے دولت بھی ہے آرام بھی
بڑھ گیا جب حُسن تو بڑھ جائیں گے اب دام بھی

لیلیٰ : تم امیر ہو۔ ہم غریب ہیں۔ تم محلوں میں رہتے ہو، ہم جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ تم مخمل پہنتے ہو، ہم چیتھڑے پہنتے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ پیسے اور گناہ ایک جگہ جمع ہوسکتے مگر چیتھڑے اور نیکی، غریبی اور عصمت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ ؎

تمھیں زر تو ہمیں ایمان، ہمت اور قناعت دی
وہ تم نے بھی نہ پائی جو خدا نے ہم کو دولت دی
فقط بازار کی کتیا پھسل جاتی ہے پیسوں پر
جو عصمت دار ہے وہ تھوک دیتی ہے تم ایسوں پر

زیاد : پھول والی کی زندگی سے بیگم کی زندگی زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ میرے جیسا دولت مند آدمی تمھارے حُسن کی قدر کر رہا ہے۔

لیلیٰ : میں تمھیں دولت مند نہیں، ایک بھکاری سے بھی بدتر جانتی ہوں۔

زیاد : کیوں؟

لیلیٰ : کیوں کہ تم سونے چاندی کو اور میں شرافت اور نیکی کو دولت سمجھتی ہوں۔ ؎

وہ سُکھ تم کو نہیں، جو سُکھ ہے قسمت میں فقیروں کی
غریبوں سے بھی ہے تقدیر بدتر تم امیروں کی
تمھارا گھر ہے اصلی عیش کے سامان سے خالی
بھری ہے جیب تو کیا دل ہے جب ایمان سے خالی

زیاد : حسن بیچ کر تمھیں دولت اور عیش ملیں گے، لیکن پھول بیچ کر پہننے کے لیے موٹے کپڑے اور کھانے کے لیے سوکھی روٹی کے سوا اور کیا ملے گا۔

لیلیٰ : لالچ دینے والے شیطان منھ بند کر۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ خدا ایسے گنہ گاروں کو کس طرح معاف کرے گا۔ یہ تیرے ہی جیسے بدنیت بدکاروں کا ظلم ہے کہ ہزاروں غریب لڑکیاں جو بے زر، بے گھر، بے سہارا ہونے پر

بھی محنت مزدوری کرکے آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں، آج بازار کے کوٹھوں پر بیسوا بن کر اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت برباد کر رہی ہیں۔ ے

تری بدکاریاں ہی تیری دشمن، بدچلن ہوں گی
نہ تاک اوروں کا گھر تیرے بھی گھر میں ماں بہن ہوں گی

زیاد : تعجب ہے کہ پھول کی پنکھڑی سے شہد کے بدلے زہر ٹپک رہا ہے۔ لفظ کڑوے ہیں لیکن ہونٹ ضرور میٹھے ہوں گے؟

(لپٹا کر بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہے)

لیلیٰ : بدمعاشوں۔ پاجی...

زیاد : چُپ۔

(منھ بند کرکے زبردستی پیار لینا چاہتا ہے۔ انور اپنے دوستوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

انور : یہ کیا؟ حیوان آدمی۔ چھوڑ دے اسے۔ شرم ہے تم پر۔ مرد ہو کر ایک بے کس شریف لڑکی پر ظلم کرتے ہو۔

زیاد : ظلم سے بچنا تھا تو اسے خوبصورت چہرہ لے کر یہاں نہ آنا چاہیے تھا۔

انور : تو گویا عورت کا خوبصورت ہونا جرم ہے اور تم جیسے بدکار مرد اس جرم کی عورت کو سزا دینا چاہتے ہو۔

زیاد : چلے جاؤ۔ ورنہ میں گھونسا مار کر منھ بند کردوں گا۔

انور : تیرے گھونسوں کا جواب تجھے لوہے کے گھن سے دیا جائے گا۔

زیاد : کمینے۔

(انور پر حملہ کرتا ہے۔ انور کے گھونسوں سے بے دم ہوکر گر جاتا ہے۔ مصاحب مدد کو آتے ہیں)

طارق : خبردار۔

التمش : بس۔

(التمش اور جلال تلواریں کھینچ کر زیاد کے مصاحبوں کو روکتے ہیں۔ زیاد اٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور انور اُسے گھونسا مار کر پھر گرا دیتا ہے۔ لیلیٰ انور کے گلے میں فتح کا ہار پہنا دیتی ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ - پہلا سین

راستہ

(زیاد، اُس کے مصاحب اور غانم آتے ہیں)

زیاد : مقابلے کی طاقت نہ ہونے کا نام در گذر اور دل کی کمزوری کا نام رحم ہے۔ لومڑی شیر کو لات مار کر چلی جائے اور وہ دانت ناخن، غصہ اور طاقت رکھ کر منھ دیکھتا رہے؟ میرے غصے کا ٹھنڈا ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا دوزخ کا سرد ہو کر برفستان بن جانا۔

غانم : (طارق سے) سرکار کی اتنی ذلت اور تم سے کچھ نہ ہوسکا۔ اتنے دن سرکار کا نمک کھایا تھا یا گوبر؟

طارق : جو کچھ کیا، اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا تھا؟

غانم : کچھ نہ ہوسکا تو چلو بھر پانی میں ڈوب ہی مرتے۔ لیکن تم تو سینکڑوں گھڑے پڑجانے پر بھی مری ہوئی بھینس کی طرح اب تک پانی کے اوپر تیر رہے ہو۔

زیاد : تم سچ کہتے ہو۔ میرے تمام نوکر صرف دسترخوان پر روٹیاں توڑنا جانتے ہیں۔ ہاں تم نے اس کا کیا نام بتایا؟

غانم : کپتان انور۔

زیاد : وہ فوج میں ملازم ہے؟

غانم : جی ہاں۔ لڑائی میں بہادری کا بلا بھی پاچکا ہے۔ جب وہ اس بلّے کو چھاتی پر لگا کر نکلتا ہے، تب معلوم ہوتا ہے کہ بھوکے کوّے کی چونچ میں روٹی

لٹک رہی ہے۔

زیاد : وہ عارف کا کون ہوتا ہے؟

غانم : وہی جس کی شان میں سسرال کے ستائے ہوئے شاعر نے یہ شعر کہا ہے۔ ـ

ساری دہائی اک طرف، اور ایک اکائی اک طرف
ساری خدائی اک طرف، جو رو کا بھائی اک طرف

زیاد : سمجھ گیا۔ وہ رشتے میں عارف کا سالا ہے۔

غانم : سالا کہیے۔ ازار بندی بھائی کہیے۔ بھانجے کا ماموں کہیے۔ سرکاری نوٹ کی طرح سب نام چل سکتے ہیں۔

زیاد : وہ عارف کا عزیز ہو، خوفناک روح ہو، دیو ہو، شیطان ہو، کوئی ہو لیکن میں اس سے اپنی ذلت کا ضرور بدلہ لوں گا۔ تم ہی بتاؤ، کیا مجھے اس بے عزتی کا انتقام نہ لینا چاہیے؟

غانم : مجھ بیوقوف کی رائے پوچھتے ہیں؟ جناب دنیا میں دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بندر کی طرح سانپ کو سر سے پکڑ کر رگڑ رگڑ کر مار ڈالتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو کبوتر کی طرح بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرکے بیٹھ جاتے ہیں آپ کبوتر تو بن نہیں سکتے، اس لیے ضرور آپ کو بندر بننا پڑے گا۔

طارق : مجھے نہیں معلوم تھا کہ حضور کو اس قدر رنج پہنچا ہے۔ حکم دیجیے۔ ولی نعمت حکم دیجیے۔ وہ اب بھی آپ کے اشارے پر دن کی روشنی میں سربازار قتل ہوسکتا ہے۔

زیاد : یہ بدلہ لینے کا مناسب طریقہ نہیں ہے۔ میں اس سلطنت کا مالک نہیں صرف باج گزار رئیس ہوں۔ اس طرح مجھے عدالت کے کٹہرے میں اندر کھڑے ہوکر مجرم کی حیثیت سے خون کے الزام کا جواب دینا ہوگا۔

طارق : ہم جاں نثاروں کی موجودگی میں آپ پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ اور اگر ہوا کا رخ بدل بھی جائے تو دولت کے سامنے سب سر جھکا دیتے ہیں۔ آپ کا

روپیہ دو منٹ میں گواہوں کا بیان اور جج کا ایمان مول لے سکتا ہے۔

غانم : حضور۔ ان نیک نام کے گھسے میں نہ آیئے گا ورنہ آپ پھانسی کی رسی میں اس طرح لٹکتے دکھائی دیں گے جس طرح کھجور کے درخت میں تاڑی کا مٹکا جھولتا ہے۔

زیاد : غانم تم جانتے ہو کہ انعام کی بارش برسانے میں میرے ہاتھ بادل سے زیادہ سخی ہیں۔ تمھارے چہرے پر بلی کی غریبی مگر آنکھوں میں بھیڑیے کی آنکھوں کی چمک ہے۔ اس لیے تم اس معاملے میں مجھے اچھا مشورہ دے سکتے ہو۔ میرے پاس آنا۔ میں تمھاری رائے کو منھ مانگی قیمت پر خرید لوں گا۔

غانم : قدر دانی۔

(سب جاتے ہیں)

دوسرا ایکٹ - دوسرا سین

عارف کا مکان

(رشیدہ پریشانی میں ٹہل رہی ہے)

رشیدہ : رات کے وقت تاریک جنگل میں رستہ بھول گئے ہوئے مسافر کی طرح میری عقل مایوسی کے اندھیرے میں بھٹک رہی ہے۔ نہ آسمان پر تسلی کا ستارہ نظر آتا ہے، نہ زمین پر امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ زبان تھک گئی لفظ ختم ہوگئے۔ آنکھوں کے چشمے آنسو بہا بہا کر سوکھ گئے۔ لیکن ہائے پھر بھی وہ نظر اٹھا کر اپنے خوفناک انجام کی طرف نہیں دیکھتے۔ ؎

تقدیر پھن اٹھائے ہے ڈسنے کے واسطے
شعلے لپک رہے ہیں جھلنے کے واسطے
سر پر چمک رہی ہیں تباہی کی بجلیاں
بادل گھرے ہوئے ہیں برسنے کے واسطے

(عارف اور انور آتے ہیں)

عارف : بس زبان سے چھری کٹاری برسانا بند کرو۔ یہ نصیحت کا لہجہ نہیں اعتراض اور حملے کا لہجہ ہے۔

انور : آپ کی رائے بھی آپ کی طرح غلط راستے پر جا رہی ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں، محبت سے کہتا ہوں۔ دل کے دُکھ سے کہتا ہوں۔ اور آپ کی بہتری کے لیے کہتا ہوں۔

عارف : جب تمھارے باپ نے بیٹی کے ہاتھ اور گلے سے ہار اور چوڑیاں اُتروا کر اور داماد کو دروازے کا فقیر سمجھ کر گھر سے باہر کر دیا تھا، اس وقت آ کر اسے نصیحت نہ کی تھی اور آج مجھے نصیحت کرنے آئے ہو۔ میری نظر میں تمھاری نصیحت اتنی ہی ذلیل و حقیر ہے، جتنا تمھارا باپ بے رحم اور سنگ دل ہے۔

انور : آپ میرے بزرگ والد کی شان میں بہت سخت اور کڑوے لفظ استعمال کرتے ہیں۔

عارف : سچے لفظ کڑوے ہی ہوتے ہیں۔

انور : میرے صبر کا امتحان نہ لیجیے۔ کوئی شریف بیٹا، باپ کے گوشت، خون سے پیدا ہو کر باپ کی بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا۔

عارف : میں اوپر سے فرشتہ اور اندر سے شیطان نہیں ہوں۔ میرا دل اور زبان ایک ہے۔ منہ پر کہتا ہوں اور صاف صاف کہتا ہوں۔ اگر تم صاف اور سچ سن سکتے ہو تو یہاں ٹھہرو اور نہیں سن سکتے تو باہر نکل جاؤ۔

رشیدہ : (قریب آ کر) یہ کیا کہہ رہے ہو اور کس کو کہہ رہے ہو؟

عارف : رشیدہ۔ میں گھر بیچ کر سٹے کھیلتا ہوں، شرابیں پیتا ہوں، پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوکر کچہری میں جرمانہ دیتا ہوں۔ دنیا بھر کے گناہ اور برائیاں کرتا ہوں لیکن تمھیں اس گنہہ گار اور برے شوہر کے ساتھ جینا اور مرنا ہے تو جس طرح باپ کو چھوڑ دیا، اسی طرح آج سے بھائی کو بھی چھوڑ دینا ہوگا۔

رشیدہ : غریب کا قصور؟

عارف : کچھ نہیں۔

رشیدہ : پھر؟

عارف : شوہر کا حکم۔

انور : بجلی سے جھلس گئے ہوئے درخت کی طرح چہرہ کیوں مرجھا گیا؟ ابھی اس سے بھی بدتر دن دیکھوگی۔ اور اس سے بھی بدتر حکم سنوگی۔

عارف : تم محبت کو نفرت کا سبق پڑھا رہے ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ چلے جاؤ۔

انور : بدنصیب بہن۔ مصیبت آنے سے پہلے انسان کی عقل خراب ہوجاتی ہے۔ یہ

حالت دیکھ کر مجھے خوف ہوتا ہے کہ ایک دن نشے کا دیوانہ پن خاندان کی آبرو اور شرم کو لات مار کے تمھیں بھی گھر سے نکال دے گا۔ ۔

یہ نہ ہو سکھ کی طرح عزت کو بھی کھو کر چلو
آج میں بھی رائے دیتا ہوں کہ اپنے گھر چلو

رشیدہ : بھائی۔ شادی ہوجانے کے بعد شریف لڑکی کے دو ہی ٹھکانے ہیں۔ شوہر کا گھر یا قبر کا کونا۔ وہ بیاہ کا جوڑا پہن کر پالکی میں شوہر کے گھر آتی ہے اور کفن پہن کر جنازے کے اندر شوہر کے گھر سے نکلتی ہے۔ ۔

ہوں گے جدا نہ ہرگز ہم ان سے اور یہ ہم سے
لکھی گئی ہے قسمت دونوں کی اک قلم سے

انور : اچھا تو خدا کی مرضی۔ تم آنے والی مصیبتوں پر رونا اور باپ اور بھائی تمھاری بدبختی پر روئیں گے۔

(انور کا جانا)

عارف : آنکھوں کے کنارے پر آنسوؤں کے قطرے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا بھائی سے جدا ہونے کا رنج ہوا ہے؟

رشیدہ : میرے سرتاج۔ جس دن لڑکی بیوی بن کر اپنے گھر سے پرائے گھر میں قدم رکھتی ہے، اسی دن وہ باپ، ماں، بھائی، بہن، اپنے بیگانے، سارے زمانے سے زندگی بھر کے لیے الگ ہوجاتی ہے۔ ۔

میں سب کو چھوڑ بیٹھی، میرا سکھ اور آسرا تم ہو
مری تقدیر اک کشتی ہے جس کے ناخدا تم ہو
تمھاری ہی خوشی میں یہ کنیز باوفا خوش ہے
کہ جس بیوی سے شوہر خوش رہے اس سے خدا خوش ہے

(ایاز باہر سے آتا ہے)

ایاز : حضور یہ کیا۔ خود میاں انور سے سنا، پھر بھی یقین نہیں آتا۔ کیا واقعی آپ نے ایک سچے خیر خواہ اور سچے ہمدرد کو گھر میں آنے سے منع کر دیا؟

عارف : ہاں ۔ وہ اسی سلوک کے قابل تھا۔

ایاز : تو اس سلوک سے یہ ظاہر ہوا کہ جو بری صلاح دے وہ آپ کا دوست اور جو نیک مشورہ دے، وہ آپ کا دشمن ہے۔

عارف : وہ بک بک کرکے گیا، اب تم بکنے آئے ہو۔

ایاز : افسوس ہے کہ آپ خیرخواہ کی نصیحت کو بکواس سمجھتے ہیں۔ جاگیے۔ اب بھی نیند سے جاگیے۔ ستر ہزار میں صرف تیس ہزار کی رقم باقی رہ گئی ہے۔ اگر شراب خوری اور سٹے بازی میں یہ رقم بھی ختم ہوگئی تب باقی زندگی کے دن کس سہارے سے کاٹیے گا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر فقیروں کی طرح کس کے دروازے پر جاکر مدد کے لیے آواز دیجیے گا۔ ـ

مفلسی کے وقت پوچھے گا نہ کوئی بات بھی
گو ابھی دن ہے، مگر ہے دن کے پیچھے رات بھی
روئیے گا اک نوالے، ایک کمبل کے لیے
آج ہے قبضے میں کچھ، رکھ چھوڑیے کل کے لیے

عارف : میں سٹے کے ذریعے اپنی کھوئی ہوئی دولت دوبارہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ کل کا خیال کروں تو آج کی کوئی کوشش نہیں ہوسکتی۔ ـ

بیج بونے جا رہا ہوں پھول اور پھل کے لیے
سوچ لوں گا پھر کسی دن بیٹھ کر کل کے لیے

(اُٹھ کر چلا جاتا ہے)

رشیدہ : جو تھا غلطی سے کھو چکے۔ اور جو ہے وہ بھی لالچ اور امید میں کھو دینا چاہتے ہیں۔ ایاز تم باپ کی جگہ ہو۔ گھر کے بزرگ ہو، خاندان کے خیرخواہ ہو۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ حال تباہ ہوچکا۔ مستقبل کو تباہ ہونے سے بچاؤ۔ ـ

مرجاؤں گی، دیکھا جو انھیں رنج و محن میں
وہ دن نہ کہیں آئے کہ ہو چاند گہن میں

ایاز: اگر قسمت اپنی مہربانیوں کی قیمت مانگتی ہو تو میں تمھارے شوہر کی بہتری کے لیے اس دنیا کی کمائی ہوئی نیکیاں اور اس دنیا کی نجات تک دینے کو تیار ہوں۔ کہو میری بچی۔ کہو۔ میں کیا کروں؟

رشیدہ: میں کیا بتاؤں، جو ممکن ہو۔ جو تم سے ہوسکتا ہو۔ ب

خیال آنے سے کانپتی ہوں کہ کیسے گذرے گی کیا کریں گے
بھلے ہو تم، کچھ کرو بھلائی، جئیں گے جب تک دعا کریں گے

ایاز: جو میں سوچتا ہوں وہی یہ سوچ رہی ہے۔ تھیلی کے پنجرے کی تیلیاں ٹوٹ چکیں۔ روپیوں کو شراب اور سٹے کے پر لگ چکے۔ نصف سے زیادہ اڑ گئے اور باقی بھی چند دن میں اُڑ جائیں گے... کیا کروں۔ (سوچتا ہے) بس یہی آخری راستہ ہے۔

(غور کرتا ہوا چلا جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ - تیسرا سین

عارف کی خواب گاہ

(عارف پلنگ پر سو رہا ہے۔ سرہانے کی تجوری، اور پائنتی کی طرف بوتل اور گلاس رکھے ہیں۔ کھڑکی سے چاند کی روشنی کمرے میں آ رہی ہے۔ ایاز دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتا ہے)

ایاز : (خود کلامی) حرکت اور عمل کی دنیا میں سناٹا چھا گیا۔ حواسوں کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ پتلیوں نے آنکھ کی کھڑکیاں بند کر کے ان پر پلکوں کی چلمنیں گرا دیں۔ قدرت جاگ رہی ہے یا شب بیدار چاند جاگ رہا ہے۔ (آہستہ آہستہ جاکر عارف کے سرھانے سے کنجی لیتا، الماری کھولتا اور تمام نوٹ نکال لیتا ہے) یہی ہے وہ چیز جس کے ذریعے احمق انسان گناہوں کی منڈی میں جاکر اپنے دوزخ کے لیے ایندھن خریدتا ہے۔ اسی کے لیے ایک قوم دوسری قوم پر جنگ کے نام سے ڈاکہ ڈالتی ہے۔ اسی کے لیے زمین دار اور سوداگر بے زبان کسانوں اور مزدوروں کو حیوانوں سے بدتر حالت میں رکھتے ہیں۔ اسی کے لیے آدمی اپنے آپ کو، دنیا کو، خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی کے لیے شریف کمینوں کی اور عالم جاہلوں کی خوشامد کرتے ہیں۔ ؎

یہی ہے وہ شجر جس میں غرور و ظلم پھلتے ہیں
یہی سانچہ ہے جس میں موت کے اوزار ڈھلتے ہیں
یہی چشمہ ہے جس میں آدمیت ڈوب جاتی ہے
یہی سوتہ ہے جس سے جرم کے دریا نکلتے ہیں

(ایاز نوٹ لے کر جاتا ہے۔ عارف خواب میں ڈر کر جاگ اٹھتا ہے)

عارف : (اپنے آپ سے) اُف۔ اُف۔ یہ کیا ہے؟ تین روز سے برابر بھیانک خواب میری آرام کی نیند پر حملہ کر رہے ہیں۔ آنکھ بند ہوتے ہی دماغ خوف و دہشت کی مخلوق پیدا کرنے میں مشغول ہوجاتا ہے۔ آج بھی دیکھا کہ غانم نے میرے گلے میں خوش رنگ پھولوں کا ہار پہنایا۔ جس کے تمام پھول تھوڑی ہی دیر میں زہری بچھو بن گئے۔ اور سب کے سب مجھے ڈنک مارنے لگے۔ (کھلی تجوری پر نظر پڑتی ہے) میرے خدا۔ تجوری کس نے کھولی؟ (دوڑ کر دیکھتا ہے) یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ تیس (۳۰) ہزار میں سے تیس (۳۰) پائیاں بھی نہیں۔ میں پھر خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ قسمت مجھ سے ٹھٹھا تو نہیں کر رہی ہے۔ (پھر تجوری دیکھتا ہے) بالکل خالی۔ ایک روپیہ بھی نہیں۔ میں سوکھے پھول میں خوشبو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کس نے لیا؟ چاند کی روشنی اور ہوا کے سوا باہر سے کون آیا۔ آہ میں، گھر، رشیدہ سب تباہ ہوگئے۔ دولت بھی گئی اور دولت کے ساتھ آخری اُمید بھی گئی۔

(پلنگ پر گرتا ہے۔ اَیاز دوبارہ آتا ہے)

ایاز : (خود کلامی) ارادہ تھا کہ تیس ہزار میں سے تیس کوڑیاں بھی نہ چھوڑوں۔ لیکن ناگہانی آفت سے پاگل ہوجائے گا اس لیے پانچ ہزار کے نوٹ الماری میں دوبارہ رکھ دیتا ہوں۔

(عارف ایاز کو تجوری میں نوٹ رکھتے ہوئے دیکھتا ہے)

عارف : کون؟ یہ کون؟ (دوڑ کر ہاتھ پکڑ لیتا ہے) چور۔ لٹیرے۔ (پہچان کر) ایاز۔ (ہاتھوں میں نوٹ دیکھ کر) اور یہ کیا؟ (چھین کر گنتا ہے) ہزار ہزار کے تیس میں سے صرف پانچ۔ ایاز۔ باقی نوٹ؟ نہیں سنا (جھنجھوڑ کر) میں تم سے پوچھتا ہوں۔ باقی نوٹ۔

ایاز : میں نہیں جانتا۔

عارف : سانپ کی طرح رینگتے ہوئے آکر نشے میں سوئے ہوئے مالک کو ڈسنا جانتا ہے۔ خدا اور ضمیر کی موجودگی میں ایمان کا گلا گھونٹنا جانتا ہے۔ دوزخ کے گھر کا کرایہ ادا کرنے کے لیے چوری کرنا جانتا ہے۔ لیکن نوٹوں کا حال نہیں جانتا۔ نہیں جانتا۔ تب تجوری سے کہاں گئے؟

ایاز : تجوری میں ان لوگوں کے روپے رہتے ہیں، جن کو غریبی کا خوف اور کل کی فکر ہے۔ نوٹ نہیں ملتے تو جاؤ غانم کی جیب میں تلاش کرو۔ سٹے کے بازار میں دیکھو۔ شراب کی بوتلوں میں ڈھونڈو۔ ؎

کچھ سنبھالو، کچھ رکھو، دن رات سمجھاتا رہا
آج کیوں ہے زر کا غم، خوش ہو اگر جاتا رہا

عارف : بس نمک حرام کتے۔ نوٹ دے کر میرے غصے اور انتقام سے رحم مانگ۔ تو نے روپے نہیں چرائے۔ ڈوبتے کا سہارا، پیاسے کا پانی، بیمار سے زندگی کی اُمید چھین لی۔ ؎

سمجھ لیا ہے کہ ٹھگ لوں گا صرف باتوں سے
نکال، ورنہ نکلواؤں گا میں لاتوں سے

(ایاز کی گردن پکڑ کر گرا دیتا ہے)

ایاز : جلتے ہوئے درخت پر جانور اور فضول خرچ کی تجوری میں روپے کبھی نہیں ٹھہرتے۔ جو روپے شراب اور سٹے میں کل برباد ہونے والے تھے، سمجھ لو آج ہی برباد ہوگئے۔ ؎

قدر صحت کی بشر کرتا ہے بیماری میں
زر ہے کیا چیز سمجھ جاؤ گے ناداری میں

عارف : معلوم ہوا کہ لوہے کو نرم کرنے کے لیے آگ میں تپانا ہوگا۔ (کھونٹی سے ہنٹر اتار کر لاتا ہے) تیری ایمان داری کے ساتھ میرے رحم کا بھی خاتمہ

ہوچکا۔ آستین کے سانپ، شہد کی چُھری، نکال نوٹ۔ (ہنٹر مارتا ہے) نکال۔ (پھر مارتا ہے)

ایاز : تمھیں میری خدمت کی شرم نہ ہو لیکن مجھے تمھارے نمک کی شرم ہے۔ مار ڈالو۔ میں اپنا خون تک معاف کرتا ہوں۔

عارف : ان ہنٹروں کے بعد پولیس کی ہتھکڑی اور پھر جیل کی نوبت آئے گی۔ آخری ذلت سے بچنا چاہتا ہے تو روپے واپس دے۔ نہیں سنتا۔ تب یوں ہی سنے گا۔ (لگاتار ہنٹر مارتا ہے) کور نمک، ٹھگ، کمینے۔

(رشیدہ گھبرائی ہوئی آتی ہے)

رشیدہ : (خود کلامی) رات کے وقت کیسا شور۔ (ایاز کو پٹتے دیکھ کر) ارے گھر کے بزرگ سے یہ سلوک۔ کیا کرتے ہو۔ ٹھہرو۔ (ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

عارف : ہٹ جاؤ۔ شیطان شریف آدمی کا چہرہ لگا کر آج تک ہمیں دھوکا دے رہا تھا۔ اس نمک حرام نے ہم سے بھیک منگوانے کے لیے تمام روپے چوری کر لیے۔

رشیدہ : چوری۔ ایاز نے؟ ناممکن۔ جیسے قطب شمالی میں افریقہ کے ریگستان کی گرمی، سفید دودھ میں کالا پھین، گلاب کے درخت میں دھتورا پیدا نہیں ہوسکتا، ویسے ہی ایاز کے دل میں کبھی دغابازی نہیں آسکتی۔ ؎

وفاداروں سے جرم ایسا ہوا ہے اور نہ ہوتا ہے
کبھی پیتل نہ نکلے گا حقیقت میں جو سونا ہے

عارف : قبر تیار ہوچکی پھر بھی موت کا یقین نہیں ہوتا۔ (ایاز سے) دغاباز میں تیری پچھلی خدمتوں اور بڑھاپے کا خیال کرکے اب بھی معاف کردوں گا۔ بول روپے کہاں چھپائے ہیں ـــــــ نہیں بولتا ـــــــ معلوم ہوا تو حوالات میں پولیس ہی کے پوچھنے سے جواب دے گا۔ گناہ گار۔ چل اپنے دوزخ میں۔

(پولیس میں لے جانے کے لیے ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہے)

رشیدہ : ٹھہرو۔ پولیس کے حوالے نہ کرو۔ ہم ان کی محبت اور خدمت کے قرض دار ہیں۔ اگر انھوں نے چُرا ہی لیے ہیں تو یہ سمجھو کہ آج ان روپیوں سے ان کا پچھلا قرض ادا ہوگیا۔ ؎

محسنوں کی قدر کرنا فرض ہے انسان کا
یہ سمجھ کر چھوڑ دو بدلہ دیا احسان کا

عارف : چپ رہو۔ جب یہ مجھ پر رحم نہیں کرتا تو میں بھی اس پر رحم نہیں کروں گا۔ (پھر کھینچتا ہے) حرام زادے۔ آگے بڑھ۔ (دروازے کی طرف ریلتا ہے)

رشیدہ : سنو۔ سنو۔

عارف : الگ ہٹ۔

(رشیدہ عارف کے جھٹکنے سے گرتی ہے اور عارف ایاز کو کھینچتا ہوا لے جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ - چوتھا سین

شمیم کا مکان

(غانم کا آنا)

غانم : (خود کلامی) چلو چھٹی شُد۔ قسمت جھاڑو دے کر صندوق اور جیب کا سارا کوڑا کرکٹ اٹھا لے گئی۔لوگ سچ کہتے ہیں کہ تیرہ کی گنتی منحوس ہوتی ہے۔پانچ ہزار کے نوٹ عارف کی جیب سے ہتھیائے۔ پانچ ہزار مکان بکوانے کے کمیشن میں جھپٹے اور تین ہزار سٹے کے حساب میں ہاؤ ہپ کیے۔ سمجھا تھا کہ اس تیرہ ہزار میں کم از کم تیرہ مہینے چین کی بانسری بجے گی۔ لیکن آج صبح شراب اور شامت مل کر جوئے خانے میں کھینچ لے گئیں اور تین ہی گھنٹے کے الٹ پھیر میں تیرہوں ہزار کا صفایا ہوگیا۔ اب اس مال زادی شمیم سے کچھ اینٹھوں تب کام چلے گا۔ بھئی واہ کیا گڑھی گڑھائی الو کی پٹھی مل گئی ہے۔یہ اوروں کے لیے رنڈی ہے۔ مگر میرے لیے کرنسی بینک ہے۔ ارے سامنے سے وہی ماں بیٹی لڑاکا مرغیوں کی طرح ایک دوسرے کو چونچیں مارتی چلی آ رہی ہیں۔ چھپ کر ان کی چخ سننی چاہیے۔

(غانم آڑ میں ہوجاتا ہے۔ شمیم اور نسیمہ جھگڑتی ہوئی آتی ہیں)

شمیم : کیا؟ کیا کہا؟

نسیمہ : سچ کہا۔ کرچکی تو رنڈی کا پیشہ۔ دیکھ لینا ایک دن کسی کے گھر میں۔ برتن مانجھے گی یا کسی رئیس کے بچے کھلائے گی۔

شمیم : دیکھو غصہ دلا کر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھوؤ۔ میں تمھاری روزی کا ٹھیکرا ہوں۔

نسیمہ : یہ ٹھیکرا سلامت رہے یا ٹوٹ جائے مگر میں سو مرتبہ کہہ چکی اور پھر کہتی ہوں کہ جب تک یہ اٹھائی گیرا غانم اس گھر میں آتا جاتا رہے گا تب تک یہ گھر کبھی نہ بسے گا۔

غانم : (سائڈ میں) آہا۔ بڑھیا کیا محبت سے میری تعریف کر رہی ہے۔

شمیم : میں پوچھتی ہوں کہ آخر بے چارے غانم میں کیا برائی ہے۔ تمھارے گھر کا سودا لاتا ہے۔ نوکر چاکر پر رعب رکھتا ہے اور خرچ کا حساب لکھتا ہے۔ دکھ بیماری میں خدمت کرتا ہے۔ ایک شریف آدمی سے اور کیا امید رکھتی ہو؟

نسیمہ : مفت کی لونڈی مفت کا کھانا، مفت کی حکومت ملے تو شہر میں ایسے سینکڑوں شریف نکل آئیں گے۔

غانم : (سائڈ میں) پُرانی خرانٹ ہے۔ اس لیے پتے کی کہتی ہے۔

شمیم : بس رہنے دو۔ اگر محبت کرنا بُرا ہے تو تم اس کالے کلوٹے موٹر ڈرائیور پر ابھی تک کیوں جان دیتی ہو۔ نوچیوں کی ماسٹر نانکہ۔ جو تم سکھاؤ گی وہی ہم سیکھیں گے۔

نسیمہ : اسی دن کے لیے ناچنا گانا، اسامی پھنسانا سکھایا تھا۔ چار پیسے کمانے کے لائق ہوئی تو اب ماں کو جوتی کی نوک پر مارتی ہے۔ اپنی ستیاناسی چاہتی ہے تو جا ستیاناس ہو۔ (چلی جاتی ہے)

شمیم : دیکھو۔ اس نمک حرام پھا پھا کٹنی کو۔ میری ہی کمائی کھاتی ہے اور مجھ ہی کو کوستی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس ماں کا جھونٹا پکڑ کر ابھی گھر سے باہر کر دوں۔

غانم : (سامنے آنے کے بعد) یہ صلاح تو میں بھی دیتا ہوں۔ اب تم خود شیطان کی اماں ہو۔ تمھیں ماں کی کیا ضرورت ہے۔

شمیم : ہاں جی۔ میں دیکھتی ہوں کہ اس کے ساتھ زیادہ دن نہیں نبھے گی۔

غانم : اسی لیے تو کئی بار تم سے کہا کہ نقدی اور زیور کا بکس بغل میں دبا کر

میرے گھر میں بیوی بن کے بیٹھ جاؤ۔ کوئی نیا باپ ڈھونڈھ کر ماں کو اس کے حوالے کر دو۔

شمیم : ہوں۔ میں بیوی بن کر تمھارے گھر میں چولھا پھونکوں اور تم میرے ہی روپیوں سے اور جگہ گل چھرّے اڑاؤ۔ نہیں رے باوا۔ پھول کی بہار ڈالی تک۔ اور رنڈی کی قدر رنڈی کے گھر تک ہے۔ میں یہیں اچھی ہوں۔

غانم : (سائڈ میں) بڑی سیانی چڑیا ہے۔ جال پھینکتا ہوں مگر پھندے توڑ کر نکل جاتی ہے۔

شمیم : بڑھیا تمھیں روز برا بھلا کہتی تھی۔ آج میں نے بھی ایسی کھری کھری سنائی کہ منھ ہی بند ہوگیا۔ کہو خوش ہوئے نا؟

غانم : جیتی رہو۔ تم تو مجھے ہمیشہ خوش رکھتی ہو۔ مگر دیکھو کل سے ایک قرض دار میرے لیے وارنٹ لیے پھر رہا ہے۔ اگر اس کا قرض ادا کرنے کے لیے اس وقت صرف ایک ننھی سی رقم یعنی فقط دو سو روپیے دے دو تو ڈبل خوش ہوجاؤں گا۔

شمیم : تم تو بہانہ بنانے میں رنڈیوں اور مانگنے میں فقیروں سے بھی آگے بڑھ گئے ہو۔ اب تک ہزاروں روپے دے چکی۔ کہاں تک تمھارا بھرنا بھروں گی۔

غانم : تو کون سا کشیدہ کاڑھ کے یا چکی پیس کے پیدا کرتی ہو۔ مفت میں آتا ہے اور مفت میں جاتا ہے۔ تم لوگوں کا مال کھانے کے لیے ہی تو ہم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔

شمیم : مگر دوں کہاں سے؟ دو ہزار روپے تھے، ان کا ماں نے سونا خرید لیا۔ اب تو کوڑی بھی نقد نہیں ہے۔

غانم : نقدی نہیں ہے تو یہ گلے کا ہار اتار کر دے دو۔

شمیم : واہ۔ ایک بیوقوف اپنی بیوی کے گلے سے اتار کر مجھے دے گیا اور میں احمق بن کر تمھیں دے دوں۔

غانم : تو کیا ہوا۔ دنیا میں انسان نما گدھوں کی کمی نہیں۔ کوئی نیا بیوقوف آکر پھر بنوا دے گا۔

شمیم : بس بہت دے چکی۔ سونے کا ہار کیا، تانبے کا چھلا بھی نہ دوں گی۔
غانم : اچھا تو پھر یارانہ ختم۔ جاؤ تین طلاق۔
شمیم : یہ کیوں؟
غانم : میں روپے لیے بغیر رنڈی سے محبت نہیں کرتا۔
شمیم : رنڈیوں کو دھمکا کر روپیہ لینا، یہ شریفوں کا کام ہے؟
غانم : جیسے کمرے میں آنے سے پہلے جوتا اتار دیا کرتے ہیں ویسے ہی میں بھی اپنی شرافت کو دروازے کے باہر ہی چھوڑ کے رنڈی کے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔
شمیم : تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمھیں دیکھے بغیر مر جاؤں گی۔ کوڑی نہ دوں گی۔ جاؤ۔
غانم : اچھا اب مجھے بلانے کے لیے کسی کو نہ بھیجنا۔ میری خوبصورتی سلامت رہے، تمھاری جیسی سینکڑوں پاؤں دبائیں گی۔
شمیم : (سائڈ میں) بگڑ گیا۔
غانم : (سائڈ میں) سوچ رہی ہے۔ پھنسے گی۔ (مخاطب ہوکر) تو سن لیا۔ آدمی بھی نہ بھیجنا اور ادھر سے گذروں تو کھڑکی سے آدھا دھڑ نکال کر بات سننے کے لیے قسمیں بھی نہ دینا۔
شمیم : منھ دھو رکھو۔ جب تمھیں میری پروا نہیں تو مجھے بھی تمھاری پروا نہیں۔
غانم : اچھا تو میں چلا۔ تھو ہے تیری محبت پر۔ (جانا چاہتا ہے)
شمیم : سنو سنو۔ (غانم رکتا ہے) ظالم۔ تو تو سرکاری آدمی کی طرح محبت کرنے کا مجھ سے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ (ہار اتار کر) بے ایمان لے۔
غانم : ایمان دار لا۔

(شمیم ہار دیتی ہے، اسی وقت نسیمہ آجاتی ہے)

نسیمہ : یہ کیا؟ آج پھر چپکے سے زیور اتار کر دے رہی ہے۔ ارے کیوں محبت میں اندھی بن رہی ہے۔ یہ تو گھر میں ڈاکو گھسا ہے۔ تجھے لوٹ کر رستے کی فقیرنی بنا دے گا۔

شمیم : لوٹتا ہے تو لوٹنے دے۔ تجھے کیا۔ میں اپنی کمائی دیتی ہوں۔ تیری کمائی تو نہیں لٹاتی۔

نسیمہ : ارے موئے تو نے میری لڑکی پر کیا جادو کر دیا۔ یہ ڈاکوؤں کے ہتھکنڈے چھوڑ دے۔ نہیں تو میں تیرا گھر میں گھسنا بند کر دوں گی۔

غانم : سنتی ہو۔ یہ پاؤں سے اتار کر پھینکی ہوئی جوتی ہی سر چڑھ کر بول رہی ہے۔

شمیم : کیا کہا۔ گھر میں گھسنا بند کر دے گی۔ بڑی بند کرنے والی۔ بند تو کر اگر اپنے ہی باپ کی بیٹی ہے۔

نسیمہ : یہ جواب۔ ارے میں تیری ماں ہوں۔

شمیم : چل چل۔ تیری جیسی ماں ہزار ملے گی۔ یہ کہاں ملے گا؟

غانم : (سائڈ میں) بڑھیا سے بدلہ لینے کا یہی موقع ہے۔ (روتی آواز میں) بس جی بس۔ میں بھولا بھالا آدمی ہوں۔ کسی دن تمھاری ماں مجھے کھانے میں زہر دے دے گی۔ میں اب نہیں آؤں گا۔

شمیم : نہیں نہیں۔ خفا نہ ہو۔ تمھیں میری قسم۔ (ماں سے) حرام زادی قحبہ۔ تو میرے سکھ کا ستیاناس کرنا چاہتی ہے۔ ابھی چولھے میں سے جلتی لکڑی لاکر منھ جھلس دوں گی۔

نسیمہ : آشنا کے لیے ماں کو گالیاں دیتی ہے۔ ابھی مارے جوتیوں کے منھ سلپٹ کر دوں گی۔

غانم : سن لیا۔ تیرا ہی کھائے گی اور تجھی کو جوتیاں لگائے گی۔ دے کھینچ کر منھ پر طمانچہ۔

شمیم : نکل میرے گھر سے۔ اسی ایک کپڑے سے نکل۔ مردار۔ کتیا۔ (ماں کو دو ہتھو مارتی ہے)

نسیمہ : ارے تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ تجھ پر کھڑے قد بجلی گرے۔ (غانم سے) موئے تو نے میرا ستیاناس کیا۔ خدا تیرا ستیاناس کرے گا۔ ہائے ہائے۔ پاجی کے پلے نے میری گانے بجانے کی ڈفلی چھین لی۔

غانم : بس اب ہمیشہ دب کر رہے گی۔ آؤ اب کمرے میں بیٹھ کر اس کے رونے پر قہقہہ مار کر ہنسیں۔

(نسیمہ روتی ہوئی جاتی ہے)

شمیم : پیارے۔ کمرے میں وہ نگوڑا ناظم بیٹھا ہے۔ تم تھوڑی دیر...

غانم : کیا تھوڑی دیر؟ تم نے تو کہا تھا کہ میں نوچ کھسوٹ کر ناظم کو دھتا کروں گی؟

شمیم : کیسے دھتا کروں؟ وہ تو رکھائی کو بھی ادا سمجھتا ہے۔

غانم : یہ جھائیں چھپتے رہنے دو۔ صاف کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے ناظم سے محبت ہو گئی ہے۔

شمیم : ارے یہی تو ہم رنڈیوں کی بدقسمتی ہے۔ کہ جو جو پیار کریں، روپیہ دیں، ناز اٹھائیں ان سے محبت نہیں کرتے۔ ہم تو تم جیسوں سے محبت کرتے ہیں، جو ہمارا ہی مال کھائیں اور ہم ہی کو جوتیاں لگائیں۔

غانم : اچھا بخشو۔ جاؤ تمھارے اکلوتے چہیتے یاد کر رہے ہوں گے۔ (جانا چاہتا ہے)

شمیم : (ہاتھ پکڑ کر) اے ہے۔ تم تو بگڑتے ہی گھوڑے کی طرح رسیاں تڑانے لگتے ہو۔

غانم : اور تم بھی تو بھوکی گھوڑی کی طرح جس نے گھاس کا سٹھا دکھایا، اسی کے ساتھ ہو لیتی ہو۔

شمیم : جان۔ بس دیکھو بس دس منٹ باہر چکر لگا آو، میں ابھی اُس بھوت کو دو انجروں میں گھر سے بھگاتی ہوں۔

غانم : اچھا تو دس سے گیارہ منٹ نہ ہو۔ ورنہ واپس آ کر تھپڑوں سے منھ کا پاوڈر اڑا دوں گا۔

شمیم : (جاتے جاتے) بڑے ظالم ہو۔

غانم : دنیا میں ڈاکوؤں اور رنڈیوں دونوں کا ایک پیشہ ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ڈاکو گلی کونے میں چھاپے مارتے ہیں اور یہ کھلے بازار ڈاکہ ڈالتی ہیں۔

وہ گپ چپ لوٹتے ہیں اور یہ سارنگی طبلہ بجا کر لوٹتی ہیں۔ ان کی کمائی چوری کا مال خریدنے والے ہضم کرتے ہیں اور ان کا مال ہم جیسے بے فکرے ہڑپ کرتے ہیں۔ انکی نصیب میں عیش لکھا ہے تو کیوں نہ ہڑپ کریں۔ رنڈیوں کا مال کھانا ایسے ویسوں کا نہیں قسمت والوں کا کام ہے۔

(ہنستا ہوا جاتا ہے۔ شمیم اور ناظم آتے ہیں)

ناظم : سمجھ گیا۔ تم بچھو کی اولاد ہو۔ لاکھ پیار کرو لیکن تم ضرور ڈنک ماروگی۔

شمیم : اپنے پیار کو ناس کی ڈبیا میں بند کرکے رکھو۔ جب ضرورت ہو ایک چٹکی نکال کر سونگھ کیا کرنا۔

ناظم : وہ محبت کی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں کدھر گئیں؟

شمیم : بادل میں بیٹھ کر ہوا کھانے۔

ناظم : وہ کبھی نہ بجھنے والی پیار کی پیاس کہاں گئی؟

شمیم : ہوٹل میں سوڈا پینے۔

ناظم : شمیم میری بیوی اس قدر خوبصورت ہے کہ تیرا چہرہ اس کے پیر کے ناخن کی برابری بھی نہیں کرسکتا۔ اور اتنی نیک اور وفادار ہے کہ حوریں دیکھ دیکھ کر عش عش کرتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے مجھ پر اور میرے جیسے احمقوں پر جو بیوی کو اس کے حق کی محبت تک نہیں دیتے۔ اور رنڈی پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ تو ایسی جھوٹی اور اتنی بے وفا ہے۔

شمیم : آج سمجھے بھی تو جلد سمجھے۔ میرے عقل مند، بے وفائی اور جھوٹ ہی کا دوسرا نام رنڈی ہے۔ اگر ہم میں سچی محبت اور وفاداری ہوتی تو بازار کی بیسوا اور گھر کی شریف بیوی میں کیا فرق ہوتا۔ ہمارے پاس صرف جھوٹا دل، جھوٹی ہنسی، جھوٹا پیار ہے جسے ہم بازار میں بیٹھ کر بیچتے ہیں اور تم جیسے آنکھوں والے اندھے عقل اور روپیہ دے کر خریدتے اور خوش ہوتے ہو۔

ناظم : میں نے چار مہینے میں روپیوں اور زیوروں سے تیرے بکس بھر دیے۔ دو

مہینے میں ایک مکان خرید دیا۔ اس کے چند روز بعد دو ہزار کی گھوڑا گاڑی خرید دی۔ تھوڑے روز ہوئے بیوی کے گلے کا ہار دے دیا۔ ان احسانوں کا یہ انعام کہ میرا سیٹھ آگیا ہے، چلے جاؤ۔ اچھا جاتا ہوں۔ شریف ہوں تو کبھی نہ آؤں گا۔

شمیم : بڑے بڑے شریفوں کو دیکھ لیا ہے۔ بگڑتے ہیں، تنتے ہیں، قسمیں کھاتے ہیں۔ اور دو ہی دن کے بعد آکر رنڈی کے پاؤں پڑتے ہیں۔

ناظم : وہ نکٹے ہوں گے لیکن میں ناک والا ہوں۔ اب آؤں تو اس اونچی ناک ہی پر تھوک دینا۔

شمیم : اچھا دیکھ لوں گی۔ دوبارہ جھک مارنے آئے تو ناک پر تھوکنا کیسا، منھ پر پورا پیک دان الٹ دوں گی۔

ناظم : افسوس مجھے اس نتیجے کی ذرا بھی خبر نہ تھی۔

شمیم : آج تو خبر ہوگئی۔ کان کھول کر سنو۔ رنڈی کا یار، سدا خوار۔ ؎

یہی انجام تم جیسوں کا آخر کار ہوتا ہے
زباں پر اُف گلے میں جوتیوں کا ہار ہوتا ہے

ناظم : شیطان کی بچی۔ میں ضرور تجھ سے بدلہ لوں گا۔

شمیم : شیطان کے ماموں۔ بس چل دو۔ نہیں تو جھاڑو مار کر گھر سے باہر کردوں گی۔

(گانا)

کسی رنڈی کے پھندے میں آنا نہیں۔
بے وفاؤں سے دل کو لگانا نہیں

دغا دِل میں ہے منھ سے چاہ کا اظہار کرتے ہیں
زمانہ حُسن کو اور ہم ٹکوں کو پیار کرتے ہیں

دل لگانا کبھی ہم نے جانا نہیں۔ کسی رنڈی....

یہ صورت بھولی چڑیوں کو پھنسا لینے کا پھندا ہے
چڑی ماروں کا اور ہم رنڈیوں کا ایک دھندا ہے
میٹھی باتوں کے دھوکے میں آنا نہیں۔ کسی رنڈی....

یہی انجام تم ایسوں کا آخر کار ہوتا ہے
زباں پر اُف گلے میں جوتیوں کا ہار ہوتا ہے
شرم ہو تو کبھی منہ دکھانا نہیں۔ کسی رنڈی....

(ناظم کا جانا)

دوسرا ایکٹ - پانچواں سین

ایک ٹوٹا پھوٹا گھر

(رشیدہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے چکی پیس رہی ہے)

رشیدہ : پیاری چکی۔ تو عورت کے لیے صبح کی ورزش ہے۔ تنہائی میں باتیں کرنے والی سہیلی ہے۔ امیری میں دل بہلانے کا مشغلہ ہے۔ غریبی میں روٹی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ پیاری چکی سحر کے دھندھلکے میں جب تیری گھمر گھمر کی رسیلی آواز چڑیوں کے گانے اور کلیوں کے چٹکنے کی آواز میں مل کر کانوں میں گونجتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج کے مشرقی محل کے ڈیوڑھی پر صبح کی نوبت کے ساتھ شہنائی بج رہی ہے۔ یا قدرت کاہلی اور نیند کو سلانے کے لیے میٹھے سُروں میں لوریاں دے رہی ہے۔ یا زندگی دن کے چہل پہل کے خیر مقدم کا گیت گا رہی ہے۔ گائے جا۔ گائے جا۔ پیاری چکی وہی گانا جو تو نے دنیا کی سب سے پہلی عورت کے ساتھ مل کر گایا تھا۔ اور جسے دنیا کی پیدائش کے روز سے آج تک ایک سُر اور ایک لے میں گاتی رہی۔ اب بھی گائے جا۔

غریبی اور مصیبت میں دلاسا تجھ سے پاتی ہوں
ترے گانے میں اپنے دکھ کا رونا بھول جاتی ہوں

(لیلیٰ آتی ہے)

لیلیٰ : (اپنے آپ سے) کیسی صبر والی، اتنی مصیبت پر بھی نہ خدا کو الزام دیتی ہے، نہ

شوہر کی شکایت کرتی ہے۔ (پاس جاکر) بہن تم تھک گئی ہو۔ لاؤ میں پیس دوں۔

رشیدہ : لیلیٰ بہن۔ میں اپنے اچھے دنوں میں امیر کی لڑکی اور امیر کی بہو ہونے پر بھی آج کل کی امیر لڑکیوں کی طرح گھر کا کام کرنا اور نوکر چاکر کا ہاتھ بٹانا عیب نہیں سمجھتی تھی۔ اس لیے محنت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کیا تم باہر جا رہی ہو؟

لیلیٰ : ہاں۔ گلوبند تیار ہوگیا ہو تو دے دو۔ ایک بیگم صاحب نے اپنے بچے کے لیے خریدنے کا وعدہ کیا ہے۔

رشیدہ : تمھیں اپنے غریب پڑوسیوں کی کتنی فکر ہے۔ (گلوبند نکال کر دیتی ہے) یہ لو۔ کل ساری رات چراغ کے سامنے آنکھیں پھوڑیں، تب خدا خدا کر کے پورا ہوا۔ دام کی کمی بیشی کا خیال نہ کرنا۔ کیونکہ ـــــ گھر میں ـــــ پانچ چھ آنے پیسوں اور تھوڑے گیہوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

لیلیٰ : کیسے افسوس کی بات ہے کہ بیوی تندرستی اور آرام کا خیال تج کر چھ بجے دن سے بارہ رات تک محنت و مزدوری کرکے ڈیڑھ دو روپیہ پیدا کرتی ہے اور شوہر ان محنت کے روپیوں میں سے شراب کے دام چھین لے جاتا ہے۔ بہن کیا انھیں کبھی سمجھ نہ آئے گی؟

رشیدہ : سمجھ ہی آگئی ہوتی تو ایاز جیسے خیرخواہ کو غصے اور جلدبازی میں محض شک پر پولیس کے حوالے کیوں کرتے۔ اور اس بے گناہ کو چوری کے جرم میں عدالت سے چھ مہینے کا جیل کیوں ہوتا۔ سمجھ ہی آگئی ہوتی تو چوری کے بعد بچے ہوئے پانچ ہزار بھی تین ہی مہینے کے اندر جوئے اور شراب میں کھو کر کوڑی کوڑی کو محتاج کیوں ہو جاتے۔ ؎

مری جانب سے رخ تقدیر کے سورج نے پھیرا ہے
اسی سے سب کے گھر میں دن، مرے گھر میں اندھیرا ہے

(رشیدہ آنسو بھری آنکھوں سے اندر جاتی ہے۔ لیلیٰ دروازے کی طرف بڑھتی ہے کہ انور آجاتا ہے)

لیلیٰ : کون؟ غریبوں کے مددگار۔ میرے محسن۔

انور : حیرت۔ تم اور یہاں؟

لیلیٰ : میں اسی غریب محلے میں، اسی گھر سے ملے ہوئے گھر میں رہتی ہوں اور دن میں ایک دو مرتبہ اپنی پڑوسن کی خیریت پوچھنے آجایا کرتی ہوں۔

انور : تم اس مکان میں رہنے والوں کو کب سے جانتی ہو؟

لیلیٰ : جب سے میرے پڑوس میں کرائے پر گھر لیا ہے۔ میاں بڑا ہی ناسمجھ لیکن بیوی بے حد نیک ہے۔ مجھے اس کی خدمت سے بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔

انور : تم تو خود غریب ہو۔ پھر کیا خدمت کرتی ہوگی؟

لیلیٰ : میرے پاس روپیہ نہیں لیکن انسانیت اور ہمدردی ضرور ہے۔ میں اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں بازار میں بیچ آتی ہوں اور جو کچھ ملتا ہے اسی سے وہ غریب اپنا گزارہ چلاتی ہے۔

انور : جتنا چہرہ خوبصورت، اس سے زیادہ دل خوبصورت۔ نیکی و رحم کی پتلی، میں اس بے لوث ہمدردی کا اپنی بدنصیب بہن رشیدہ کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

لیلیٰ : کیا آپ میری سہیلی رشیدہ کے بھائی ہیں؟ آپ کا نام؟

انور : دنیا مجھے کپتان انور کہتی ہے۔ لیکن تمھارے ہونٹوں سے صرف انور سن کر خوش ہوں گا۔

لیلیٰ : (اپنے آپ سے) کیسا پیارا نام۔ یہ معلوم ہوا کہ کان کے پاس سے بلبل گاتی ہوئی نکل گئی۔

انور : تمھاری دکھیا سہیلی کہاں ہے؟

لیلیٰ : ابھی کسی کام سے اندر گئی ہے۔

انور : تو میں وہیں جاکر مل لیتا ہوں۔ (جاتے جاتے) کوئی میرے لائق خدمت ہو تو یاد کرنا۔ (جاتا ہے)

لیلیٰ : کتنا فیاض۔ احسان کرکے احسان کا بدلہ کیسا شکریہ بھی نہیں چاہتا۔ وہ عورت دنیا میں بڑی ہی خوش نصیب ہوگی جسے اس شریف آدمی کی بیوی بننے کا فخر حاصل ہوگا۔

(لیلیٰ جاتی ہے اور رشیدہ اندر سے باہر آتی ہے)

انور : بہن جب تم شوہر کے ظلم کو ظلم نہیں سمجھتیں تو اس دکھ کو دکھ بھی نہ سمجھتی ہوگی۔

رشیدہ : دکھ کہاں ہے؟ کیا اس ٹوٹے پھوٹے گھر کا نام دکھ ہے۔ کیا اس پھٹے پرانے کپڑے کا نام دُکھ ہے؟ ایسا ہے تو پھر دنیا سے دکھ کا مٹ جانا بہت ہی سہل ہے۔ گھر کو ڈھا دو، دکھ ہی مٹ جائے گا۔ کپڑوں میں آگ لگا دو۔ دکھ بھی جل کر خاک ہوجائے گا۔ پیارے بھائی دُکھ سُکھ سے نہیں جاتا بلکہ سُکھ کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں دنیا کی کسی چیز کی خواہش نہیں ہے، اس لیے کوئی دُکھ نہیں ہے۔

انور : مصیبت کے بوجھ سے کندھے ٹوٹے جارہے ہیں۔ پھر بھی کہتی ہو کہ کوئی دُکھ نہیں ہے۔

رشیدہ : ہاں کوئی نہیں۔ ذرا بھی نہیں۔ ؎

نہ کھانا ہے، نہ کپڑا ہے، نہ زیور ہیں، نہ پیسے ہیں
مگر پھر بھی ہیں خوش جس حال میں ہیں اور جیسے ہیں
زمانے بھر کا سُکھ اک لفظِ شوہر میں سمایا ہے
وہیں دنیا کی راحت ہے، جہاں شوہر کا سایا ہے

انور : بہن میرے زخم پر نمک نہ چھڑکو۔ میں دنیا کے بُرے سے بُرے آدمی کی تعریف سن سکتا ہوں لیکن اس احمق، اندھے، نابکار شوہر کی تعریف سن کر غصے کو ضبط نہیں کرسکتا۔

رشیدہ : بس بھائی بس۔ بیوی کے سامنے شوہر کو ایسے بُرے لفظوں سے یاد نہ کرو۔ وہ کچھ بھی ہوں لیکن میرے لیے بہشت کی امید کی طرح پیارے، مذہب کی طرح پاک اور خدا کے نام کی طرح قابلِ عزت ہیں۔ ؎

بنی ہے اور بنے گی دو جہاں میں میری بات اُن سے
یہاں ہے آبرو اُن سے، وہاں ہوگی نجات اُن سے

اگر معبود برحق کے سوا سجدہ روا ہوتا
تو شوہر ہی خدا کے بعد عورت کا خدا ہوتا

انور : میں اس گھر میں قدم نہ رکھنے کے عہد کو توڑ کر تمھاری محبت سے تمھیں سمجھانے آیا تھا۔ آج فیصلہ کر لیا کہ تم کبھی نہ سمجھوگی۔ قسمت نے تمھاری عقل پر تالا لگا کر اس کی کنجی سمندر میں پھینک دی ہے۔ اچھا یہ لو۔

(انور رشیدہ کو ایک لفافہ دیتا ہے)

رشیدہ : اس میں کیا ہے؟

انور : پانچ سو روپے کا نوٹ۔ اسے وقت اور ضرورت کے لیے رکھ چھوڑو۔

رشیدہ : انور۔ معاف کرو۔ میں ان کی اجازت کے بغیر یہ نوٹ نہیں لے سکتی۔ میری محنت کے پیسے میری ضرورت کے لیے بس ہیں۔

انور : یہ کسی غیر کا روپیہ نہیں ہے۔ رہنے دو۔ وقت پر کھوٹا پیسہ بھی اشرفی کا کام دیتا ہے۔ خدا تم پر رحم کرے۔

(انور جاتا ہے اور رشیدہ روتی ہے)

رشیدہ : نوٹ لے جاو۔ سنو سنو ـــــ نہیں لیا ـــــ کہاں سے آیا؟ کس نے دیا؟ میرے حکم کے بغیر کیوں لیا۔ ان سوالوں کی بارش کے ساتھ ان کا غصہ گرجنے لگا تب کیا جواب دوں گی ـــــ خیر سوچوں گی۔ (نوٹ تکیے کے نیچے رکھ دیتی ہے۔ اسی وقت عارف شراب پیے ہوے آتا ہے) یا خدا پھر وہی حالت۔

عارف : نشہ۔ نشہ کس کو نہیں ہے؟ کسی کو دولت کا نشہ ہے، کسی کو خوبصورتی کا نشہ ہے، کسی کو علم کا نشہ ہے، کسی کو حکومت کا نشہ ہے۔ یہ نشے برے نہیں تو بوتل کا نشہ کس طرح بُرا ہوگیا ـــــ رشیدہ۔

رشیدہ : اب انھیں کیا کہوں۔

عارف : ادھر آؤ۔

رشیدہ : صبح جب ہاتھ جوڑ کر روتی ہوئی میں تمھارے پیروں پر گر پڑی تھی، تب تم نے میرا سر چھاتی سے لگا کر اور آنسو پونچھ کر وعدہ کیا تھا کہ اب سے شراب نہ پیوں گا۔ اور پھر پی لی ـــــ اور ـــــ پھر پی لی۔

عارف : ہاں۔

رشیدہ : کیوں؟

عارف : شروع میں بھول سے پی۔ پھر دوستوں کی خوشی کے لیے پی۔ اس کے بعد زندگی کا مزہ سمجھ کر پیتا رہا۔ اور اب غم بھلانے کے لیے پی رہا ہوں۔ نہ پیوں گا تو مصیبت پاگل کر دے گی۔

رشیدہ : لونڈی مالک کو سمجھا سکتی ہے۔ حکم نہیں کرسکتی۔ صبح سے ابھی تک کہاں تھے؟

عارف : جہاں دکھ کی دوا بکتی ہے وہیں۔ اور دوا کے دام لے کر پھر وہیں جاؤں گا۔ لاؤ کچھ روپیہ دو۔

رشیدہ : روپیہ۔

عارف : کہہ دو کہ نہیں ہے۔

رشیدہ : پرسوں بچاری لیلیٰ نے گلوبند اور موزے بیچ کر چار روپے لا دیے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ روپے کے گیہوں منگائے۔ دو روپے آج صبح تم لے گئے۔ اب اور روپے کہاں سے آئیں؟

عارف : تو کچھ نہیں ہے؟

رشیدہ : صرف آٹھ آنے باقی رہ گئے ہیں۔

عارف : اچھا تو وہی لاؤ ـــــ نہیں سنا کیا؟ ـــــ کان بہرے ہوگئے ہیں؟

رشیدہ : گھر میں تھوڑے سے گیہوں ہیں جو آج شام تک ختم ہوجائیں گے۔ یہ پیسے بھی نہ رہے تو کل ہمیں فاقہ کرنا ہوگا۔

عارف : فاقے کا بہانہ کیوں بناتی ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ مجھے شوہر پیارا نہیں، پیسہ پیارا ہے۔

رشیدہ : چھی چھی۔ یہ کیا کہتے ہو۔ تم اگر میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنو تو میں اسے بھی اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ (اٹھنّی لا کر دیتی ہے) خفا

ہو گئے۔ یہ لو۔

عارف : قسمت بدل گئی۔ دنیا بدل گئی اور اب یہ دیکھتا ہوں کہ تو بھی بدلتی جارہی ہے۔ (جانے کے لیے اٹھتا ہے)

رشیدہ : ٹھہرو۔ تم نشے میں کہاں چلے ہو؟

عارف : غم جاگ اٹھا ہے۔ اس کو سلانے کے لیے اور پیوں گا۔

رشیدہ : تو نہیں جانے دوں گی۔ دولت کھو چکے، عزت کھو چکے، اب کیا پی پی کر جان بھی کھو دوگے؟

عارف : ہٹ جاؤ۔ تم کو میرے ساتھ مرنا نہیں پڑے گا۔

رشیدہ : میرے مالک، میرے سرتاج، قسمت کی چھری پر سان نہ دو۔ دیکھو۔ میں پاؤں تھام کر منت کرتی ہوں۔

عارف : میں شراب خانے کے رستے کے سوا سب رستے بھول چکا ہوں۔ پاؤں چھوڑ دو۔

رشیدہ : جیسے مغرور امیروں کی گاڑیاں غریبوں کو کچلتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ ویسے ہی تم بھی مجھے روند کر چلے جاؤ۔ لیکن میں خود سے کبھی یہ پاؤں نہ چھوڑوں گی۔

عارف : یہ التجائیں۔ فرماں برداری کی آڑ میں مرد پر عورت کی حکومت ہے۔

(لات مار کر چلا جاتا ہے۔ رشیدہ سر جھکا کر روتی ہے)

دوسرا ایکٹ - چھٹا سین

راستہ

غانم : چوری کے جرم میں ایاز کو چھ مہینے کا جیل ہونے کے بعد عارف نے نڈر ہوکر باقی پانچ ہزار بھی میری رائے پر چل کر چند ہی دنوں میں ختم کر دیے۔ اور جس دن روپیے ختم ہوئے، اس دن سے میں نے بے رس کام سمجھ کر اس سے ملنا جلنا بھی ختم کر دیا۔ سوچ رہا تھا کہ اب کسی کے ساتھ نیکی کرکے ثواب کماؤں، اتنے میں یہ تازہ مردہ زیاد اپنی قبر ڈھونڈتا ہوا مل گیا۔ پیٹنٹ شریف ہوں تو چند ہی دن میں اس کا بھی کفن تک بیچ کے کھا جاؤں گا۔ بھئی واہ۔ میرا نصیب بھی ڈاک گاڑی کا انجن ہے۔ آرام کے جنکشن کے سوا غریبی اور مفلسی کے اسٹیشن پر ٹھہرنا ہی نہیں چاہتا۔

(غانم جانے کے لیے مڑتا ہے۔ سامنے سے شکستہ حالت میں عارف داخل ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے ہیں)

عارف : غور سے کیا دیکھ رہے ہو۔ جس طرح خود غرضی سے تمھاری آنکھیں اور دغاباز دل بدل گیا ہے، اسی طرح مصیبت اور غریبی سے میری صورت اور حالت بدل گئی ہے۔ پھر بھی میں وہی عارف ہوں یہ پہچاننا مشکل نہیں ہے۔ البتہ تم وہی غانم ہو یہ پہچاننا بہت مشکل ہے۔

غانم : تو میں آج سے ماتھے پر اپنے نام اور پتے کا سائن بورڈ لگا کر پھرا کروں گا۔

عارف : خیال ہے؟ ہم دونوں آج کتنے دنوں بعد ملے ہیں؟

غانم : کیا خبر۔ میں کیا جیل خانے کا قیدی ہوں جو سزا پانے اور رہا ہونے کی تاریخ یاد رکھوں۔

عارف : غانم۔ جب تک میرے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، تب تک تم کتے کی طرح دُم ہلاتے ہوے میرے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ اور اب میری صورت دیکھتے ہی اُس سانپ کی طرح جو ڈس کر بھاگنا چاہتا ہو، چھپنے کے لیے بل ڈھونڈھنے لگتے ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ انسان اتنا دغاباز اور اتنا بے ایمان ہوتا ہے۔

غانم : تو کیا تمھاری یہ مرضی تھی کہ جیسے اندھا اندھے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بھیک مانگتا ہے، ویسے ہی میں بھی تمھارے ساتھ دو اندھوں میں ایک روٹی کی صدا لگاتا پھرتا۔

عارف : شرم کر۔ شرم کر۔ ان لفظوں کو سن کر شیطان بھی اپنے کو انسان سے بہتر سمجھنے لگے گا۔

غانم : دیکھو۔ جس دن ایاز کو چھ مہینے کا جیل ہوا تھا، اس دن تمھاری بیوی نے غصے اور جوش میں مجھے آستین کا سانپ لٹیرا، یار مار، گلا کاٹو سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ جس کا میں ایک دن ضرور بدلہ لوں گا۔ اور آج تم میری عزت اور شرافت کے سر پر چپت لگا رہے ہو۔

عارف : میں تجھے آج کئی روز سے ڈھونڈھ رہا تھا۔ تسلی اور مدد مانگنے کے لیے نہیں، صرف یہ کہنے کے لیے کہ جب قدرت کا قانون نیک انسانوں کو بھی ان کی بھول کی سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا، تب تیرے جیسے بدکار اپنی بدی کا بدلہ پانے سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ عنقریب لعنت اور بد دعا کی گھٹائیں تیرے سر پر برسیں گی اور تو تنکے کی طرح گناہ کے پرنالوں میں بہتا ہوا دوزخ میں جا کر گرے گا۔ (چلا جاتا ہے)

غانم : دوزخ۔ ہا۔ ہا۔ دوزخ میں بھی پہنچا تو مزہ ہی رہے گا۔ کیونکہ وہاں پہلے ہی سے میرے بڑے بڑے پرانے دوست موجود ہیں۔

(زیاد مصاحبوں کے ساتھ آتا ہے)

زیاد : کیوں غانم۔ تمھارا وعدہ کب پورا ہوگا؟ بدلہ لینے کی تدبیر سوجھی؟ حامی بھرنے کے وقت فصاحت و بلاغت خرچنے میں حاتم سے زیادہ سخی اور ایفائے وعدہ کے وقت قارون سے زیادہ کنجوس۔

غانم : تو کیا واقعی یہ غصے کی آگ جو اتنے دنوں سے حقے پر رکھی ہوئی چلم کی طرح سلگ بھی رہی ہے اور دھواں بھی دے رہی ہے، انور کے خون ہی سے ٹھنڈی ہوگی؟

زیاد : ہاں۔ انور کے خون ہی سے۔

غانم : یہ آخری فیصلہ ہے؟

زیاد : آخری فیصلہ۔ اس کا سامنا ہونے پر اپنی پچھلی ذلت کا خیال کرکے میری آنکھیں نیچی ہوجاتی ہیں۔ ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے، ہونٹ سوکھ جاتے ہیں، ہر طرف سے نامرد، بزدل، کم ہمت کی آوازیں آ آکر کان کے پردے سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ بتاؤ یہ روح کی تکلیف اور دل کی ملامت کہاں تک برداشت کرسکتا ہوں۔ بس یا مجھے ہمیشہ کے لیے یہ شہر چھوڑ دینا ہوگا یا اُسے مرنا ہوگا۔

غانم : مگر جناب اُسے مرنے کا ڈر ہوتا تو فوج میں نوکری ہی کیوں کرتا۔ وہ تو جان کو ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ جیسے میوہ فروش ٹوکری میں انگور بیچتے پھرتے ہیں۔

زیاد : پھر؟

غانم : سنیے۔ انسان کو مال سے زیادہ جان اور جان سے زیادہ عزت عزیز ہوتی ہے۔ وہ یتیموں اور غریبوں پر اپنا تمام مال بانٹ دے گا۔ ملک اور قوم کے لیے جان قربان کر دے گا۔ لیکن اپنی عزت کبھی دوسروں کو نہ دے گا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جان اور مال سے عزت زیادہ قیمتی چیز ہے۔ آپ کو بدلہ لینا ہے تو جان کے بجائے اُس کی عزت پر حملہ کیجیے۔

زیاد : اس سے فائدہ؟

غانم : فائدہ یہ کہ تلوار کے گھاؤ سے ایک منٹ میں مرجائے گا لیکن عزت پر چوٹ پڑی تو اس کو رنج اور شرم سے ہر روز مرنا ہوگا۔

زیاد : ٹھیک رائے دے رہے ہو۔ لیکن حملہ کا طریقہ؟

غانم : انور کی سگی بہن رشیدہ جو عارف کو بیاہی گئی ہے، اس ملک کی عورتوں میں جوانی اور خوبصورتی کا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ ایسی جوان جیسے چودھویں کا پورا چاند اور ایسی خوبصورت جیسے موسم بہار کا کھلا ہوا تازہ پھول ـــــ آگے کہوں ـــــ یا سمجھ گئے؟

زیاد : چاند کی طرح جوان اور پھول کی طرح خوبصورت۔ سمجھ گیا۔ تم چاہتے ہو کہ خوشبو، رنگت اور رس لوٹ کر اس حُسن کے پھول کو تباہ کر دیا جائے۔

غانم : ہاں یہ خوفناک بدلہ ہے۔ بہن کی بے عزتی کے بعد انور کبھی آپ کے سامنے آنکھیں اونچی کرکے بات نہ کرسکے گا۔ جس دن رشیدہ کی عصمت تباہ ہوگی، اُس دن انور کی ہمت، زندگی اور خوشی بھی تباہ ہوجائے گی۔

زیاد : لیکن رشیدہ نہ شوہر سے بے وفا ہے، نہ دولت اور عیش کی حریص۔ پھر کس طرح ہمارے قبضے میں آسکتی ہے؟

غانم : جہاں دولت اور طاقت کام نہیں دیتی وہاں دھوکا کام دیتا ہے۔ انعام مقرر کیجیے۔ میرا ایک ہی فقرہ اس خوبصورت ہرنی کو بھوکے شیر کے منھ میں پہنچا دے گا۔

زیاد : اگر تم دھوکا دے کر رشیدہ کو میرے محل میں لے آئے تو میں اس خدمت کے عوض تمھیں دس ہزار روپیہ انعام دوں گا۔

(زیاد جاتا ہے)

غانم : (اپنے آپ سے) اوہو۔ دس ہزار۔ بے ایمانی کے درخت میں ایک ساتھ اتنے پھل نکل آئے۔ ایمان دار رہتا تو دس ٹکے بھی نصیب نہ ہوتے۔

(غانم بھی جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ - ساتواں سین

زیاد پاشا کا محل

(زیاد شراب پی رہا ہے۔ سامنے زرق برق پوشاک میں خوبصورت نوجوان لڑکیاں ناچ رہی ہیں)

زیاد : گانا، عورت، شراب، یہی تین میٹھے سُر ہیں جن سے زندگی کا راگ پورا ہوتا ہے۔ اور دل و جذبات کے نغمہ آفریں تصادم کی آواز، روح کی تان، پھولوں کا الاپ اور ستاروں کا گیت معلوم ہوتی ہے۔

(غانم آتا ہے)

غانم : واہ رے میں۔ لایئے انعام۔ کانٹا ڈالتے ہی مچھلی پھنس گئی۔

زیاد : پھنس گئی۔ کس طرح؟

غانم : پہلے بھوکی جیب میں انعام کا نوالہ تو ڈالیے۔

زیاد : روپے سائیکل پر بیٹھ کر بھاگے نہیں جاتے۔ کیا تمھیں میرے وعدے پر بھروسہ نہیں ہے؟

غانم : معاف کیجیے۔ اس شریف زمانے میں لوگوں کا وعدہ شرابی کی توبہ کی طرح پانچ منٹ میں ٹوٹ جاتا ہے۔ اچھا سنیے۔ میں بے باپ کے بچے کی طرح روتی صورت بنا کر رشیدہ کے سامنے گیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہا کر.....

زیاد : ٹھہرو۔ پتھر سے پانی نہیں آگ نکلتی ہے۔ پھر تمھاری آنکھوں میں آنسو کہاں سے آئے؟

غانم : رشیدہ کے دل پر اثر ڈالنے کے لیے آنکھوں میں پسی ہوئی لال مرچی ڈال لی تھی۔

زیاد : اچھا آنسو بہا کر کیا کہا؟

غانم : میں نے کہا مجھے دیکھ کر غصے اور نفرت سے منھ نہ پھیرو۔ میں صرف تمھاری بے بسی اور بے کسی کا خیال کر کے یہ غم ناک اطلاع دینے آیا ہوں کہ عارف شراب کے نشے میں موٹر کے نیچے دب گیا ہے۔ اور ایک رحم دل بیگم جو گاڑی میں اس طرف سے گزر رہی تھیں، اسے زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے مکان پر لے گئی ہیں۔

زیاد : تم نے یہ کہا کہ عارف موٹر کے نیچے دب گیا ہے ؟

غانم : ہاں۔ پھر میں نے کہا کہ آخری دیدار کرنا ہے تو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اس نیک بیگم کے گھر تک چلی چلو۔ دیر کی تو شوہر سے دنیا کے بدلے جنت میں ملاقات ہوگی۔

زیاد : تو کیا وہ شوہر کی محبت میں پاگل ہو کر تمھارے ساتھ چلی آئی؟

غانم : نہ آتی تو میں اسے وفادار بیوی ہی نہ سمجھتا۔

زیاد : میں تمہاری پیٹھ ٹھوکتا ہوں۔ شاباش۔

غانم : اجی ابھی تو آپ سیکڑوں مرتبہ شاباش دیں گے۔ میرے جیسے آدمی گھڑی گھڑی پیدا نہیں ہوتے۔ میں تو مرنے کے بعد قبر کے بدلے عجائب گھر کی الماری میں رکھا جاؤں گا۔

زیاد : تو وہ کہاں ہے ؟

غانم : دروازے پر گاڑی میں۔ میں شکار کو لاتا ہوں۔ بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑنے کو تیار رہیے۔

زیزد : (غانم کے باہر جانے کے بعد) کیسا زہری آدمی ہے۔ سانپ کو ڈس لے تو وہ بھی پانی ہو کر بہہ جائے۔

(زیاد آڑ میں ہو جاتا ہے اور غانم رشیدہ کو لے کر آتا ہے)

رشیدہ : کہاں ہے میرا مالک۔ میرا سرتاج کہاں ہے۔

ہجوم اشک و حسرت سے ہے ایک طوفان آنکھوں میں
دکھا دو شکل کھنچ کر آ گئی ہے جان آنکھوں میں

غانم : یہاں ٹھہرو۔ میں بیگم صاحب کو تمہارے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔

(اندر جاتا ہے)

رشیدہ : اف دماغ گھوم رہا ہے۔ آسمان و زمین کے بیچ میں ہر چیز اس طرح دکھائی دیتی ہے ۔گویا چکر کھائے ہوے دھویں کے ڈھیر میں آگ کی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں چمک رہی ہیں۔

کہوں کس سے کہ اس تقدیر نے کیا پائمالی کی
تو ہی سنتا ہے یا رب خیر کچھ میرے والی کی

(زیاد سامنے آتا ہے)

یہ کون؟ وہ بیگم کہاں ہیں؟ یا خدا اس طرح مجھے کیوں گھور رہا ہے؟

زیاد : (پاس جاکر) ڈر کر پیچھے کیوں ہٹ گئیں؟ اطمینان رکھیے یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔

رشیدہ : جناب میں اپنے شوہر کو جو موٹر سے زخمی ہوگئے ہیں، لینے آئی ہوں۔ مہربانی فرماکر یہ بتایئے کہ وہ کس کمرے میں ہیں؟ —— آپ ہنستے کیوں ہیں؟

زیاد : اس لیے کہ آپ میرے مکان کو زخمیوں کا اسپتال سمجھ رہی ہیں۔ اس گھر میں میرے دل کے سوا، جو ان بھوؤں کی تلواروں اور نگاہ کی چھریوں سے گھائل ہوگیا ہے، اور کوئی زخمی نہیں ہے۔

رشیدہ : تو کیا دغاباز، کمینہ غانم مجھے دھوکہ دے کر یہاں لایا ہے؟

زیاد : دنیا خود دھوکا ہے۔ اس لیے یہاں کا ہر کام دھوکے ہی سے چلتا ہے۔

رشیدہ : سمجھ گئی۔ آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا دور ہوگیا۔ بدمعاش غانم۔ شریفوں

کے آرام و آبرو کے دشمن خدا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

(رشیدہ واپس جانا چاہتی ہے۔ زیاد روکتا ہے)

زیاد : ٹھہرو۔ کہاں جاتی ہو؟

رشیدہ : میں اپنے گھر جاؤں گی۔ راستہ چھوڑ دیجیے۔

زیاد : چھوڑ دوں۔ خوب۔ مرتے ہوئے کو زندگی، مفلس کو دولت، فقیر کو بادشاہت مل جائے، تو کیا وہ اُسے چھوڑ دے گا۔ کسی کے اندھیرے گھر میں آسمان سے چودھویں کا چاند اُتر آئے تو کیا وہ اسے فوراً لوٹ جانے دے گا؟ ۔

آو بیٹھو۔ نور کی محفل یہ کاشانہ بنے
تم بنو شمع وفا، دل میرا پروانہ بنے

رشیدہ : خبردار۔ میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا سایہ بھی نہ ڈالنا۔

زیاد : کیوں؟

رشیدہ : یہ گلی گلی عزت بیچنے والی مردار کا ہاتھ نہیں، ایک عصمت دار شریف عورت کا ہاتھ ہے۔ اس ہاتھ کو شوہر کے سوا دنیا کے کسی مرد کو چھونے کا حق نہیں ہے۔ ۔

جب خدا نے جلوہ گاہ آب و رنگ پیدا کیا
عشق اور ایثار سے عورت کا دل پیدا کیا
باوفا رہتی ہے بیوی زندگی بھر کے لیے
ہاتھ کیا، دل، روح سب ہیں صرف شوہر کے لیے

زیاد : شوہر۔ کون شوہر؟ مفلس شرابی عارف؟ وہی شوہر جو تم سے زیادہ شراب کی بوتل سے پیار کرتا ہے۔ وہی شوہر جس کی شراب کا قرض ادا کرنے کے لیے یہ نازک نرم انگلیاں گلوبند اور موزے بنتی اور سوئیوں سے زخمی ہوتی ہیں۔ وہی شوہر جس کا پیٹ بھرنے کے لیے چاند سے تراش کر بنائے ہوئے ہاتھ چکیاں پیستے ہیں۔ ۔

وہی شوہر کہ جس کے واسطے پلکیں بھگوتی ہو
وہی شوہر جو ہنس دیتا ہے جب تم دکھ سے روتی ہو
نصیب اپنا خود اپنے آنسوؤں سے کیوں بھگوتی ہو
پڑی ہو خاک میں پر اب بھی تم خوش آب موتی ہو
نہ کھاؤ ٹھوکریں، نکلو اندھیرے سے اجالے میں
مری آغوش میں آجاؤ جیسے چاند ہالے میں

رشیدہ : دیکھو سر کی عزت خدا کے سامنے جھکنے سے، آنکھ کی عزت شرم سے، زبان کی عزت سچائی سے، ہاتھ کی عزت سخاوت سے، پاؤں کی عزت نیک راستے پر چلنے سے اور انسان کے دل کی عزت نیکی و شرافت سے ہوتی ہے جس میں شرافت نہیں وہ دل نہیں۔ اور جس کے پاس شریف دل نہیں وہ انسان نہیں۔

برائی کا برا انجام ہوتا ہے زمانے میں
نہ جل جاؤ کہیں خود دوسروں کا گھر جلانے میں
بدی کا گھر، سیہ کاری کا دوزخ اس کا سینہ ہے
جو تاکے اور کی بیٹی بہن کو وہ کمینہ ہے

زیاد : رشیدہ۔ ایک مرتبہ کا ہارا ہوا داؤں دوسری مرتبہ جیتا جاسکتا ہے۔ اُجڑے ہوئے باغ پھر سے ہرے بھرے ہوسکتے ہیں۔ سوکھی ہوئی ندی میں دوبارہ پانی کی باڑھ آسکتی ہے۔ لیکن زندگی، خوبصورتی اور جوانی دوبارہ نہیں مل سکتی۔

یہ نیکی، پارسائی، باوفائی، سب کہانی ہے
اُٹھا لو زندگی کا لطف دو دن کی جوانی ہے

رشیدہ : دنیا کی خوبصورتی عورت ہے۔ اور عورت کی خوبصورتی عصمت اور شرم ہے۔ کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ جو عورت جوان اور خوبصورت ہو، اُسے اپنے آرام کے لیے نیکی اور پارسائی کو ٹھوکر مار دینی چاہیے؟

زیاد : میں تو اسے یہی صلاح دوں گا۔

رشیدہ : یہی صلاح۔ بے شرم اور بدکار بننے کی صلاح؟ اچھا فرض کرو۔ اگر اس وقت

میری جگہ تمھاری خوبصورت بہن یا جوان بیٹی آکر کھڑی ہوجائے تو تم اُسے بھی صلاح دو گے کہ دنیا کا عیش خریدنے کے لیے اپنی عزت اور حرمت دوسرے مرد کے ہاتھ بیچ ڈالو۔ یہی صلاح دوگے کے بے شرمی اور لعنت کا طوق گلے میں پہن لو۔ اور نیکی و نیک نامی کے تاج کو ٹھوکر مار دو۔ ۔

نظر شوہر کے چہرے کے سوا ہر سو نہ جائے گی
یہ دل وہ پھول ہے جس سے وفا کی بو نہ جائے گی
نہ پاؤگے دغا، میری کسی بات اور قرینے سے
کہ پی ہے دودھ کے بدلے شرافت ماں کے سینے سے

زیاد : شرافت کی قدر فرشتوں کی دنیا میں ہوگی۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں شرافت کو کون پوچھتا ہے۔ شرافت سے دنیا کا کون سا کام چل سکتا ہے۔ کیا تم شرافت کے جھوٹے سکے سے آٹا چاول خرید سکتی ہو؟ کیا تم روپے کے عوض شرافت دے کر کپڑا اور زیور مول لے سکتی ہو؟ کیا تم اینٹ اور پتھر کے بدلے شرافت کے گارے سے رہنے کا گھر بنا سکتی ہو؟ ۔

وہ جینا موت سے بدتر ہے جو وقفِ مصیبت ہے
شرافت کی نہیں انسان کو سکھ کی ضرورت ہے
مری بن جاؤ، پھر جھولوگی تم راحت کے جھولوں میں
سدا کھیلا کروگی بن کے خوشبو سکھ کے پھولوں میں

رشیدہ : قاتل دوسرے کا گلا کاٹنے میں، ڈاکو پرائے مال پر ڈاکہ ڈالنے میں، بے رحم امیر غریبوں کا حق چھیننے میں اور تمھارے جیسے بدکار لالچ اور فریب سے شریف عورتوں کی عزت برباد کرنے میں اپنا سکھ سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک وفادار بیوی ٹوٹے پھوٹے گھر میں گزری گاڑھا پہن کر اور نمک سے سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھا کر سچی محبت کے ساتھ شوہر کی خدمت کرنے میں اپنا سُکھ جانتی ہے۔ ۔

وفائیں میرا سکھ، نیکی میرا گنجینۂ زر ہے
حیا پوشاک میری اور محبت میرا زیور ہے

غریبی میں بھی نس پڑتی ہے نیکی مال والوں پر
مری عصمت کی چادر تھوک دیتی ہے دوشالوں پر

زیاد : جب کوئی ملک فہمائش اور صلح سے تابع نہیں ہوتا، تب اُسے اچانک حملہ کرکے آگ۔اور تلوار سے فتح کیا جاتا ہے۔ اگر تم میری محبت کا نفرت سے جواب دو گی....

رشیدہ : تو کیا کروگے؟

زیاد : کیا کروں گا؟ کمزور درخت کے ساتھ آندھی، منجدھار میں پھنس گئی ہوئی کشتی کے ساتھ طوفان اور چوکڑی بھول گئے ہوے ہرن کے ساتھ بھوکا شیر کیا سلوک کرتا ہے؟ ۔

میں بڑا بے رحم ہوں۔ سمجھیں۔ نہ رہنا بھول میں
دو گھڑی میں رنگ ہی ہوگا نہ بو اس پھول میں

رشیدہ : جا۔ جا۔ میں ان دھمکیوں کو کتے کا بھونکنا سمجھتی ہوں۔

زیاد : ہاں؟

رشیدہ : ہاں۔ عورت کی آبرو کو تو نے کیا سمجھ لیا ہے۔ یہ کمزور قوم کی آزادی، غریبوں کی محنت کا پھل، بے کس کی پونجی نہیں ہے کہ ایک ظالم دھمکی اور طاقت سے چھین لے۔ ۔

کب آفتوں میں خیال وفا بدلتا ہے
یہ وہ چراغ ہے جو آندھیوں میں جلتا ہے
مرے گلے میں چھری تیز کرلے تو اپنی
میں جان دوں گی، نہ دوں گی پر آبرو اپنی

زیاد : رشیدہ مجھے جبر کے لیے مجبور نہ کر۔ اگر شوہر کے سوا دوسرے مرد کو پیار کرنا گناہ بھی ہو، تو اس گناہ کو اس اکیلے گھر میں کوئی نہیں دیکھتا۔

رشیدہ : ضرور دیکھتا ہے۔

زیاد : کون؟

رشیدہ : جو سب جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ـــ

قیامت میں کرے گا کس طرح اس سے دو چار آنکھیں
تری ہیں صرف دو لیکن خدا کی ہیں ہزار آنکھیں

زیاد : ـــ

تو پھر اچھا وہی ہونے دے جو تیرا ارادہ ہے
مجھے بھی دیکھنا ہے اب کہ کس کی ضد زیادہ ہے

(زیاد زبردستی رشیدہ کا بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ رشیدہ ہاتھ چھڑا کر اسے ڈھکیل دیتی ہے)

رشیدہ : ـــ خبردار۔ اک قدم آگے بڑھایا تو غضب ہوگا۔

زیاد : ـــ ترے ان حسن کے پھولوں کا شہد اور میرا لب ہوگا۔

(زیاد دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی رشیدہ کو پکڑنے کے لیے دوڑتا ہے۔ رشیدہ اپنی سلامتی کے لیے کرسی، بوتل، گلدان وغیرہ اٹھا اٹھا کر زیاد پر پھینکتی ہے۔ زیاد پیچھا کرتا ہے۔ رشیدہ لات مارتی ہے اور زیاد گرتا ہے۔ اسی بیچ رشیدہ کو زیاد کا پستول دکھائی دے جاتا ہے۔ جسے لے کر وہ فائر کر دیتی ہے اور زیاد زخمی ہوکر گر جاتا ہے۔)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ - پہلا سین

چھاؤنی

(کپتان انور اتمش اور جلال نامی اپنے دو فوجی دوستوں کے ساتھ آتا ہے)

انور : ایک کو پھول کا رنگ پسند ہے اور ایک کو خوشبو۔ تم عورت میں خوبصورتی ڈھونڈھتے ہو اور میں عورت میں نیکی تلاش کرتا ہوں۔ تم کو خوبصورت چہرہ چاہیے اور مجھ کو خوبصورت دل چاہیے۔

جلال : یار من۔ میں پھر کہوں گا کہ دنیا میں جو کچھ ہے خوبصورتی ہے۔ ثبوت کے لیے اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کو دیکھو۔ سستی ہیں، ٹکاؤ ہیں، مضبوط ہیں، ٹوٹنے اور پرانی ہوجانے پر بھی دس کی خرید ہیں تو دو کو بک سکتی ہیں۔ لیکن شیشے کی الماری اور بکسوں میں بند نہ ہونے کی وجہ سے انھیں کوئی نہیں پوچھتا اور غیر ملک کی بنی ہوئی چیزیں نمائشی، بودی اور نکمی ہونے پر بھی لیبل اور خوبصورت پیکنگ کی وجہ سے ہر آدمی کی پسند اور نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ میرا تو یہ قول ہے کہ قسمت خوبصورت نہ ہو، مگر بیوی ضرور خوبصورت ہو۔

انور : نیکی کے بغیر عورت کی خوبصورتی بڑی خوفناک چیز ہے۔ تازہ لال مرچ کیسی خوبصورت ہوتی ہے لیکن کھانے کے بعد آدمی سی سی کر کے ناچنے لگتا ہے۔

اتمش : (جلال سے) جس روز سے تم شادی کرکے دوپائے سے چوپائے بنے ہو، اس روز سے آٹھوں پہر نظم و نثر میں عورتوں کے حسن کی قصیدہ خوانی کیا

کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوہر نواز قسمت کی مہربانی سے تمھیں بیوی خوبصورت مل گئی ہے۔

جلال : تو حضرت بارات بھی تو مشعلیں جلا کر لے گیا تھا۔ اندھیرے میں بیاہ نہیں کیا جو پری کے بدلے افریقہ کی شیدن میری دم میں نتھی کر دے۔ بیوی خوبصورت نہ ہوتی تو سسُر پر شادی کے خرچ کی نالش کر دیتا۔

آتش : شاباش۔ داماد ایسا ہی نالائق ہونا چاہیے۔ (انور سے) یہ تو دو مہینے ہوئے شادی کرکے بے فکرے سانڈ سے کولھو کے بیل بن چکے۔ اب تم کب گھر بسانے کی تیاری کروگے؟

انور : جس دن پسند کے لائق بیوی مل گئی۔

جلال : بھائی صاحب۔ پسند اور ناپسند کے پھیر میں آدمی زندگی بھر کنوارا رہ جاتا ہے۔ بیوی بھی کیا کوئی گھوڑی ہے جو چال اور دانت دیکھ کر خریدوگے۔

انور : شادی گڑیا گڈے کے بیاہ کی نقل نہیں، جوانی کا کھیل، زندگی کا سرسری تماشہ۔ انسانی ہستی کا عظیم ترین انقلاب اور مستقبل کو بہتر یا بدتر بنانے والا حالات و واقعات کا آغازِ عمل ہے۔ اس لیے شریکِ زندگی کے انتخاب میں حسن پسند نگاہوں کی رائے کے بدلے انجام بیں عقل کے مشورے پر کام کرنا چاہیے۔ اگر شادی کی دعوت کھانی ہو تو دعا کرو کہ خدا مجھے ایسی بیوی دے.....

جلال : (بات کاٹ کر) جو خوبصورت اور مال دار ہو۔

انور : نہیں۔ جو نیک سیرت اور نیک کردار ہو۔

آتش : تو یہ کہو کہ دعوت کھلانے کا ارادہ نہیں ہے (جلال سے) چلو بھائی کسی فال والے سے پوچھیں کہ ایسی لڑکی کس خوش نصیب باپ کے گھر میں پیدا ہوئی ہے۔

(دونوں ہنستے ہوئے ایک طرف کو جاتے ہیں۔ دوسرے جانب سے ایک سپاہی آتا ہے)

سپاہی : جناب والا۔ ایک نوجوان شریف لڑکی جس کا مسکن اسلام بول اور نام لیلیٰ ہے، آپ کی خدمت میں باریابی چاہتی ہے۔

انور : لیلیٰ اور اتنی دور کا سفر۔ اسے یہاں کوئی ضرورت لائی ہے یا میرا خیال۔ کاش آخری وجہ ہو۔ (سپاہی سے) آنے دو۔

(سپاہی باہر جاتا ہے)

(خود کلامی) حسن، نیکی، عصمت اور خودداری، ان چاروں کو الگ الگ نام سے پکاریں گے۔ اگر ایک نام سے پکارنا ہو تو وہ نام صرف لیلیٰ ہے۔ کتنی شریف اور کتنی دل فریب۔ جب اسے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ خوبصورتی اور پاکیزگی دو معصوم بچوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر سامنے کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ اور وہ جب گفتگو کے لیے اپنے نازک ہونٹوں کو جنبش دیتی ہے، اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشگفتہ پھول کی خوش رنگ پنکھڑی پر موسیقی رقص کر رہی ہے۔

(لیلیٰ کمرے میں داخل ہوتی ہے)

لیلیٰ : میرے مُحسن اپنی ادنیٰ کنیز کا نیاز مندانہ سلام قبول کیجیے۔

انور : نیک لیلیٰ۔ خوش آمدید۔ تمھاری زیارت سے مشتاق دیدار دل کو اتنی ہی مسرت ہوئی جتنی پانی سے بھرے بادلوں کو دیکھ کر سوکھے کھیت کے کنارے بیٹھے ہوئے دل شکستہ کسانوں کو خوشی ہوتی ہے۔ کہو میری کس خدمت کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے تم نے تن تنہا اتنے بڑے سفر کی زحمت گوارا کی۔

لیلیٰ : شوہر کی فکر اور دن رات کی محنت سے بدنصیب رشیدہ کے چہرے کی تازگی اور دل کی خوشی تو مدت ہوئی ختم ہو چکی۔ اب اُس کی تندرستی بھی ایک ایک قدم قبر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس لیے میں یہ کہنے آئی ہوں کہ اگر آپ کے دل میں بہن کی محبت اور اس کی مصیبت کے لیے رحم موجود ہے تو ایک

مرتبہ پھر سمجھا بجھا کر گھر لے جانے کی کوشش کیجیے اور اس غریب کو قبل از وقت موت سے بچا لیجیے۔

انور : وہ شوہر کی محبت میں پاگل ہو رہی ہے۔ میں اُسے لاکھ سمجھاؤں، پہاڑ سے گرتی ہوئی پانی کی چادر کی طرح اپنے رستے سے کبھی واپس نہ لوٹے گی۔

لیلیٰ : درخت انسان لگاتا ہے۔ اور ہوا پانی روشنی کے ذریعے سے پھل پھول خدا پیدا کرتا ہے۔ آپ کوشش کیجیے اور نتیجہ کو اُس کارساز پر چھوڑ دیجیے۔

انور : سورج کا زمین کے گرد گھومنا ممکن ہے۔ لیکن بہن رشیدہ کے خیال کا بدلنا بالکل ناممکن ہے۔ پھر بھی تم امید بندھاتی ہو تو اچھا ـــــ ایک بار اور کوشش کروں گا۔

لیلیٰ : لیکن کب؟ کس دن؟ کیا گھر جل چکنے کے بعد پانی لے کر پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔ اگر اپنے فرض کا احساس ہے تو آپ کو آج ہی سب سے پہلی ٹرین میں اسلام بول روانہ ہوجانا چاہیے۔

انور : بہتر ہے۔ میں آج ہی روانگی کا انتظام کروں گا۔ لیکن ایک شرط ہے۔

لیلیٰ : شرط۔ وہ کیا؟

انور : تم نے یہاں تک آنے میں جو تکلیف برداشت کی ہے اس کے شکریے میں تمھیں ایک ناچیز تحفہ نذر کرنا چاہتا ہوں۔ قول دو کہ وہ تحفہ قبول کروگی۔

لیلیٰ : بڑی خوشی اور فخر کے ساتھ۔

انور : تو میں سچائی، وفاداری اور محبت سے بھرا دل پیش کرتا ہوں۔ کہو کہ میری زندگی کے ساتھی میں نے قبول کیا ـــــ سر جھکا کر چپ کیوں ہوگئیں؟

لیلیٰ : دنیا میں نیکی و محبت کی قدر نہیں۔ خاندان، خطاب اور دولت کی قدر ہے۔ جب میرے اور آپ کے درمیان امیری اور غریبی کے دو سمندر موجیں مار رہے ہیں تب ہم کس طرح اس زندگی میں ایک ہوسکتے ہیں؟

انور : شادی کے پاک رشتے سے بندھ کر ـــــ اس طرح۔

(انور بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ لیلیٰ خاموش ہوجاتی ہے۔ دونوں گاتے ہیں)

اے میرے جیون ادھار۔
ان چرنن پہ نثار۔
چھین لیو من جادو ڈار کے۔
چتون من ہرگئی۔ سدھ بدھ بسرگئی۔
چندر مکھ نہار کے۔
من میں ٹھہرو پریم بست ہے۔
نینن میں چھب پیاری۔ رسیلی۔ نیاری۔
پریم پیالہ پی گئی میں ہوگئی متواری۔
ساجن باندھ لیو بندھن۔ میں پیار کے۔
اے میرے جیون اُدھار...

تیسرا ایکٹ - دوسرا سین

قید خانہ

(ایاز دو قیدیوں کے ساتھ آتا ہے)

ایاز : سچ یار۔ جیل بھی بڑی دلگی کی جگہ ہے۔ جب قیدیوں کا غول پاؤں کی بیڑی اور کڑے چھن چھن بجاتا ہوا چلتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موچھوں والی عورتوں کی فوج جرمنی سے لڑنے جارہی ہے۔

قیدی ۱: اچھا تو یہ کہو تم نے جیل خانے کا کیا نام رکھا ہے؟

ایاز : سنو سرکاری آدمی اسے جیل کہتے ہیں۔ شریف لوگ اسے دنیا کا جہنم کہتے ہیں۔ گھڑی گھڑی یہاں آنے والے بدمعاش اسے اپنی سسرال کہتے ہیں۔ اور میں اسے آدمی کا طویلہ کہتا ہوں۔

قیدی ۲: طویلہ۔ تو کیا یہاں قیدیوں کے بدلے گھوڑے گدھے بندھے ہوئے ہیں۔

ایاز : ارے بھائی۔ قیدیوں سے گھوڑے گدھوں کی قسمت بھی اچھی ہوتی ہے۔ کیونکہ کمزور گدھے کو لادی اٹھانے کے بدلے چکی پیسنی اور گھوڑوں کو گھاس کھانے کے بدلے گھاس کاٹنی نہیں پڑتی۔

قیدی ۲: کہتے تو ٹھیک ہو۔

ایاز : دعا کرو کہ اگر چھوٹنے کے بعد پھر تمھاری قسمت میں جیل آنا لکھا ہو تو اب کی آدمی کی جون کے بدلے گھوڑے گدھے کی جون میں آؤ۔

قیدی ۱: دوست تمھاری ہنسی کی باتوں میں قید کی تکلیف بھی گدھے کے سینگ کی طرح اُڑن چھو ہو جاتی ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ تم اڑتالیس گھنٹے کے

بعد پُھر سے اڑ کر جیل کا پنجرا خالی کر دوگے۔

ایاز : ہاں دوست۔ میں صرف چھ مہینے کے لیے جیل کی مٹی ملی ہوئی روٹی اور پانی سے بگھاری ہوئی بے نمک کی بھاجی کھانے آیا تھا۔ دو دن رہ گئے ہیں اگر کل رات تک میاں ملک الموت نے کوٹھری کی چھت سے چھاتی پر کود کر سوتے میں گلا نہ دبا دیا تو پرسوں اپنا کمبل اور تھالی کسی نئے مہمان کے لیے چھوڑ کر اس سرکاری مسافر خانے سے رخصت ہوجاؤں گا۔

قیدی ۲: چھ مہینے ہی رہنا تھا تو جیل آنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ تم تو گویا جیل کے کھانے کا نمک چکھنے آئے تھے۔

ایاز : تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی اسی طرح جیل میں پڑا رہوں جیسے لوگوں کا دل گھڑ دوڑ کی ٹیپ میں پڑا رہتا ہے۔

قیدی ۱: وہ دیکھنا سامنے سے کوئی نیا قیدی آرہا ہے۔

قیدی ۲: چلو جیل کی برادری میں ایک اور ممبر بڑھا۔

(غانم سپاہیوں کے ساتھ قیدی کے لباس میں آتا ہے)

ایاز : یہ کون؟ غانم۔ مسٹر شیطان کے ایڈی کانگ۔ آیئے آیئے۔ نئے تماشے کے اشتہار کی طرح ہم تو آپ کے آنے کا راستہ ہی دیکھ رہے تھے۔

افسر : دیکھو نمبردار۔ اس کو چکی خانے لے جاؤ۔ یہ بہت دبلا پتلا آدمی ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب نے رحم کرکے حکم دیا ہے کہ اس سے صرف بائیس سیر گیہوں روز پسوائے جائیں۔

ایاز : جمعدار صاحب۔ اس کو چکی کے عوض کولھو پر دیجیے۔ اس لیے کہ اس نے جیل کے باہر بہتوں کی دولت کا تیل نکالا ہے۔ یہاں گھانی میں اس کا تیل نکلنا چاہیے۔

افسر : دیکھو یہ نیا آدمی ہے۔ خوش قسمتی سے پہلی بار جیل آیا ہے۔ اگر پاؤ آدھ پاؤ کم پیسے تو سختی نہ کرنا۔

ایاز : ہاں۔ میں بھی یہ صلاح دیتا ہوں۔ کام برابر نہ کرے تو بہت نرمی سے دس

پانچ گالیاں دے دینا اور نہایت مہربانی کے ساتھ دس بیس لاتیں اور سو دو سو گھونسے لگا دینا۔

افسر : ٹھیک ہے۔ بہت نیک رائے دے رہا ہے۔

ایاز : جمعدار صاحب۔ لوگ دنیا میں ننگے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تو ماں کے پیٹ ہی سے شرافت کا کوٹ پتلون پہنے پیدا ہوئے ہیں۔ پھر یہ دس نمبر کے حلال زادے جیل میں کیسے آئے۔

افسر : ناظم نامی ایک بگڑے ہوئے رئیس نے کسی بے وفائی پر جل کر شمیم رنڈی کی ناک کاٹ لی۔ اور اس نے اس نکٹی رنڈی کا بدلہ لینے کے لیے دانت سے ناظم کی ناک کا صفایا کر دیا۔ انھیں دو ناکوں کے بدلے میں اسے کان پکڑ کر دو برس کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

(افسر چلا جاتا ہے)

قیدی ۱ : دیکھو سکندر، تیمور، نپولین دنیا میں بڑے بڑے بہادر گذرے ہیں۔ مگر تم ان سب سے زیادہ بہادر ہو۔ کیونکہ انھوں نے اپنے دشمنوں کا سر کاٹا ہے اور تم نے ناک کاٹی ہے۔ بہادر قیدی۔ میں تمام قیدیوں کی طرف سے تمھیں جیل آنے کی مبارک باد دیتا ہوں۔

ایاز : تمھارے آنے سے اندھیرے جیل میں روشنی ہوگئی۔ لیکن بڑھاپے میں بچارے شیطان کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ تو یہ سمجھتا ہوگا کہ میرا پالا پوسا اکلوتا بیٹا مرگیا۔

عاصم : افسوس۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ گناہ کے بیج سے ہمیشہ بربادی اور ذلت ہی اگتی ہے۔ بے اصول زندگی یار ماری اور رنڈی کی دوستی کا یہی نتیجہ ہے۔

ایاز : عالی جناب جیل تشریف لانے کا رنج نہ کیجیے۔ اگر اس لمبی ناک پر آنسوؤں کی بوند دکھائی دے گی تو لوگ کہیں گے کہ جاپانی کتے کی دم میں کیچڑ لگی ہوئی ہے۔

عاصم : تو آدمی ہے یا پتھر۔ پہلے مجھے دیکھ کر مسکراتا بھی نہ تھا اور آج بتیسی نکال

کر میری مصیبت پر ہنستا ہے۔

ایاز : تو مسٹر رحم دل۔ تو آپ کیا دوسروں کی مصیبت پر رویا کرتے تھے ـــــ بیٹا اب قسمت کے اڑنگے میں آئے ہو۔ دو برس کے اندر قیدیوں کے ہاتھ سے جوتے کھاتے کھاتے کھوپڑی آٹا چھاننے کی چھلنی بن جائے گی۔

قیدی ۲: چکی بیگم بلائیں لینے کے لیے یاد کر رہی ہیں ـــ چلو بڑھو۔

غانم : او خدا ـــ یہ دو برس کیسے کٹیں گے؟

ایاز : چکی پیتے اور بھنگی کے ہاتھ سے جھاڑو کھاتے۔

(سب جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - تیسرا سین

عارف کا گھر

(رشیدہ بیمار زمین پر پلنگ کی پٹی کے سہارے بیٹھی ہے۔ پاس ہی عارف افسردہ بیٹھا ہے)

عارف : (خود کلامی) جب کتاب زندگی کے ورق الٹا کر اس کے ابتدائی صفحوں میں بدبختی کی خبر کا مبتدا اور تباہی کے معلول کی علت تلاش کرتا ہوں۔ جب اشک بار حال اور تبسم ریز ماضی کو پہلو بہ پہلو رکھ کر زندگی کے تدریجی انقلاب پر نظر ڈالتا ہوں، جب خود کو شراب کے نشے میں آوارہ گرد مجرم کی طرح گلی گلی بھٹکتے، بیمار بیوی کو دوا اور غذا کے بغیر بھری جوانی میں سسک سسک کر مرتے، راستہ چلتوں کو اپنی ذلیل حالت پر ہنستے، عزیزوں اور دوستوں کو نظر بچا کر اپنے پاس سے نکل جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ تب جی چاہتا ہے کہ ان تمام شراب کے کارخانوں کو جو اپنی جیبیں بھرنے کے لیے ملکوں قوموں اور گھرانوں کو تباہ کر رہے ہیں، آگ اور بارود سے اڑا دوں۔ اور ان پاجیوں کو جو اپنے نفع اور مزے کے لیے دوسروں کو شراب پینے کا مشورہ دیتے ہیں لات مار کر خدا کی خدائی سے باہر کر دوں ——— دنیا میں جنگ، قحط، وبا نے جتنی جانوں کا نقصان نہیں کیا، اُس سے زیادہ زندگیاں اس شراب نے برباد کر دی ہیں۔ قدرت کے منشائے آفرینش کے خلاف اناج اور پھلوں کو سڑا کر خمار اور عرق کی شکل میں تبدیل کر دینا، یہ دماغ کی طاقت ایجاد کا بدترین استعمال اور دنیا کی دریافتوں میں مہلک ترین دریافت

ہے۔ جس نطفہ شیطان نے شراب ایجاد کی وہ یقیناً گناہ کا پہلا فرزند اور نسل انسانی کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ شراب جسم کا سایہ نہیں جس کو اپنے سے دور کر دینا ناممکن ہو۔ مذہب نہیں جس کا ترک کردینا گناہ ہو۔ اناج اور پانی نہیں جس کے چھوڑ دینے کا نتیجہ موت ہو۔ پھر بھی صرف چند منٹ کی مصنوعی مسرت کے لیے بدبخت انسان اس غیر ضروری اور ناکارہ شے کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میری بھی یہ حالت ہے۔ اُف کیسی عبرت ناک حالت۔ جس طرح قوی ہیکل مگرمچھ دریا تیر کر پار جاتے ہوئے آدمی کا پیر پکڑ لے اور پوری طاقت صرف کر دینے پر بھی اسے کنارے کی طرف نہ جانے دے، اسی طرح شراب نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ اس سے بھاگنا چاہتا ہوں اور نہیں بھاگ سکتا۔ ہر روز چھوڑ دینے کا ارادہ کرتا ہوں اور نہیں چھوڑ سکتا ــــ جیب کی نقدی اور بوتل کی شراب دونوں ختم ہوچکیں۔ لیکن نشہ کی لاؤ لاؤ ختم نہیں ہوئی۔ چلوں۔ کلال کی خوشامد کروں۔ ممکن ہے کہ ہمیشہ کا گاہک سمجھ کر ادھار دے دے۔

(عارف جاتا ہے۔ رشیدہ دھیرے دھیرے اُٹھتی ہے)

رشیدہ : (خود کلامی) پہلے سر میں درد ہوا۔ پھر بخار آنے لگا اور اب دھیمی دھیمی کھانسی بھی شروع ہو گئی ہے۔ بیماری اور فکروں نے جونک کی طرح بدن کی نس نس کو طاقت اور لہو سے خالی کر دیا ہے۔ دو قدم چلنا دو کوس کی مسافت معلوم ہوتی ہے۔ پانی کی لہر کی طرح ہمت کرکے اُٹھتی ہوں اور دو ہی منٹ میں بے دم ہو کر گر پڑتی ہوں۔

(عارف غصے میں کھولتا آتا ہے)

عارف : لالچی، خودغرض، مجھے وہم بھی نہ تھا کہ طوطے کی طرح آنکھیں پھرا کر صاف جواب دے دے گا۔

رشیدہ : کس پر ناراض ہو رہے ہو؟ کہاں گئے تھے؟

عارف : کلال سے شراب اُدھار مانگنے گیا تھا۔ لیکن اس پاجی نے کہا کہ قرض دینے سے روپیہ بھی جاتا ہے اور دوستی بھی۔ نقد لاؤ۔ میں اُدھار نہیں دوں گا۔

رشیدہ : جب تم شراب مانگنے کے لیے گھر سے نکلے، اس وقت تمھیں یہ خیال نہ آیا کہ میں اپنے کو ذلیل کرنے جارہا ہوں۔

عارف : اس میں ذلت کی کون سی بات تھی۔ شراب والے سے شراب اُدھار مانگنے گیا تھا، اُس کے پاس بھیک مانگنے نہیں گیا تھا۔

رشیدہ : ادھار اور بھیک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں مسکین صورت بنا کر دوسرے آدمی کے سامنے گڑگڑانا اور ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے —— چھوڑ دو چھوڑ دو۔ میرے پیارے۔ اب بھی انسان کو حیوان اور آباد گھر کو ویران بنانے والی شراب چھوڑ دو۔ دیکھو۔ بیویاں اپنے شوہروں سے آرام مانگتی ہیں، کپڑے مانگتی ہیں، زیور مانگتی ہیں، لیکن میں نے بیاہ کے دن سے اب تک تمھارے پیار کے سوا کچھ نہیں مانگا۔ آج ان قدموں میں بیٹھ کر اور دامن پھیلا کر تم سے شراب چھوڑ دینے کی بھیک مانگتی ہوں۔ کہو کہو۔ کیا تم اس بھکارن رشیدہ کو یہ بھیک نہ دوگے؟

عارف : رشیدہ اٹھو۔ میں بچہ، جاہل، پاگل نہیں، سب سمجھتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ اتنا آگے بڑھ گیا ہوں کہ پیچھے لوٹنا ناممکن معلوم ہوتا ہے (سر پکڑ کر) اُف کتنا درد۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ کیا تمھارے پاس چار آنے پیسے بھی نہیں ہیں؟

رشیدہ : میں نے قسم کھائی۔ پھر بھی اعتبار نہ آیا۔ چند آنے پیسے کیا، دنیا کی بادشاہت کے لیے بھی تمھاری جھوٹی قسم نہ کھاؤں گی۔

(کمزوری کی وجہ سے سر تھام کر ایک اسٹول پر بیٹھ جاتی ہے)

عارف : (اپنے آپ سے) یہ ہمیشہ تکیے کے نیچے پیسے رکھا کرتی ہے۔ دیکھوں شاید بھول میں کچھ آنے پڑے رہ گئے ہوں (تکیہ الٹ کر دیکھتا ہے تو پانچ سو کا نوٹ نکلتا ہے) یہ کیا؟ پانچ سو کا نوٹ؟ جس محتاج عورت کو تن ڈھانکنے بھر

کپڑے اور پیٹ بھر اناج کا بھی سہارا نہیں، اس کے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے۔ سمجھ گیا۔ نیکی کا ملمع اُڑ کر بے وفا دل کا کھوٹ ظاہر ہو گیا۔ دولت۔ دولت۔ آج میں نے مان لیا کہ جس طرح تو سونے چاندی سے بازاری عورتوں کی عصمت مول لے سکتی ہے، اسی طرح گھر کی چاردیواری میں رہنے والی بیویوں کی پارسائی بھی خرید سکتی ہے۔

رشیدہ : سر کا درد بڑھ جائے گا۔ دماغ کو آرام دو۔ اتنا کیا سوچ رہے ہو؟

عارف : سوچ رہا ہوں کہ اندھیرے میں چھری مارنے والے دشمن اور پارسا بن کر بے وفائی کرنے والی بیوی دونوں میں سے کون زیادہ قاتل ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ شیطان کی روح اور عورت کا دل دونوں میں سے کون زیادہ ناپاک ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ عارف کی بیوی رشیدہ اور بازار کی بیسوا دونوں میں کون زیادہ کمینی ہے۔

رشیدہ : یہ کیا۔ بے انتہا نشے اور حد سے گذرے ہوئے غصے میں بھی جس زبان سے . کبھی تو کر کے نہیں پکارا۔ آج اسی زبان سے رشیدہ کے لیے گالیاں نکل رہی ہیں۔ کیا مجھ سے محبت اور خدمت میں کوئی کمی یا ایک شریف عورت اور شریف بیوی کا فرض ادا کرنے میں کوئی قصور ہوا ہے؟

عارف : چاند کی پوری روشنی اندھیری رات میں، عورت اور بیوی کی خوبیاں غریبی اور مصیبت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جو دکھ کے وقت طوفان میں چٹان کی طرح نیکی پر قائم نہیں رہتی۔ اُسے اپنے کو عورت اور بیوی کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قصور مجھ سے پوچھتی ہو۔ مجھ سے نہیں، اپنے بے وفا دل سے پوچھ اور دل دوسرے کے پاس ہو تو اس کے دیے ہوئے نوٹ سے پوچھ۔

رشیدہ : (نوٹ دیکھ کر) انور کا نوٹ۔ جو خوف تھا وہی ہوا۔

عارف : تو تو گلے میں بانہیں ڈال کر اور قسم کھا کر کہتی تھی کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہاں سے آیا۔ چپ کیوں ہو گئی؟ جواب دے۔ (پاس پڑی ہوئی چھری اٹھا کر) حرام زادی۔ بول۔ مرنے سے پہلے تجھے اپنے گناہ کا اقرار کرنا ہوگا۔

رشیدہ : میرے پیارے وہم نہ کرو۔ میرا اتنا ہی قصور ہے کہ تمھاری ناراضگی کے خوف سے آج تک ظاہر نہیں کیا۔ یہ نوٹ میرے بار بار انکار کرنے پر بھی ضد کرکے انور دے گیا ہے۔

عارف : اپنے برہنہ گناہ پر بھائی کے نام کا پردہ ڈالتی ہے۔ گھر، سکھ، دولت، سب کچھ کھو دینے کے بعد میرے پاس صرف بیوی کا پیار رہ گیا تھا۔ تو نے وہ بھی دیگر کو دے کر آج مجھے پوری طرح کنگال کر دیا۔ بے حیا، فاحشہ جس دل میں تو نے غیر کی محبت کو جگہ دی ہے اس دل میں میری چھری کو بھی جگہ دینی ہوگی۔ شرم اور عصمت مرگئی۔ تب تو بھی مر۔

(عارف چھری کھینچ کر رشیدہ پر وار کردیتا ہے)

رشیدہ : اُف۔ خدا انھیں معاف کر۔

(رشیدہ گر کر بیہوش ہوجاتی ہے اسی وقت لیلیٰ اور انور آتے ہیں)

انور : میرے خدا۔ میں کیا دیکھتا ہوں۔ (رشیدہ کے قریب جاکر) یہ کیا۔ خون۔ قتل۔

لیلیٰ : (جھنجھوڑ کر) رشیدہ۔ رشیدہ۔ آہ کچھ نہیں۔ مار ڈالا۔ ظالم شرابی شیطان نے دنیا کی حور کو مار ڈالا۔

انور : بے رحم، وحشی حیوان یہ کیا کیا؟ اس خون کی قیمت تجھے اپنے خون سے ادا کرنی ہوگی۔ (گریباں پکڑ کر) ۔

بلا رہی ہے جہنم کی راہ صاف تجھے
خدا کی مار جو اَب میں کروں معاف تجھے

لیلیٰ : معافی۔ اس سنگ دل کو معافی۔ اس کو معاف کرنا دنیا کے بے رحم شوہروں کو غریب بیویوں پر ظلم کرنے کی تعلیم دینا ہے۔ میں ابھی پولیس کو بلا کر لاتی ہوں۔ اس کے رہنے کی جگہ عورت کا پاک دل نہیں۔ پھانسی کی کوٹھری ہے۔

(جوش میں پولیس کو بلانے جاتی ہے)

انور : بول خونی بول۔

جھک کے جیتے جی نہ ان قدموں سے جس کا سر اُٹھا
کس طرح اُس باوفا کے قتل پر خنجر اٹھا
زندگی کے سارے سکھ ملتے تھے جس کی چھاؤں سے
تو نے اُس نخلِ وفا کو روند ڈالا پاؤں سے

عارف : باوفا بیوی شوہر کے بے وفا ہوجانے پر اپنے لیے امیر عاشق تلاش نہیں کرتی۔ عورت کی آبرو جو شوہر کی امانت ہے، روپے لے کر غیر مرد کو نہیں دیتی....

انور : تو کیا اُس نے ایسا کیا؟

عارف : ہاں۔

انور : ثبوت؟

عارف : یہ پانچ سو کا نوٹ۔

انور : جلد باز احمق۔ یہ نوٹ تو خرچ کی تکلیف دیکھ کر میں زبردستی دے گیا تھا۔ یقین نہ ہو تو نوٹ کی پشت پر دیکھ میرا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ (عارف کے ہاتھ سے چھری چھٹ کر گر جاتی ہے)۔

لہو رو کر خدا سے شکوۂ بیداد کرتے ہیں
کھلے ہیں زخم کے منھ سن کہ کیا فریاد کرتے ہیں

(لیلیٰ پولیس کو لے کر واپس آتی ہے)

لیلیٰ : وہ رہا قاتل۔ یہ دیکھو اس چھری سے خون ہوا ہے۔

افسر : مقتول، گواہ، ثبوت سب موجود ہیں۔ مجرم کو ہتھکڑی لگاؤ۔

(سپاہی عارف کو ہتھکڑی لگاتے ہیں)

انور : (افسر سے) دیکھیے دیکھیے۔ اس ناشکرے انسان کو دیکھیے۔ اس سونے کی پتلی

نے جو زمین پر ٹوٹی پڑی ہوئی ہے۔ امیر باپ کی لڑکی ہوکر شوہر کے لیے فقیری اختیار کی۔ زندگی اور جوانی کے سکھ چھوڑے۔ فاقے کیے۔ چکیاں پیسیں اور اس شریف نما کمینے نے اس کی محبت اور خدمت کا یہ بدلہ دیا۔

بناوٹ نے جلا دے دی ہے شیشے کے نگینے میں
وگرنہ شرم ہے دل میں، نہ دل ہے اس کے سینے میں

لیلیٰ : دیکھو۔ دیکھو۔ یہ ہوش میں آرہی ہے۔

رشیدہ : (ہوش میں آکر) معاف کرو۔ میرے پیارے معاف کرو۔ (آنکھ کھول کر) یہ گھر میں پولیس کیسی؟ ارے یہ کیا۔ انھیں کیوں گرفتار کر لیا ہے؟

افسر : خون کے جرم میں۔ تم بچ گئیں تو بھی اسے سخت سے سخت سزا ملے گی۔

رشیدہ : سزا ملے گی۔ میرے سرتاج کو۔ میرے سکھ سہاگ کے مالک کو۔ کس لیے؟

افسر : اس لیے کہ اس نے جان لینے کے ارادے سے تمھیں چھری ماری ہے۔

رشیدہ : چھری ماری۔ انھوں نے کس وقت، کس نے دیکھا۔ نہیں جھوٹ ہے۔ انھوں نے مجھے چھری نہیں ماری۔

لیلیٰ : بہن بہن یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا ابھی تک محبت کا پاگل پن نہیں گیا؟

افسر : اگر ملزم نے چھری سے وار نہیں کیا تو پھر تم کس طرح گھایل ہوئیں۔

رشیدہ : بیماری اور کمزوری کی وجہ سے مجھے چکر آگیا تھا۔ چھری زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اُسی کے اوپر گری، اور زخمی ہو گئی۔

انور : اس کی بات کا یقین نہ کیجیے۔ اس زمانے میں امیروں کی پڑھی لکھی آزاد لڑکیاں سکھ اور دولت کے لیے بیاہ کرتی اور شوہر کو اپنا مجازی خدا سمجھنے کے بدلے صرف دل بہلانے والا ساتھی سمجھتی ہیں۔ لیکن پڑھی لکھی لڑکی ہونے پر بھی یہ ان میں سے نہیں ہے۔ اس کے دل کا ذرہ ذرہ خاوند کی محبت سے لبریز ہے۔ اس لیے یہ وفاداری کے جوش میں شوہر کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہے۔

افسر : میں بھی سمجھتا ہوں۔ مگر کچھ نہیں کرسکتا۔ ہتھکڑی کھول دو۔ جیسے شیشے کا فانوس

آندھی میں چراغ کو بجھنے نہیں دیتا ویسے ہی وفادار بیوی کی محبت شوہر پر کوئی آنچ آنے نہیں دیتی۔ مبارک ہے وہ ملک جو اس بدکاری اور آزادی کے زمانے میں بھی نیکی اور عصمت کے پھولوں سے مہک رہا ہے۔ اور مبارک ہیں وہ مائیں جن کی کوکھ سے ایسی شریف اور نیک لڑکیاں جنم لیتی ہیں۔

(افسر سپاہیوں کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے)

انور : دیکھ دیکھ۔ اپنے ظلم اور اس کی محبت کو دیکھ۔ نالائق بیٹے کو باپ دل سے دور کر دیتا ہے۔ نالائق بھائی کو بھائی ترک کر دیتا ہے۔ نالائق آدمی کو اس کے بچپن کے ساتھی اور جوانی کے دوست چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن ایک وفادار بیوی ہی کی ذات ہے جو عشق پیچاں کی نازک بیل کی طرح بُرے سے بُرے شوہر کے قدموں سے لپٹی رہتی ہے۔

تو نہیں سنتا کسی کی تھک گئے سب بول کر
حال و ماضی پر نظر کر اب بھی آنکھیں کھول کر

عارف : کھل گئیں۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ اے دولت اور تندرستی کے دشمن۔ اے ذلت اور بربادی کی جڑ۔ اے دنیا کی آدھی سے زیادہ مصیبتوں کی تنہا سبب دور ہو۔ میرے دل اور میرے گھر سے ہمیشہ کے لیے دور ہو۔ (بوتل اور گلاس پھینک دیتا ہے) معاف کر میری حور، اپنے گناہ گار شوہر کو معاف کر۔

(عارف رشیدہ کے قدم پکڑ لیتا ہے)

تیسرا ایکٹ - چوتھا سین

راستہ

زیاد : شیر جب تک گولی کھا کر نہ گرے، شکاری اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ چالاک اور دلیر رشیدہ میری غلطی سے مجھے زخمی کرکے اپنی عصمت بچالے گئی۔ لیکن جب میں سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوں تب تک وہ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔

طارق : میں نے آپ کے حکم کے مطابق آٹھ وفادار بہادر چن لیے ہیں۔ اگر ان آٹھ کے مقابلے میں اٹھائیس آدمی تلواریں لے کر کھڑے ہوجائیں تو یہ سب ان کی گردنیں توڑ کر رشیدہ کو زبردستی اٹھا لائیں گے۔

زیاد : تو یہ کام آج ہی ہونا چاہیے۔

طارق : آج ہی ہوگا۔ ہم صرف رات کے اندھیرے اور سناٹے کا انتظار کر رہے ہیں۔

زیاد : اچھا جاؤ اپنے دل کو ہمت سے گرم اور اپنی تلواروں کو مقابلے کے لیے تیار رکھو۔ اگر تم رشیدہ کو اٹھا لائے۔ تو میں تمھارے سروں پر انعام کی بارش برسادوں گا۔ اور اگر نہ لاسکے تو تمھارے سروں کو بوٹ کی ٹھوکروں سے اڑا دوں گا۔ جا۔ ہا ہا ہا ہا۔

تیسرا ایکٹ - پانچواں سین

عارف کا مکان

رشیدہ : ابا جان۔ تین مہینے سے بیماری کے بستر پر پڑے ہوئے ہیں اور انور نے اُن کے سخت بیمار ہونے کا حال آج ظاہر کیا۔

عارف : تمھارے والد نے محبت سے یاد کیا ہے تو میں تمھیں ساتھ لے کر خوشی سے چلنے کو راضی ہوں۔ لیکن وہ روپے پیسے سے میری مدد کریں گے تو میں شکریے کے ساتھ واپس کردوں گا۔

رشیدہ : کیوں؟

عارف : کیونکہ میں اپنی کھوئی ہوئی دولت اپنی محنت اور کوشش سے دوبارہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ مفت میں ملی ہوئی دولت آدمی کو نکما اور اپاہج بنا دیتی ہے۔ انسان جس دولت کو محنت سے پیدا کرتا ہے، اُسی دولت کی قدر بھی کرتا ہے۔

(ایاز داخل ہوتا ہے)

ایاز : اگر دولت کی قدر کرنا سیکھ گئے ہو تو اب دولت ناراض ہوکر کبھی تمھارا ساتھ نہ چھوڑے گی۔

رشیدہ : یہ کون؟ ایاز۔ ہاں وہی۔ وفا کا پُتلا۔ انسانوں میں فرشتہ۔

(رشیدہ دوڑ کر ایاز سے لپٹ جاتی ہے)

ایاز : میری بچی۔ چکی کے شور اور بیڑیوں کی جھنکار میں بھی تمھاری یہی محبت

بھرے الفاظ تسلی کی آواز دے کر میری ڈھارس بندھاتے تھے۔ میں قیدخانے سے رہا ہوگیا ہوں۔ مگر تمھاری نمک خواری سے اور غلامی کی قید سے رہا نہیں ہوا۔ لوہے کی بیڑیاں ٹوٹ گئی ہیں لیکن وفاداری کی ہتھکڑی باقی رہے گی۔

عارف : آنکھیں چار کرتے شرم آتی ہے (پاس جاکر) ایاز۔ شراب کے نشے اور غصے میں جو غلطی ہوئی ہے میں اس کے لیے نادم ہوں۔ معافی کے لائق نہیں ہوں۔ پھر بھی مجھے معاف کرو۔

ایاز : میرے آقا۔ معافی کے نام سے اپنے گھر کے غلام کو شرمندہ نہ کیجیے۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد راستے میں آپ کے شراب چھوڑدینے اور نیک زندگی اختیار کرنے کا حال سن کر مجھے جو خوشی حاصل ہوئی۔ اس خوشی اور آپ کی بہتری کے لیے میں ایک نہیں ایک ہزار مرتبہ جیل جانے کو تیار ہوں۔

عارف : ایاز۔ دنیا میں بدنصیب وہ ہے جسے غلطیوں میں گھرا ہوا دیکھ کر بھی کوئی نصیحت نہیں کرتا اور اس سے زیادہ بدنصیب وہ آدمی ہے جو نصیحت سن کر اُس پر عمل نہیں کرتا۔ اگر میں تمھاری نصیحت سنتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔

ایاز : غانم کی بری صحبت اور شراب کی بدولت زندگی بسر کرنے کے لیے آج آپ کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے ——— اسی دن کے لیے میں نے دنیا کی بدنامی اور جیل کی مصیبت سے بے پرواہ ہوکر آپ کی تجوری سے پچیس ہزار کے نوٹ نکال کے زمین میں چھپا دیے تھے۔ آپ نے مجھے چور سمجھا۔ لیکن میں چور نہیں تھا، آپ کا خیرخواہ تھا۔ آپ کے پچیس ہزار کے نوٹ میرے پاس بطور امانت موجود ہیں۔ لیجیے۔ یہ ہیں آپ کے روپے۔

(ایاز عارف کو پچیس ہزار کے نوٹ دیتا ہے)

رشیدہ : قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ یہ جب بگڑتی ہے تو موسم خزاں کی طرح خوشی کے باغ کا سارا سنگھار چھین لیتی ہے۔ اور جب مہربان ہوتی ہے تو نسیم بہار بن کر مرجھائی ہوئی زندگی کی گود راحت کے پھولوں سے بھر دیتی ہے۔

ایاز : اب اس روپے سے کنگالی کو خوش حالی میں بدلنے کے لیے دیانت اور محنت کے ساتھ کوئی روزگار شروع کر دیجیے۔ اور میری اس نصیحت کو جو پہلے بھی کی تھی یاد رکھیے۔ ؎

آندھیاں بھی ساتھ ہیں دولت کے بادل کے لیے
ہے وہی دانا بچا رکھے جو کچھ کل کے لیے

(گانا)

دنیا میں جب دھن پانا- کل کے لیے بچانا
دولت بھی اک کھیتی ہے۔ جو بوئے اُسے پھل دیتی ہے۔
رکھ دھن جو ہو پھل کھانا۔

بُرے دن میں نہ بھائی اور نہ جایا کام آتا ہے
فقط اپنا کمایا اور بچایا کام آتا ہے
سبھی ہنستے ہوے ملتے ہیں جب تک چار پیسے ہیں
نہ پوچھے گا کوئی بھی مفلسی میں آپ کیسے ہیں
مطلب کا یار زمانہ۔ کل کے.....
نہیں رہتی ہے مچھلی بھی ندی جب سوکھ جاتی ہے
جو دولت ہے تو تم دولھا ہو اور دنیا براتی ہے
جو کل سے بے خبر ہو کر نہیں ہیں آج آپے میں
وہ در در بھیک مانگے گا غریبی اور بڑھاپے میں
مت دولت مفت گنوانا۔ کل کے....
جہاں سکھ تھا وہاں لالے پڑے ہیں زندگانی کے
ہزاروں گاؤں اور گھر بہہ گئے ریلے میں پانی کے
جو تم دولت اُڑاتے ہو اگر اس میں کمانا ہے
تو دو ان کو کہ جن کے پاس کپڑا ہے نہ کھانا ہے
نہیں دولت مفت گنوانا۔ کل کے....

(ایاز اور عارف کا جانا اور طارق اور اس کے ساتھیوں کا آنا)

طارق : وہ کھڑی ہے۔ اٹھا لے چلو۔

رشیدہ : یہ کیا؟ تم کون؟ ایاز۔ ایاز۔

طارق : چُپ۔

رشیدہ : چھوڑو۔ بزدل کمینو۔ مجھے چھوڑو۔

طارق : تیری طرف سے زیاد کے ساتھ کون لڑے گا؟

رشیدہ : میری ہمت۔

طارق : کون بچائے گا؟

رشیدہ : میرا خدا۔

طارق : اچھا معلوم ہوجائے گا۔ دروازہ کھولو۔

رشیدہ : میں کبھی نہ جاؤں گی۔

طارق : تجھے جانا ہوگا اور اس طرح۔

(رشیدہ کو زبردستی کھینچتے ہوئے لے جانا)

تیسرا ایکٹ - چھٹا سین

زیاد کا محل

زیاد : گلاب کی پنکھڑی جیسی نازک اور برگد کے تنے کی طرح مضبوط۔ جتنی خوبصورت اتنی ہی بہادر۔ اس دن میرا مقابلہ کرکے رشیدہ نے ثابت کر دیا کہ عورت کے سینے میں بھی شیر کا دل ہوتا ہے۔ (طارق کا آنا) کہو کیا خبر ہے۔ شکست یا فتح۔

طارق : جب حضور کا اقبال ساتھ ہے تو ہمیشہ فتح ہی ہوگی۔

زیاد : تو کیا تم رشیدہ کے گھر میں ڈاکہ ڈال کر حسن کی دولت اٹھا لائے۔

طارق : جی ہاں۔ مغرور رشیدہ ہمارے قبضے میں ہے۔ کہیے اس کے لیے کیا حکم ہے؟

زیاد : میں اُس کے حسن کی پوری بہار دیکھنا چاہتا ہوں۔ کنیزوں سے کہو کہ اسے غریب لباس کے بدلے قیمتی زیور اور موتیوں سے جگمگ کرتی ہوئی امیرانہ پوشاک پہنا کر اسے عورت سے پری بنائیں۔ میں وہیں آتا ہوں۔

(طارق کا جانا)

(خود کلامی) رشیدہ۔ مغرور رشیدہ۔ آخر تو دوبارہ میرے قبضے میں آ ہی گئی۔

تیسرا ایکٹ - ساتواں سین

محل کا کمرہ

(کنیزیں رشیدہ کا لباس تبدیل کر رہی ہیں)

رشیدہ : نہیں میں اسے نہیں پہنوں گی۔

زیاد : ہا ہا ہا ہا۔ رشیدہ۔

رشیدہ : پاجی۔ کمینے۔ بے حیا۔

(انور کا آنا)

انور : خبردار۔ بدمعاش۔

زیاد : کون؟ انور۔ بس زندگی کا خاتمہ سمجھ۔ میری پیاسی چھری تیرا خون پیے گی۔

انور : میرا خون تیری چھری کے لیے نہیں۔ لڑائی کے میدان میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت پر بہانے کے لیے ہے۔

زیاد : تجھے مرنا ہوگا۔

انور : بہادر نامرد کی چھری سے نہیں مرتے۔

زیاد : روک وار۔

انور : خبردار۔

(انور کا زیاد اور پھر طارق پر حملہ کر کے دونوں کو مار دینا)

زیاد : آہ۔

طارق : یہ کیا؟

انور : خبردار۔

طارق : آہ۔

تیسرا ایکٹ - آٹھواں سین

عاف کا مکان

(رشیدہ، انور، لیلیٰ اور مصاحبین کا آنا)

(گانا)

ہاں ساقی میخانہ بھر دے مرا پیمانہ
بدمست گھٹا ہے یا اڑتا ہوا ہے خانہ
ہوتی ہیں شب غم میں یوں دل سے مرے باتیں
جس طرح سے سمجھائے دیوانے کو دیوانہ
کیا تم نے کہا دل سے کیا دل نے کہا مجھ سے
بیٹھو تو سناؤں میں اک روز یہ افسانہ
مطرب سے یہ کہتا ہے حشر اپنی غزل سن کر
ہے میری جوانی کا بھولا ہوا افسانہ

رشیدہ : میرے پیارے بھائی۔ تم نے دنیا کے رنگا رنگ کے جواہر میں سے عورت کی بے بہا اور بے لوث محبت اور نیکی کا انتخاب کیا ہے۔ (لیلیٰ سے) اور میری شریف بہن۔ تم نے انسانوں میں بہترین شخص کو اپنی قسمت کا مالک بنایا ہے۔ خدا تمھارے انتخاب اور ارادے کو کامیاب کرے۔

(رشیدہ انور کے ہاتھ میں لیلیٰ کا ہاتھ دیتی ہے)

مصاحبین : یارب العالمین۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔

(پردہ)

رستم سہراب

رستم سہراب (1929)

یہ ڈراما مڈنس کی بمبئی شاخ 'دی امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف باہے' کے لیے لکھا گیا تھا اور یہیں سے پہلی بار اسٹیج بھی ہوا۔ اس ڈرامے کو اس کے ادبی مزاج اور ڈرامے کی تکنیک دونوں اعتبار سے آغا حشر کے کمال فن کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ اسے ناقدین ادب اور ڈرامے کے ماہرین نے متفقہ طور پر سراہا ہے۔ اردو میں لکھا گیا یہ آغا حشر کا آخری ڈراما ہے۔ یہ ڈراما 'عشق و فرض' کے نام سے بھی مشہور ہوا اور ایک روایت کے مطابق نیرنگ خیال، لاہور میں شایع بھی ہوا، لیکن اس نام سے مشہور ڈراما دراصل اس مکمل ڈرامے کے دوسرے باب کے تیسرے سین سے شروع ہوکر ساتویں سین پر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ صرف سہراب اور گُرد آفرید کے عشق کی المیہ داستان ہے، جو گُرد آفرید کے مر جانے کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔ مکمل ڈرامے کی کہانی فردوسی کے شاہ نامے کے ایک حصے سے اخذ کی گئی ہے۔ آغا حشر نے اس ڈرامے میں کامک کا استعمال نہیں کیا ہے، جس کی وجہ سے اس میں از ابتدا تا انتہا سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔ اردو میں یہ رزمیہ ادب کی بہترین مثال بھی ہے۔

آغا حشر کے ذخیرے میں اس کے دو مطبوعہ اور دو قلمی نسخ دستیاب ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں سے ایک تاج کمپنی، ٹمیا محل دہلی سے 1966 میں شایع ہوا ہے۔ اس میں ڈرامے کا تعارف عشرت رحمانی نے لکھا ہے۔ دوسرا مطبوعہ نسخہ آئینۂ ادب، لاہور نے 1987 میں شائع کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ دونوں نسخے آغا حشر کے انتقال کے بہت بعد کے ہیں، اس لیے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ قلمی نسخوں میں پہلا نسخہ منظور احمد عظیم

آبادی کا لکھا ہوا ہے، جس میں تاریخ تحریر موجود نہیں۔ اسے لکھنے کے لیے سرخ اور نیلی روشنائی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ایکٹ پنسل سے لکھا ہوا ہے۔ یہ معتبر بھی ہے اور صاف ستھرا بھی۔ لیکن دوسرا نسخہ چونکہ خود آغا جمیل کاشمیری نے اسی مسودے سے تیار کیا ہے اور ان کی باریک بیں نگاہوں نے اس پر نظر ثانی بھی کی ہے، اس لیے اسے ہی اس جلد میں شامل ڈرامے کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی 19 صفحات خود آغا جمیل کاشمیری کے لکھے ہوئے ہیں۔ باقی 86 صفحات ان کی نگرانی میں ان کے صاحب زادے آغا نہال کاشمیری نے نقل کیے ہیں۔

کردار

مرد

رستم	ایرانی افواج کا سپہ سالار
سہراب	رستم کا بیٹا
شاہ سمنگان	سمنگان کا حاکم
پیلسم	سمنگان کا ایک سردار
ہومان	تورانی فوجی
بارمان	تورانی فوجی
افراسیاب	توران کا بادشاہ
کیکاؤس	ایران کا بادشاہ
گستہم	ایرانی سردار
بہرام	قلعہ سفید کے لشکر کا رکن
ہجیر	قلعہ سفید کا محافظ
طوس	سردار
گودرز	سردار

خواتین

تہمینہ	سہراب کی ماں
گرد آفرید	قلعہ سفید کے حاکم کی بیٹی

چند سپاہی- دیہاتی اور کنیزیں

پہلا ایکٹ - پہلا سین

تورانی سرحد پر ایک سرسبز و شاداب پہاڑی مقام

(آسمان میں صبح کا آفتاب اور گھوڑے کی پیٹھ پر رستم دکھائی دیتا ہے)

رستم : دنیا کے لیے روشنی، پھولوں کے لیے مسکراہٹ، پرندوں کے لیے زمزمے، دریاؤں کے لیے ترنم ریز روانی، سوے ہوے قواے عمل کے لیے بیداری کا پیغام لانے والا آفتاب، افق مشرق کی پیشانی پر تاج زرافشاں کی طرح چمک رہا ہے ـــــ کتنا پرجلال نظارہ ـــــ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب نہیں، ایک نور کی کتاب ہے، جس میں دنیا جاگنے کے بعد اپنے ماضی کے خواب کی تعبیر پڑھ رہی ہے۔ ستاروں کے ملک سے آیا ہوا ایک نورانی فرشتہ ہے، جس سے کائنات کی ہر شے زندگی کی برکتیں مانگ رہی ہے ـــــ آسمان کے مانند اس زمین پر بھی ہر روز اسی طرح طلوع و غروب کے منظر دکھائی دیتے ہیں۔ انسانوں کی قسمت کا ستارہ اور قوموں کے اقبال کا آفتاب بھی یوں ہی گم نامی کی رات کا سیاہ پردہ ہٹا کر شہرت کی فضا میں چمکتا، کامیابی کے سنہرے دنوں پر حکومت کرتا اور آخر دنیا کی یاد داشت اور تواریخ کے صفحوں پر اپنے دھندلے یا روشن نشان چھوڑ کر شامِ فنا کی تاریکی میں غائب ہوجاتا ہے۔ ـــ

دنیائے بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے، ہر صبح کی ہے شام

رنگِ زوال سے ہیں رنگے گل بھی خار بھی
دھوکا ہے اس چمن کی خزاں بھی، بہار بھی

(رستم گھوڑے کی پیٹھ سے اترتا ہے)

آفتاب کی سنہری کرنوں کے ساتھ چاروں طرف خوبصورتی اور رنگینی بکھری ہوئی ہے۔ پرندوں کے ترانوں پر ہوا میں موسیقی رقص کر رہی ہے۔ زمین پر صبح کی روشنی، پھولوں کی خوشبو اور بلبل کے نغموں کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگل قدرت کا بنایا ہوا ایک شعر، یہ بلند پہاڑ اُس شعر کا مضمون، یہ بہتے ہوئے چشمے اس شعر کی روانی اور یہ سرخ، سبز، زرد پھول اُس شعر کے حسین استعارے ہیں۔

(پیار سے گھوڑے کی گردن تھپتھپاتا ہے)

میرے بچپن کی رفیق، جوانی کے دوست، میدان جنگ کے وفادار ساتھی، وہ دیکھو، ہرے بھرے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں تمھارے لیے دور تک سبز مخمل کا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ خوشبو میں نہائے ہوئے ہوا کے جھونکے، بار بار تمھیں بلانے آرہے ہیں۔ جاؤ، اُن کی دعوت قبول کرو۔

(گھوڑے کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے)

سردی، گرمی، بھوک، پیاس کی تکلیفوں سے بے پرواہ ہو کر آسمان سے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح جو فضا میں راستہ بھول گیا ہو، دو مہینے سے شکار کے پیچھے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں ـــــ بس شکار اور سفر دونوں ختم ہوئے ـــــ تھکے ہوئے جسم کو تھوڑا آرام دینے کے بعد آج ہی ایران روانہ ہوجاؤں گا۔

(ڈھال کا تکیہ بنا کر زمین پر لیٹ جاتا ہے)

نیند، پیاری نیند۔ تم فطرت کی لاڈلی بیٹی ہو، برکتوں کے ملک کی ملکہ ہو،

آرام کی سلطنت کی شہزادی ہو۔

راہ میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو ٹھکراتی ہوئی
آؤ، آؤ مسکراتی، پھول برساتی ہوئی
رُوح کو تسکین دو اور جسم کو آرام دو
زندگانی کو خدا کا بہترین انعام دو

(دھیرے دھیرے سوجاتا ہے۔ چند تورانی سردار جو ایران کی سیاحت سے واپس ہوکر اپنے وطن سمنگان کی طرف جارہے ہیں، داخل ہوتے ہیں)

سردار ۱: دنیا کے عجائبات میں، تم بھی ایک عجیب چیز ہو۔ بہشت کو دیکھنے کے بعد بھی کہتے ہو کہ بہشت خوبصورت نہیں ہے۔

سردار ۲: ہاں۔

سردار ۱: تب یقیناً تم ایران کے سفر میں آنکھیں ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جمشید اور فریدوں کی سرزمین میں نہیں، کسی شاعر کے خیال کی رنگین دنیا میں سیر کر رہا ہوں۔

سردار ۲: جس طرح موت اور زندگی، ظلمت اور نور، اہرمن اور یزداں میں ازل سے جنگ ہو رہی ہے، اُسی طرح قدیم سے ایران اور توران بھی ایک دوسرے کی دشمنی کو اپنی زندگی کا واجب الادا قرض سمجھتے ہیں۔ ہم تورانی ہیں۔ تورانی کے گلے پر خنجر رکھ دو، تب بھی ایران کی تعریف نہ کرے گا۔

سردار ۱: تعریف نہ کرے گا! کیوں؟

سردار ۲: کیونکہ وہ ہمارے وطن کے دشمنوں کا ملک ہے۔

سردار ۱: ایرانی قوم، تورانی قوم کی دشمن ہے۔ لیکن ایران کے پر عظمت پہاڑ، خوبصورت شہر، شاداب جنگل، پریوں کی زلفوں کی طرح لہراتے، بل کھاتے ہوئے دریا ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ کیا اس سفر میں تورانی سمجھ کر ایران کے آسمان نے تمھیں اپنے سورج چاند کی روشنی نہیں دی۔ ایران کے چشموں نے

تمھاری پیاس نہیں بجھائی۔ ایران کی زمین نے تمھیں بیٹھنے، سونے کی جگہ دینے سے انکار کیا۔ تم دشمنی سے اپنے ہونٹوں کو سچ بولنے کی اجازت نہ دو، لیکن میں توران کے شہنشاہ افراسیاب کے سامنے بھی بے خوف ہوکر کہہ دوں گا کہ دنیا کا بہشت ایشیا ہے اور ایشیا کا بہشت ایران ہے۔

سردار ۲: بس بس۔ میں ایران کی تعریف میں قصیدہ سننا نہیں چاہتا۔ تم شاعر نہیں، سپاہی ہو۔

سردار ۱: میں تمھارے جیسا چھوٹا دل، تنگ نظر، پست خیال لے کر اس دنیا میں نہیں آیا ہوں۔ اچھے کو اچھا کہنا شاعری نہیں، انصاف ہے۔ تم جتنے ایران کے دشمن ہو، اُس سے زیادہ انصاف اور عقل کے دشمن ہو۔

سرادر ۲: تمھارے لفظ زہر کی طرح کڑوے اور چھری کی نوک کی طرح تیز ہیں۔ (میان سے تلوار کھینچ کر) واپس لو، معافی مانگ کر ان لفظوں کو واپس لو۔ ورنہ مجھے اس کا جواب تلوار سے دینا ہوگا۔

سردار ۱: تو اس جواب کا جواب بھی تلوار ہی کی زبان سے سننا ہوگا۔

(دونوں سردار ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں)

سردار ۳: (روکتے ہوئے) یہ کیا! ـــ تلوار اور طاقت کا ایسا ذلیل استعمال!! ـــ کیا دنیا میں اب ہمارا کوئی دشمن نہیں رہا۔ جو تلوار کو زنگ سے بچانے کے لیے ہم نے آپس ہی میں جنگ شروع کر دی۔ تورانیوں کے پاس حربہ، لشکر، دولت، طاقت، ہمت، سب کچھ ہے۔ صرف ایک چیز 'اتفاق' نہیں ہے۔ اس لیے دشمنوں کے مقابلے میں اِن کی ہر فتح، شکست بن جاتی ہے ـــــ تلواریں پھینک دو۔ ٹوٹی ہوئی محبت کو جوڑنے کے لیے ہاتھ ملاؤ ـــــ جو قوم ہمدردی اور اتفاق کے ساتھ ایک دل، ایک خیال ہوکر زندگی بسر کرنا نہیں جانتی ـــــ یاد رکھو اس کی قسمت کے نوشتے پر دائمی ذلت کی مہر ہو چکی۔ وہ آزاد دنیا میں غلامی کے لیے پیدا ہوئی ہے اور آخری سانس تک غیر قوم کی غلام بنی رہے گی۔ ـ

گر دلوں میں اتفاق اور خواہشوں میں میل ہے
زندگی کی راحتوں کو فتح کرنا کھیل ہے
کامیابی کے لیے احساسِ حالت چاہیے
ایک ہو جاؤ اگر دنیا میں عزت چاہیے

(دونوں سردار تلواریں میان میں رکھ کر ہاتھ ملاتے ہیں)

سردار ۱: دوست۔ ندامت کے ساتھ میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں۔

سردار ۲: یہ لڑائی نہ تھی۔ ہماری دوستی نے ایک لحظہ کے لیے تلوار کی جنگ کا خواب دیکھا تھا۔

سردار ۳: ہمیں شام ہونے سے پہلے سمنگان پہنچ جانا چاہیے۔ تلواریں تیز کر چکے۔ اب قدموں کو تیز کرو۔

(آگے بڑھتے ہیں۔ سوئے ہوئے رستم پر نظر پڑتی ہے)

سردار ۱: کون؟ —— یہ انسان ہے! یا قدرت کے جلال، پہاڑ کی مضبوطی، شیر کی ہیبت نے انسان کا جسم اختیار کر لیا ہے!!

سردار ۳: یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوشت اور ہڈی سے گھرا ہوا طاقت کا سمندر، نیند میں چھاتی پھلا کر دھیرے دھیرے سانس لے رہا ہے۔

سردار ۱: اس کے چہرے کی طرف جتنا دیکھو، اتنا ہی تعجب بڑھتا ہے۔ قدرت بھی پیدا کرنے کے بعد، مدتوں اسے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی رہی ہوگی۔

سردار ۴: (گھوڑے کو دیکھ کر) وہ دیکھو۔ ہرن کی آنکھیں، مور کی گردن، گینڈے کی چھاتی، چیتے کی کمر، ہنس کی چال، تمام خوبصورتیوں کو ایک آئینے میں دیکھنا ہو، تو سامنے دیکھو۔

سردار ۱: کیسا شاندار گھوڑا۔ گویا ہری ہری گھاس پر جنگل کا بادشاہ گھوم رہا ہے۔

سردار ۲: اسے باندھ کر سمنگان لے چلو۔ بادشاہ کی نذر کریں گے۔

سردار ۱: لیکن یہ چوری ہے۔

سردار ۲: یہ چوری نہیں ہے۔ کیونکہ چور کو سزا ملتی ہے اور ہمیں بادشاہ سے انعام ملے گا۔

(گھوڑے کو لے کر سب جاتے ہیں۔ رستم آہستہ آہستہ بیدار ہوتا ہے)

رستم: جس طرح گرمی کی گود میں دم توڑتے ہوئے کھیت، بارش ہونے کے بعد زندہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح جاگنے کے بعد سونا اور محنت کے بعد آرام انسان کے جسم میں نئی زندگی اور نئی طاقت پیدا کر دیتا ہے (اُٹھ کر) آفتاب ایران کے شہنشاہِ اعظم کیکاؤس کے اقبال کی طرح بلند ہوتا جاتا اور اس کی دھوپ سخی کی ہمت کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔

(رستم گھوڑے کو پکارتا ہے)

آؤ آؤ۔ جنگ، سیر، سفر، ہر جگہ ساتھ دینے والے دوست، آؤ ـــــ ایران کا راستہ ہماری واپسی کا انتظار کر رہا ہے ـــ نہیں سنا ـــ کہاں ہو؟ ـــ کیا دور نکل ـــ گئے؟ دیکھوں۔

(رستم گھوڑے کی تلاش میں جاتا ہے۔ دو دیہاتی آتے ہیں)

دیہاتی ۱: گھوڑا تھا یا خوب صورت طوفان! اس کی نسوں میں لہو کی جگہ بجلی بھری ہوئی تھی۔

دیہاتی ۲: اس کے جسم کے ہر جھٹکے کے ساتھ دو چار آدمی زمین پر گیند کی طرح لڑھکتے دکھائی دیتے تھے۔

دیہاتی ۱: اور ہر لات پر دو چار پسلیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

دیہاتی ۲: جب گھوڑا اتنا بہادر ہے، تو اس کا مالک کتنا بہادر ہوگا؟

دیہاتی ۱: یہ کون آرہا ہے؟ ـــــــ ماتھے پر شکن، بھوؤں میں کھنچاؤ، آنکھوں میں سرخی، چہرے پر غصے کی تمتماہٹ،!! کیا اس جنگل کو اس کے کسی جرم کی سزا دینا

چاہتا ہے؟

(رُستم واپس آتا ہے)

رستم : کہیں دکھائی نہیں دیا۔ کہیں پتہ نہیں ملا۔ کیا میں یہ یقین کرلوں کہ جس طرح انسان کو بڑھاپے میں تندرستی چھوڑ دیتی ہے۔ دوسری جگہ لیاقت سے زیادہ تنخواہ مل جانے پر آقا کو نمک حرام نوکر چھوڑ دیتا ہے۔ مصیبت آجانے پر خوشامدی مصاحب اور جھوٹے دوست چھوڑ دیتے ہیں۔ اُسی طرح دنیا سے دغابازی سیکھ کر آج میرے رخش نے بھی مجھے چھوڑ دیا ـــــ نہیں نہیں ـــــ یہ ناممکن ہے ـــــ پھر کہاں ڈھونڈوں؟ کس سے پوچھوں؟ ـــــ آسمان سے پوچھا ـــــ زمین سے پوچھا۔ چشمے کی لہروں، ہوا کے جھونکوں، جنگل کے درختوں سے پوچھا۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ سب چُپ ہیں ـــــ سنو سنو، درختو سنو۔ تمھارے ہی سبز سائے کے نیچے میری زندگی کا سایہ غائب ہوا ہے۔ اُسے پیدا کرو۔ ورنہ اس جنگل میں آگ لگا کر تمھیں دھویں اور بربادی میں دفن کر دوں گا۔

زمیں کنیز مری ہے، فلک غلام مرا
اجل کی طرح ہے بے رحم، انتقام مرا
زمانہ جس سے لرزتا ہے میں وہ رستم ہوں
نہیں سنا ہو تو اب سن لو مجھ سے نام مرا

دیہاتی ۱ : یہاں سے نکل چلو۔ یہ آدمی بھوکے شیر کی طرح خوفناک ہو رہا ہے۔

(دونوں دیہاتی بھاگنا چاہتے ہیں۔ رستم انھیں روکتا ہے)

رستم : ٹھہرو ـــــ

دیہاتی ۲ : آپ آگ کے گولے کی طرح گرم ہو رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے ہوجیے۔ ہم لوٹ کر آتے ہیں۔

رستم : (زمین پر لات مار کر) میں حکم دیتا ہوں۔ ٹھہرو۔ (دونوں خوف سے کانپتے

ہیں) تمھیں موت کا حکم نہیں سنایا گیا۔ پھر کانپ کیوں رہے ہو؟

دیہاتی ۱: جناب کانپتا کون ہے؟ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اس لیے ذرا ٹانگوں کو سردی معلوم ہوتی ہے۔

رستم : (ڈانٹ کر) تم کون ہو؟

دیہاتی ۲: (گھبرا کر) ہم... ہم... آدمی ہیں۔

رستم : (زمین پر دوبارہ لات مار کر) میں کب کہتا ہوں، تم گھاس پتھر ہو۔

(دونوں خوف سے گر پڑتے ہیں)

دیہاتی ۱: گھر سے نکلتے وقت آج ضرور ہم نے کسی منحوس کا منھ دیکھا تھا۔

رستم : بزدلو اٹھو، کھڑے ہو۔ اور جو پوچھوں، اس کا جواب دو۔ اُٹھتے ہو یا......

(گھونسا تانتا ہے)

دیہاتی ۲: اٹھو بابا۔ ہم زمین سے نہ اٹھے تو یہ ہمیں دنیا ہی سے اٹھا دے گا۔

رستم : تم دونوں کہاں رہتے ہو؟

دیہاتی ۱: اس جنگل سے تھوڑی دور پر ایک گاؤں میں۔

رستم : تم قریب کے گاؤں میں رہتے ہو؟

دیہاتی ۲: جناب ہم دونوں غریب کسان ہیں۔ بادشاہ کے محل میں پیدا نہیں ہوئے۔ جنت کے لائق نہیں۔ جہنم میں جانا نہیں چاہتے۔ پھر گاؤں میں نہ رہیں گے تو کہاں رہیں گے؟

رستم : تم یہیں کے رہنے والے ہو، تو ضرور دیکھا ہوگا؟

دیہاتی ۱: کسے دیکھا ہوگا؟

رستم : خبردار ـــــ میرے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرنا (گلا پکڑ کر) اقرار کرو کہ.....

دیہاتی ۲: مگر گردن توڑنے سے پہلے یہ تو بتا دیجیے، کس بات کا اقرار کریں؟

رستم : کہ تم نے میرے وفادار گھوڑے کو دیکھا ہے۔

دیہاتی ۱: ارے! تو کیا وہ شیرنی کے دودھ سے پلا ہوا گھوڑا، آپ ہی کا تھا!!؟
رستم : ہاں۔ وہ کہاں ہے؟
دیہاتی ۲: تورانی سرداروں کے قبضے میں۔
دیہاتی ۱: وہ اسے گرفتار کرکے اپنے بادشاہ کو نذر دینے کے لیے سمنگان لے گئے ہیں۔
رستم : تو بکتا ہے۔ جھوٹا ہے۔ پاگل ہے۔ ناممکن کو ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔ طوفان زنجیروں میں نہیں جکڑا جاسکتا۔ بجلی رسیوں میں نہیں باندھی جا سکتی ـــــ اس دنیا میں کسی ماں نے ایسا جری و بے خوف لڑکا پیدا نہیں کیا، جو رستم کے رخش نامی گھوڑے پر اپنی سواری کا زین کس سکے۔ تیری آنکھوں نے تجھے دھوکا دیا، اور تو مجھے دھوکا دے رہا ہے۔
دیہاتی ۲: میں۔ نہیں سچ بات کا یقین نہ کر کے، آپ خود اپنے کو دھوکا دے رہے ہیں۔
رستم : تیری سچائی کا ثبوت؟
دیہاتی ۱: ثبوت اور گھوڑا، دونوں آپ کو سمنگان میں ملیں گے۔

(دونوں دیہاتی چلے جاتے ہیں)

رستم : سمنگان! کون سمنگان؟ توران کی ایک چھوٹی سی ریاست۔ زمین کے نقشے میں ایک دھندلا سا نشان۔ دنیا کے جغرافیہ میں ایک حقیر نقطہ!! ـــــــــ (ڈھال اور گرز اٹھا کر) دیکھوں گا۔ دیکھوں گا۔ سمنگان دیکھوں گا۔ کہ تیرے قلعے کی دیواریں، تیرے بادشاہ کے تخت کے پائے، تیرے بہادروں کے دل اور بازو کتنے مضبوط ہیں؟ ـــــ اپنے سپاہیوں سے کہہ دے کہ اپنی کمانیں چڑھالیں، اپنے ترکشوں میں تیر بھرلیں، اپنی تلواروں پر سان دے لیں۔ تیرے آسمان کو لہو کی چھینٹوں سے اور تیری زمین کو لاشوں سے ڈھانک دینے کے لیے رستم آندھی اور طوفان بن کر تیری طرف آرہا ہے۔ اب دنیا میں فنا کا تاریک سایہ تیری آخری جائے پناہ۔ اور بربادی تیرا

آخری ورشہ ہے۔ ۔

پیے گا خون کہ غصہ ہے تشنہ لب میرا
کہیں پناہ نہ دے گا تجھے غضب میرا
گھرا ہے شعلوں میں تو بھی، ترا مقدر بھی
بجھا سکے گا نہ اس آگ کو سمندر بھی

(انتہائی جوش و خروش کے ساتھ رستم سمنگان کی طرف روانہ ہوتا ہے)

پہلا ایکٹ - دوسرا سین

شاہ سمنگان کی سال گرہ کا جلسہ

(امرائے سلطنت حاضر ہیں۔ حبشی و تاتاری غلام کندھوں پر شراب کی زر نگار صراحیاں اور ہاتھوں میں طلائی جام لیے کھڑے ہوئے ہیں)

شاہ سمنگان : سمنگان کے ستارو! تاج کے وفادارو!! یہ دنیا ازل سے ابد کی طرف جانے والا ایک راستہ ہے۔ اس راستے پر خدا کے سوا، خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سفر کر رہی ہے۔ آج میری عمر کے مسافر نے بھی زندگی کے سفر میں اس راستے کی پچاس منزلیں طے کر لی ہیں۔ ؎

کل بڑھاپا بھی نہ ہوگا، نوجوانی کی طرح
ساتھ دنیا کے بہے جاتے ہیں پانی کی طرح
کس طرف کو جا رہے ہیں ہم، پتہ کوئی نہیں
اس سفر کی ابتدا ہے، انتہا کوئی نہیں

وزیر : ؎

حیات جاودانی دے خدا اس دار فانی میں
ہماری عمر بھی مل جائے تیری زندگانی میں

پیلسم : ؎

خوشی کا دن مسرت کا زمانہ بار بار آئے
ہزاروں بار یوں ہی اس گلستاں میں بہار آئے

(کنیزوں کا رقص۔ رقص کے بعد وزیر ادب سے بادشاہ کے روبرو
اور ساقی امرائے دربار کے روبرو جام شراب پیش کرتے ہیں)

وزیر : (ساغر پیش کرکے)

غلام سلطنت ہوں اور یہ نذر عاجزانہ ہے
مے رنگیں نہیں، یہ ساز ساغر کا ترانہ ہے

امیرا: (پیالہ ہاتھ میں لے کر)۔

شراب ناب کے جلووں سے ساغر میں اُجالا ہے
ہزاروں چودھویں کے چاند ہیں اور ایک ہالا ہے

پیلسم : (جام بلند کرکے)۔

یہ وہ شے ہے، گرے تو خاک سے اکسیر پیدا ہو
ہر اک قطرہ سے ایک اک حسن کی تصویر پیدا ہو

(پیالہ ہونٹوں تک لے جاتے ہیں۔ رستم غصے اور جوش میں داخل
ہوتا ہے)

رستم : بس۔ دنیا میں تمھاری خوشی کے دن ختم ہوچکے۔ پیالے پھینک دو۔ صراحیاں توڑ دو۔ اپنی ہنسی کو آنسوؤں میں بہا دو۔ (بادشاہ سے) تم ہی سمنگان کے بادشاہ ہو؟ (درباریوں سے) تم ہی اس تخت و تاج کے قوی بازو محافظ ہو (دوبارہ بادشاہ سے) یہی آنکھیں ہیں جو اپنے سوا تمام دنیا کو حقارت سے دیکھتی ہیں (دوبارہ درباریوں سے) یہی ہاتھ ہیں، جو شیر کی کلائی مروڑنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

کمانیں بھی ہیں، ڈھالیں بھی ہیں، کندھوں پر تبر بھی ہے
کرو ثابت کہ ان سینوں میں دل بھی ہے جگر بھی ہے
بڑھو جوہر دکھاؤ آج، اگر تلوار باندھی ہے

میں آیا ہوں کہ دیکھوں کون بجلی، کون آندھی ہے

پیلسم : شاہی دربار میں آج تک کسی نے اس جوش و دلیری کے ساتھ گفتگو کی جرأت نہیں کی۔ تم مظلوم ہو، فریادی ہو، دیوانے ہو؟ کون ہو؟

رستم : میں کون ہوں؟ اس تخت کے لیے زلزلہ ـــــــ اس سلطنت کے لیے تہلکہ۔ اس تہنیت کے ترانوں سے گونجتی ہوئی محفل نشاط میں موت کی گرج۔ ے

عدو کو پھونک دے وہ برق شعلہ فام ہوں میں
خدا کے قہر کا اک نقشِ انتقام ہوں میں
فنا کے ہونٹ سے نکلا ہوا پیام ہوں میں
اجل کے ہاتھ کی شمشیر بے نیام ہوں میں
یہ بزم عیش چمکتی ہے جو ستاروں سے
جلے گی اب مری تلوار کے شراروں سے

پیلسم : ادب سیکھ، ادب سیکھ۔ یہ ہمارے بادشاہ کا انتہائی رحم ہے کہ ابھی تک تجھے اس گستاخی کی سزا نہیں دی گئی۔

رستم : عورتوں کی طرح تمھاری زبان میں طاقت ہے۔ مگر مجھے سزا دینے کے لیے تمھارے بازوؤں میں طاقت نہیں ہے۔ ے

ہستی ناچیز بپھرے گی فنا کے سامنے
شمع کی لو سر اٹھائے گی ہوا کے سامنے
گھاس کا تنکا سزا دے! اور کسے؟ طوفان کو!!
تم نے دیکھا ہی نہیں اب تک دلیر انسان کو

پیلسم : بس۔ اس سے زیادہ تحمل نہیں ہوسکتا۔ تیری گستاخی برداشت کی حد سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ے

زباں اور سر کٹا دیتی ہیں تلخ و تیز تقریریں
نہ لہرائیں کہیں ناگن کی صورت سر پہ شمشیریں
ہماری بھی رگوں میں زندگی کا خون بہتا ہے

سمجھ رکھا ہے کیا تو نے ہمیں بے جان تصویریں؟

رستم : زمین پر اگی ہوئی گھاس، جیسے پیروں سے روندتا ہوا یہاں تک آیا ہوں، میں اس سے بھی زیادہ تمھیں بے حقیقت سمجھتا ہوں۔ سنو، تم سمنگان کے شاہی دربار میں نہیں، قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے مجرموں کی طرح میرے غصے کی عدالت میں کھڑے ہوے ہو۔ اگر دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، تو میرے غضب کے سامنے گھٹنے ٹیک کر، سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر، پیکر ندامت و زبانِ التجا بن کر اپنے قصور کے لیے معافی اور اپنی زندگیوں کے لیے رحم مانگو۔

شاہ سمنگان : اے شخص۔ میں بڑی دیر سے تیری دیوانگی آمیز گستاخیوں کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں ـــــ کسی مقدمے میں انصاف، کسی قصور کی معافی، کسی خدمت کا انعام۔ بیان کر، تو کیا چاہتا ہے؟

رستم : میں اپنا رخش نامی گھوڑا چاہتا ہوں۔ تیری سلطنت میں شریفوں کا چہرہ لگا کر پھرنے والے ڈاکو اسے تورانی سرحد سے چُرا لائے ہیں۔ اگر تو نے آج ہی، اسی وقت، اسی جگہ اُسے حاضر نہ کیا، تو اس دنیا میں تیری ہستی اور اس زمین پر سمنگان دکھائی نہ دے گا۔ ؎

قسم خورشید کی نوری زرہ جس کے بدن پر ہے
قسم مہتاب کی جو دستِ شب کا گرز پُرزر ہے
قسم ہے کہکشاں کی، جو کمان چرخ اخضر ہے
قسم ہے آسماں کی، جو شفق کے خون سے تر ہے
دکھائی دوگے یوں تم آب خنجر کی روانی میں
بہیں آتش زدہ کشتی کے تختے جیسے پانی میں

شاہِ سمنگان: تو اس دعوے سے باتیں کر رہا ہے۔ گویا تباہی تیرے اشارے اور موت تیرے غصے کا نام ہے۔ انسان اتنا خوفناک نہیں ہوتا۔ میں تیرا نام جاننا چاہتا ہوں؟

رستم : میرا نام سنتے ہی اس دربار کی دیواریں کانپ اٹھیں گی۔ یہ شراب اور غرور کے نشے سے سرخ چہرے زرد ہوجائیں گے اور تو آندھی کے تھپیڑے سے ہل گئے ہوئے درخت کی طرح تھرتھراتا ہوا تخت سے نیچے گر پڑے گا۔ ـ

روح یوں لرزے گی گویا دب گئی ہے برف میں
اس قدر ہیبت ہے میرے نام کے ہر حرف میں
شور سے گونجا ہوا ہر شہر، ہر ویرانہ ہے
نام میرا شیر کا اک نعرۂ مستانہ ہے

شاہ سمنگان : چاہے تیرے نام کے ہر حرف میں ایک زلزلہ اور ہر نقطے میں ایک کوہ آتش فشاں پوشیدہ ہو۔ چاہے تیرا نام سنتے ہی ہمارے کانوں کے پاس ہزاروں بادل ایک ساتھ گرج اٹھیں، پھر بھی ہم تیرے نام سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

رستم : اِن بازوؤں کی طاقت نے شہرت کی سنہری روشنائی سے ایران اور توران کے ذرے ذرے پر میرا نام لکھ دیا ہے۔ میں سام و نریمان کا جگر بند، زال و رودابہ کا فرزند، زابلستان کا جرار، فارس کا مددگار۔ ـ

شاہِ کیکاؤس کے اقبال کی تنویر ہوں
فاتح مُلک شجاعت، مالک شمشیر ہوں
تیر و ترکش میرے خادم، گرز ہے ہمدم مرا
کام ہے میداں نوازی نام ہے رستم مرا

(سب چونک پڑتے ہیں۔ بادشاہ گھبرا کر تخت سے اتر آتا ہے)

شاہِ سمنگان : (تخت سے اترتے ہوئے) رستم! رستم!! کیا وہی رستم جس کی عظمت مآب ہستی پر آج ایران فخر کر رہا ہے؟ جس کے کوہ شکن بازوؤں کے سامنے دنیا کی تمام طاقتیں اپنی کمزوری اور مجبوری کا اقرار کر رہی ہیں؟ جس کی تلوار فاتحین عالم کے جسموں سے روحوں کا خراج طلب کر رہی ہے؟

رستم : ہاں۔ میں وہی رستم ہوں۔ گھوڑا دو یا جنگ کرو۔ بولو۔ زندگی اور موت دونوں میں کسے پسند کرتے ہو؟

شاہ سمنگان : نامور رستم۔ ایرانی اور تورانی تلواروں کے ٹکرانے کی جگہ شاہی دربار نہیں میدان جنگ ہے۔ آیئے۔ بیٹھیے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں —— میں میزبان اور دوست کی حیثیت سے آپ کا خیرمقدم کرتا ہوں۔

رستم : اس دنیا میں میرا سب سے بڑا دوست میرا وفادار گھوڑا ہے۔ جب تک وہ نہ مل جائے، میں تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔

شاہ سمنگان : آپ دو روز کے لیے ہماری مہمانی قبول کیجیے۔ گھوڑا موجود ہے۔ سمنگان سے رخصت ہونے کے پہلے آپ کا گھوڑا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوجائے گا۔

رستم : اپنا وعدہ پورا کروگے؟

شاہ سمنگان : اگر انسان ہونے کا دعویٰ ہے۔

رستم : مہمان بنا کر دھوکا تو نہ دوگے؟

شاہ سمنگان : اگر کمینہ کہلانے کی شرم ہے۔

رستم : اپنی دوستی کا ثبوت دو۔

پیلسم : ٹھہریے، جلالت مآب ٹھہریے۔ اس تاج و تخت کی حفاظت کرنے والے جاں نثاروں کی طرف سے سمنگان کی وفادار رعیت کی طرف سے، تورانیوں کی حمیت اور غیرت کی طرف سے، یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ آپ کس کی مرضی سے توران کے سب سے بڑے دشمن کو اپنا مہمان بنا رہے ہیں؟

شاہ سمنگان : اس سوال کا مطلب؟

پیلسم : جس طرح رعایا اپنے بادشاہ کی اطاعت گزار ہوتی ہے، اُسی طرح بادشاہ بھی، ملک کی آواز اور رعیت کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔ جب تک بادشاہ اور رعیت کی رائے و خواہش میں اتفاق نہ ہو، حکومت کی عمارت امن و اطمینان کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی۔

شاہ سمنگان : میں دوبارہ پوچھتا ہوں کہ ان لفظوں کا کیا مطلب ہے؟

پیلسم : آسمان کی سلطنت میں تنہا حکومت کرنے والے آفتاب کی طرح آپ خودمختار و آزاد نہیں۔ بلکہ آفتاب سے روشنی اکتساب کرنے والے چاند کی مانند، توران کے شہنشاہ افراسیاب کے زیر اثر و ماتحت ہیں۔ اس لیے توران کے دشمن کو مہمان بناکر، دنیا میں تورانیوں کو بزدل اور بے حمیت ثابت نہ کیجیے۔ اس شرم ناک جرأت کو نہ سمنگان کی رعیت معاف کرے گی اور نہ توران کا شہنشاہ افراسیاب۔

رستم : افراسیاب! کون افراسیاب؟ ـــــ وہی جو صدہا مرتبہ اپنی نامردی سے میدان جنگ کو ذلیل کرچکا ہے۔ جو کتنی ہی بار، رستم کی تلوار سے زندگی کی بھیک مانگ چکا ہے۔ جو زندوں کی دنیا میں صرف اپنی ذلت اور شکست پر آنسو بہانے کے لیے جی رہا ہے۔ ـ

سرکشی میں جو فلک ہے، روندے جانے میں زمیں
جس میں ہمت ہے نہ غیرت، جس کی دنیا ہے نہ دیں
جا۔ ذرا اس کو، جو تجھ سا بزدل و نامرد ہے
وہ ترا افراسیاب، ان ٹھوکروں کی گرد ہے

پیلسم : (درباریوں سے) جس کے پہلے ہی لفظ پر تلوار کو میان سے تڑپ کر باہر نکل آنا چاہیے تھا۔ اس کی یاوہ گوئی کا جواب دینے کے لیے ابھی تک تمھاری زبانوں اور ہاتھوں کو حرکت نہیں ہوتی!! کیا تم بے حس ہو۔ مردہ ہو۔ انسان نہیں، زندگی کے خیالی سائے ہو؟ ـ

شرم ہے تم پر -- اگر دنیا میں یہ زندہ رہے
ہاں بڑھو -- توران کا اقبال تابندہ رہے

(پیلسم اور اس کے ساتھی رستم پر حملہ کرتے ہیں۔ رستم حملہ آوروں کو شکست دینے کے بعد پیلسم کو زمین پر گرا کر خنجر نکالتا ہے۔ شاہ سمنگان رستم کا ہاتھ تھام کر التجا آمیز نگاہوں سے پیلسم کے لیے رحم طلب کرتا ہے)

پہلا ایکٹ - تیسرا سین

سمنگان کا شاہی محل

(شہزادی تہمینہ اور کنیزیں آتی ہیں)

تہمینہ : نیلا آسمان، ہنستا ہوا چاند، جگمگاتے ہوئے تارے۔ کتنی حسین رات ہے۔ دن کے سوتے ہی دنیا کی خوبصورتی جاگ اٹھتی ہے ــــ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ درخشاں نظارہ قدرت کی شاعری ہے اور رات چاندنی کی چادر اوڑھے ہوئے اس حسین شاعری کا مطالعہ کر رہی ہے۔

کنیز ا : اور مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سمنگان کی شہزادی کے حُسن کا مقابلہ کرنے کے لیے، نیلم کے تخت پر بیٹھی ہوئی رات کی ملکہ۔ چاند کا آئینہ سامنے رکھ کر اپنے سیاہ بالوں میں تاروں کے موتی پرو رہی ہے۔

تہمینہ : تم نے میرے حُسن کی تعریفیں کرنا کس سے سیکھا؟

کنیز ا : حُسن کے مصاحب سے۔

تہمینہ : کون مصاحب؟

کنیز ا : آپ کا آئینہ۔ وہی آئینہ جس کے اندر آپ کا چہرہ اس طرح نظر آتا ہے، گویا چاندی کے چشمے میں سونے کا پھول تیر رہا ہو۔

تہمینہ : آئینہ تو خوشامدی ہوتا ہے۔

کنیز ا : معاف کیجیے۔ وہ بدصورت چہرے کی کبھی خوشامد نہیں کرتا۔

تہمینہ : اری بیوقوفو! عورت کا حسن وہم کا خواب، خیال کی حماقت، یقین کی دیوانگی ہے۔ وہ خوبصورتی جو عمر بڑھنے کے ساتھ کم ہو جاتی، ڈوبتے ہوئے دن کی

روشنی کی طرح پھیکی پڑجاتی اور بجلی کی طرح چمک کر، پھول کی خوشبو کی طرح اڑجاتی ہے۔ میں اُس آنی اور فانی خوبصورتی کو عورت کے ساتھ جوانی کا مذاق سمجھتی ہوں۔ ۔

بہار دل ربائی، ایک دھوکا، ایک سایہ ہے
یہ کچا رنگ مٹی کے کھلونوں پر چڑھایا ہے
کہاں کا حُسن؟ پاگل ہے جو اترائے جوانی پر
ہوا سے بن گئی ہیں کچھ لکیریں، بہتے پانی پر

(ایک اور کنیز آتی ہے)

کنیز ۲: حضور۔ سنتے ہی چونک اٹھیے گا۔ میں آپ کے لیے اس پرانی دنیا کی ایک نئی خبر لائی ہوں۔

تہمینہ: نئی خبر!

کنیز ۲: جی ہاں۔ نئی، اچھوتی، کنواری خبر۔ اس دنیا کے سارے جھگڑوں کی جڑ تین چیزیں ہیں۔ زر، زمین، زن۔ سلطنت کے لیے، دولت کے لیے، عورت کے لیے تو لڑائیاں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن ایک گھوڑے کے لیے خون خرابہ ہوتے آج ہی دیکھا۔

تہمینہ: لڑائی ہوئی! —— کہاں؟

کنیز ۲: دربار میں۔

تہمینہ: کس سے؟

کنیز ۲: ہمارے وزیر جنگ پیلسم اور ایران کے سپہ سالار رستم سے۔

تہمینہ: ایران کے دربار کی زینت رستم، سمنگان کے دربار میں کیسے آگیا؟

کنیز ۲: اپنے کھوئے ہوئے گھوڑے کی تلاش میں۔

تہمینہ: تو لڑائی کی وجہ؟

کنیز ۲: انسانیت و شرافت کا فرض سمجھ کر ہمارے بادشاہ نے گھر آئے ہوئے قومی دشمن کو مہمان بننے کے لیے دعوت دی۔ اس دعوت کو پیلسم اور اس کے ہم

خیال سرداروں نے توران کی بے عزتی سمجھا۔ اسی بنیاد پر بات بڑھ گئی اور ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔

تہمینہ : کہاں رستم اور کہاں سمنگان! تو ضرور کوئی خواب دیکھ کر آئی ہے۔

کنیز۲ : تلواروں کی گھٹا میں رستم کو بجلی کی طرح چمکتے ہوئے دیکھ کر مجھے بھی اس نظارے پر خواب ہی کا دھوکا ہوا تھا۔ لیکن اپنے حریف کو شکست دینے کے بعد، جب رستم کو جہاں پناہ کے ساتھ آرام کے لیے محل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ تب یقین ہوا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہی، جاگ رہی ہوں۔

تہمینہ : وہ سمنگان میں کب تک رہے گا؟

کنیز۲ : پرسوں شام تک۔ کیونکہ گھوڑے کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے بادشاہ نے دو روز کا وعدہ کیا ہے۔

تہمینہ : میں برسوں سے رستم کا پُرجلال نام اور اُس کی جرأت و دلیری کے عجیب و غریب کارنامے سن رہی ہوں۔ جب دشمن بھی بے اختیار ہوکر اس کی بے مثال بہادری کی تعریف کرتے ہیں تو میں سوچ میں پڑجاتی ہوں، کہ وہ کتنا اقبال مند اور کیسا شاندار آدمی ہوگا۔ جس کی شہرت نے تمام دنیا کو فتح کر لیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار اسے چھپ کر دیکھوں اور معلوم کروں کہ دنیا اس کی اتنی تعریف اور اتنی عزت کیوں کر رہی ہے؟

کنیز۲ : آپ رستم کو دیکھنا چاہتی ہیں؟

تہمینہ : اگر ممکن ہو ـــــ لیکن چھپ کر ـــــ اور وہ بھی صرف ایک بار۔

کنیز۲ : لیکن یہ خیال رہے کہ رستم نے دنیا کو فتح کرنے کی قسم کھائی ہے۔ آپ بھی دنیا کی حسین ترین شے ہیں۔ کہیں وہ محبت کی طاقت سے آپ کو بھی فتح نہ کرلے۔

تہمینہ : تو مجھ سے مذاق کرتی ہے۔

کنیز۲ : یہ مذاق نہیں، پیشین گوئی ہے۔ کیونکہ میں حسن و عشق کی قسمت کا حال بتانے والی نجومی ہوں۔

پہلا ایکٹ - چوتھا سین

آراستہ خواب گاہ

(رات کا وقت ہے۔ خواب گاہ کی کھڑکیوں سے شہر سمنگان کے گھروں کی روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ شاہ سمنگان اور رستم بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور چند غلام قریب ہی ہاتھ باندھے حکم کے منتظر کھڑے ہیں)

شاہ سمنگان : پیلسم کی زندگی اسے واپس دے کر آپ نے ثابت کر دیا کہ جو بہادر ہوتا ہے، وہ رحم دل بھی ہوتا ہے۔ ہاتھ میں انتقام کا حربہ اور بازوؤں میں سزا دینے کی طاقت ہو کر دشمن کو معاف کر دینا، یہ دنیا کی فتوحات میں سب سے بڑی فتح ہے۔

رستم : لیکن معافی ملنے کے بعد بھی پیلسم کا چہرہ حسد کی آگ کے دھویں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ میرا تجربہ اس یقین کی طرف رہنمائی نہیں کرتا کہ وہ میری عطا کردہ معافی کی قدر کرے گا۔

شاہ سمنگان : اگر قدر نہ کی تو میں سمجھوں گا کہ اُسے اپنے کندھوں پر اپنا سر بوجھ معلوم ہو رہا ہے۔ (شراب کا پیالہ بڑھا کر) ۔

ہاں نگاہِ لطف ہو اس ساغر لبریز پر
کیجیے ہونٹوں سے مُہر الفت کی دستاویز پر

رستم : (جواب میں پیالہ بھر کر) آپ بھی دوستی کی دستاویز کی شرط پوری کیجیے۔ ۔

موج شراب مست ہے جام شراب میں
اک نازنین جھوم رہی ہے شباب میں
گردش میں بلبلے ہیں، کہ تاروں کا رقص ہے
سرخی ہے یا کھلی ہے شفق آفتاب میں

شاہ سمنگان : اب رات کی آنکھوں میں نیند کا خمار دکھائی دے رہا ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں آپ کو شب بخیر کہوں؟

رستم : اس میزبانی کا شکریہ۔

شاہِ سمنگان : میری دعا ہے کہ آپ آرام کی نیند سوئیں اور مسرت کا خواب دیکھ کر ہنستے ہوئے بیدار ہوں۔

(شاہِ سمنگان غلاموں کے ساتھ جاتا ہے)

رستم : موت کیا ہے؟ ایک لمبی نیند ـــــ اور نیند کیا ہے؟ ایک مختصر موت ـــــ سونا اور مرنا، دونوں ہی موت کی دو شکلیں ہیں۔ لیکن کیسے تعجب کی بات ہے کہ انسان، ایک کو آرزو اور التجاؤں سے بلاتا اور دوسرے کا نام سنتے ہی خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔ (پلنگ پر بیٹھ کر) ـ

آسماں کے ہاتھ میں ہے چاند کا زریں ستار
گونج اُٹھے نغمۂ راحت سے اس کا تار تار
رات تھوڑی رہ گئی ہے، صبح ہے جانا مجھے
ہاں سناؤ۔ اے ستارو! نیند کا گانا مجھے

(رستم سوجاتا ہے۔ پیلسم اپنے ہمراہیوں کے ساتھ چوروں کی طرح داخل ہوتا ہے)

پیلسم : خاموش۔ آہستہ۔ پیروں کے نیچے کی زمین بھی تمھارے پاؤں کی آواز نہ سن سکے۔

ہمراہی ۱ : ہاتھ میں چمکتے ہوئے خنجروں کی طرح، ہمارے پاؤں بھی ہمارے قبضے میں

ہیں۔ بڑھو۔

پیلسم : ٹھہرو ـــــ بڑھنے سے پہلے اپنی حمیت اور ہمت کا ایک بار پھر امتحان کر لو۔ رستم کے ہاتھ سے سر دربار ذلیل ہونے کے بعد، قسمت کا یک طرفہ فیصلہ سمجھ کر تم اپنی بے عزتی پر صبر کر چکے تھے۔ لیکن میں نے اپنی شجاعت آمیز تقریر سے تمھاری روح پر شرم کی ضرب لگا کر سوئے ہوئے جذبۂ غیرت کو بیدار کیا۔ تمھاری مردہ ہمتوں میں جان ڈالی۔ تمھارے خون میں جو پانی بن گیا تھا، پھر سے سرخی اور گرمی پیدا کی اور تم سب نے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی......

ہمراہی ۲ : دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنی ذلت بھی یاد ہے۔ اور قسم بھی۔

ہمراہی ۳ : دنیا کا خیال ہے کہ سیاہ چیز پر کوئی رنگ نہیں چڑھتا۔ آج ہم اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے، رستم کے خون سے رات کی سیاہ چادر کو سرخ بنانے آئے ہیں۔

پیلسم : تب جاؤ۔ پہلے اُس کے گُرز اور ترکش پر قبضہ کر لو (ساتھی رستم کے گرز و ترکش کو اٹھا لیتے ہیں) دیکھتے ہو، کس اطمینان اور آرام کے ساتھ سو رہا ہے۔ دشمنوں کے ملک میں، دشمنوں کی چھت کے نیچے تم نے کسی انسان کو اس طرح نڈر ہوکر سوتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔ گویا یہ فیصلہ کرنے کے بعد سویا ہے کہ دنیا میں اور سب کچھ ہے، لیکن فکر خوف اور موت نہیں ہے۔

(پیلسم رستم کو چھری مارنے جاتا ہے۔ تہمینہ کی آہٹ سنائی دیتی ہے)

ہمراہی ۱ : ہوشیار کوئی آ رہا ہے۔

پیلسم : یہ کون؟ تہمینہ! ـــــ رستم کی خواب گاہ میں سمنگان کی شہزادی۔ جس طرح اس کے باپ نے دشمن کو مہمان بنا کر سارے توران کو بے عزت کیا، کیا اسی طرح یہ بھی جوانی کے نشے سے اندھی ہو کر رستم کی آغوش میں اپنے حسن و عصمت کو ذلیل کرنے آئی ہے!!!

ہمراہی ۲: ہم نے تو سنا تھا کہ صورت کی طرح اس کی سیرت بھی حسین ہے۔
ہمراہی ۳: چھپ جاؤ اور سنو۔ اس کی باتوں سے اس کا ارادہ ظاہر ہوجائے گا۔
پیلسم : اگر یہ ناپاک ارادہ اور پُر گناہ خیال لے کر یہاں آئی ہے تو قسم ہے سمنگان کی عزت کی۔

نہ رہنے دوں گا کوئی نقش اس شاہی نگینے میں
یہ خنجر بھونک دوں گا سب سے پہلے اس کے سینے میں
ہزاروں کھیل دیکھے، دیکھنا تم یہ تماشا بھی
تڑپتا ہوگا رستم کے بغل میں اس کا لاشہ بھی

(سب چھپ جاتے ہیں۔ تہمینہ خوفزدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

تہمینہ : شرم اور دل کی جنگ کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ شرم کہتی ہے، لوٹ چل اور دل کہتا ہے آگے بڑھ (سوچتی ہے) اگر وہ جاگ کر پوچھ بیٹھا کہ تم کون ہو؟ کیوں آئی ہو؟ تو دیوانوں کی طرح حیرت سے اس کا منہ تکنے یا شرم سے سر جھکا لینے کے سوا اور کیا جواب دے سکوں گی ـــــــ نیند، میٹھی نیند۔ تیری پلائی ہوئی شراب سے رستم کی آنکھیں مدہوش ہو رہی ہیں۔ میں التجا کرتی ہوں کہ میرے واپس جانے تک تو اس نشے کو قائم رکھ۔ ہمت مجھے سہارا دے۔ (آہستہ آہستہ قریب جاکر رستم کو دیکھتی اور حیرت زدہ رہ جاتی ہے) میں سمجھتی تھی کہ ایسا چہرہ دیکھوں گی جس کے نقش و نگار میں شیر کی ہیبت، موت کی سختی، دوپہر کی دھوپ کا جلال اور آسمان کا غرور دکھائی دے گا۔ لیکن کیا دیکھا؟ نیند کی انگوٹھی میں ایک بیش قیمت ہیرا، جو بہادری، نیکی، شرافت کی روشنی سے چمک رہا ہے۔ ایک زمین کا چاند، جس کے سامنے آسمان کا چاند بھی کرنوں کا دامن پھیلا کر مردانہ حسن کی بھیک مانگ رہا ہے۔

تجلی صبح کی اور دبدبہ ہے بادشاہوں کا
یہ چہرہ دیکھنے سے نور بڑھتا ہے نگاہوں کا

(تہمینہ جھک کر غور سے رستم کو دیکھتی ہے۔ رستم جاگ اٹھتا ہے)

رستم : (پلنگ سے دھیرے دھیرے اُٹھ کر) آنکھوں! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں! ۔

بہار روح ہے، یا نور، صبح زندگانی کا
تبسم چاند کا، یا نشہ ہے جام جوانی کا
عجب چہرہ ہے، جس کو حسن کی کرنوں نے گھیرا ہے
یہ جلوہ ہے کہ جادو، چاندنی ہے یا سویرا ہے

(تہمینہ جانا چاہتی ہے۔ رستم اسے روکتا ہے)

ٹھہرو ـــــــــ اندھیری رات میں حسن کا چراغ لے کر آنے والی حسینہ ٹھہرو ـــــ تم ـــــ تم ـــــ کون ہو؟ ـــــ

تہمینہ : اس سے زیادہ آپ کو جاننے کی ضرورت نہیں کہ میں سمنگان کی ایک شریف لڑکی ہوں۔

رستم : تمھارا نام؟

تہمینہ : تہمینہ۔

رستم : اور جس کی زندگی کے باغ میں یہ حسین پھول کھلا ہے۔ اس باغبان کا نام؟

تہمینہ : شاہ سمنگان۔ (رستم چونکتا ہے) دوست اور دشمن ہر ایک کی زبان اقرار کرتی ہے کہ آپ انسانوں میں عظیم ترین انسان اور دنیا کی پرسطوت ہستیوں میں عجیب و غریب ہستی ہیں۔ آپ کے حوصلے اور جرأت کے قصے سن سن کر میرے دل میں مدت سے خواہش تھی کہ دنیا کے سب سے زیادہ اقبال مند اور تلوار و طاقت کے تنہا مالک کی ایک بار زیارت کروں ـــــــ آج وہ تمنا کامیاب ہوئی۔ اجازت چاہتی ہوں۔

(دھیرے دھیرے دروازے کی طرف لوٹتی ہے)

رستم : جس کی زبان آج تک شکست کے لفظ سے آشنا نہیں ہوئی، کیا میں وہی رستم ہوں۔ اوہ ـــــ کتنا عجیب انقلاب!! دنیا کے فاتح کو آج ایک عورت کے حسن نے فتح کرلیا ہے۔ ؎

یہی ہے جس سے ہر شے ہے حسین و زرنگار اتنی
کہاں سے لائی دنیا، ورنہ حسن اتنا، بہار اتنی
سنو۔ ٹھہرو۔ چلیں منہ پھیر کر کیوں خستہ جانوں سے
سمنگاں کا یہی دستور ہے کیا میہمانوں سے

تہمینہ : سمنگان اچھی طرح اپنے مہمانوں کی عزت کرنا جانتا ہے۔ کیا یہ مہمانی آپ کے لیے زحمت و تکلیف کا باعث ہوئی۔

رستم : ؎

ہوگیا بے گانہ کیوں، آرام و ضبط و ہوش سے
پوچھیے یہ حال میری حیرت خاموش سے
جب سے میں جاگا ہوں، لب ہیں اور آہِ سرد ہے
جس جگہ پہلو میں دل تھا اب وہاں پر درد ہے

تہمینہ : مرض سے بے پروائی مرض کا علاج نہیں ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں شاہی حکیم کو طلب کروں۔

رستم : روح کی بیماری کا علاج پیغمبر کرتے ہیں۔ جسم کی بیماری کا علاج حکیم کرتے ہیں۔ اور دل کی بیماری کا علاج محبت کی نظر کرتی ہے۔ ؎

بس اب اس زندگی میں زندگی کا مدعا تم ہو
مرے غم کی شفا تم ہو، مرے دل کی دوا تم ہو

(تہمینہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

تہمینہ : (غصے سے جھٹکا دے کر) میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ تمھاری شرافت پر اعتماد کرنا میری غلطی تھی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ تمھارا ظاہر آفتاب کی طرح روشن اور

باطن رات کی طرح تاریک ہے۔ یاد رکھو عورت کا جسم کمزور ہے لیکن غیرت سے لبریز عورت کی روح کمزور نہیں ہے۔ اپنی عصمت و آبرو کی حفاظت کے وقت سمنگان کی ہر شریف لڑکی رستم سے زیادہ طاقت ور ہے۔

رستم : (حیرت سے) یہ کیا! ——— رائے قائم کرنے میں عورت کی عقل اتنی جلدباز ہوتی ہے! تعجب ہے کہ تم نے پاک محبت کے اظہار کو جرم کی نمائش اور سیہ کار دل کی آواز سمجھا۔ میں کمینہ نہیں۔ شریف ہوں۔ شریف اپنے ہی خون سے اپنے جسم کو رنگ دے گا لیکن ذلت کے دھبوں سے اپنے نام و عزت کو داغ دار نہ کرے گا۔

تہمینہ : معاف کرنا۔ میں یہ سمجھی.....

رستم : تم جو بھی سمجھیں۔ غلط سمجھیں۔ رواج، مذہب اور شادی کے مقدس قانون کے مطابق جو لڑکی میری قسمت میں برابر کی شریک ہو کر زندگی سے موت تک میرے رنج و راحت کی حصے دار ہوگی، اس کے سوا رستم ہر جوان لڑکی کو اپنی بہن اور ہر بوڑھی عورت کو اپنی ماں کے برابر قابلِ احترام سمجھتا ہے۔ ۔

کبھی ہوگا نہ داغ جرم سے چہرہ خجل میرا
نہ گندی ہے نظر میری، نہ ہے ناپاک دل میرا

تہمینہ : دنیا کی ہر دوشیزہ لڑکی، آپ جیسے شریف اور بہادر کی کنیز بننا اپنی خوش نصیبی سمجھے گی۔ لیکن اس بات کو فراموش نہ کیجیے کہ میں تورانی ہوں اور آپ ایرانی۔

رستم : تو کیا محبت کو ایران اور توران کے لفظوں میں قید سمجھتی ہو؟ محبت ملک و قوم کے خیالات کی پیروی، جماعت کی رائے کی پابندی، رواج کی غلامی، رسموں کی اطاعت نہیں کرتی۔ محبت کا کوئی مذہب، کوئی قانون، کوئی قوم، کوئی وطن نہیں ہے۔ محبت خدا کے رحم کی طرح ذات اور قوم کو نہیں، صرف دل کی خوبیوں کو پوچھتی ہے۔ محبت مذہبی تعصب، ملکی نفرت، قومی دشمنی، ذاتی غرور،

ہر تاریکی کو آفتاب کی روشنی بن کر دور کر دیتی ہے۔ محبت پورب اور پچھم کی طرف بہتے ہوئے دو دریاؤں کو ایک بنا کر، ایک ہی راستے پر چلنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ ۔

محبت کی نگاہوں میں اندھیرا بھی سویرا ہے
نہ تورانی، نہ ایرانی، نہ میرا ہے نہ تیرا ہے
نئی تحریر لکھیں آؤ! قسمت کے نوشتے میں
زباں سے ہاں کہو، بندھ جائیں دو دل ایک رشتے میں

تہمینہ : اس بات کا جواب دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ ایشیا کی لڑکی، شادی کے بعد شوہر کی اور شادی کے پیشتر والدین کے حکم کی اطاعت کرتی ہے۔

رستم : رستم اور تہمینہ کی شادی ممکن ہے کہ ایران کے بادشاہ کیکاؤس اور توران کے شاہ افراسیاب کی دیرینہ دشمنی کو پائدار محبت سے بدل کر ایران و توران کو ہمیشہ کے لیے گلے ملا دے۔ اس لیے مجھے کامل یقین ہے کہ تمھارے دور اندیش و صلح پسند والد اس رشتے کو جس سے دونوں ملک امن و محبت کی برکتوں سے فردوس ارضی بن جائیں گے، ضرور منظور کریں گے۔ یہ شادی جنگ کی دنیا میں دائمی صلح کا اعلان، خیالات کی تبدیلی کا نوروز، عداوت کے تاریک افق پر محبت کی صبح کا طلوع ہے۔ ۔

ناامیدوں کو نوید راحت و آرام دیں
ایک ہو کر آؤ دنیا کو نیا پیغام دیں

(تہمینہ شرما کر سر جھکا لیتی ہے۔ پیلسم اپنے رفیقوں کے ساتھ پوشیدہ مقام سے باہر نکلتا ہے)

پیلسم : غافل ہے۔ باندھ لو۔

(پیلسم کے ساتھی عقب سے رستم کو موٹی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں)

تہمینہ : تم کون؟

رستم : یہ کیا؟

پیلسم : غرور کا جواب۔ توران کی ذلت کا بدلہ۔ ۔

تری نخوت، تری تقدیر نے دھوکا دیا تجھ کو
سمنگاں کی زمیں پر لائی تھی تیری قضا تجھ کو
نہ کوئی دوست ہوگا اب نہ کوئی ہم وطن ہوگا
زمین تیرا جنازہ، آسماں تیرا کفن ہوگا

رستم : احسان فراموش، دغاباز، جس طرح کتے کے سامنے روٹی کا ٹکڑا پھینک دیتے ہیں اسی طرح میں نے دربار میں تیری چھینی ہوئی تلوار اور تیری حقیر زندگی رحم کر کے تجھے دے دی تھی۔ اگر تیری ماں کے دودھ میں غیرت کا ایک قطرہ بھی ہوتا، تو ذلت کو بے حیائی کی فتح سمجھ کر دوبارہ میرے روبرو آنے کی کبھی جرأت نہ کرتا۔ ۔

گیدڑ نے پھر سے روپ بھرا ہے ہے دلیر کا
چہرہ لگا کے آیا ہے گردن پہ شیر کا
آنکھیں ہیں لال، خوف سے، پر رنگ زرد ہے
بے شرم! تو شریف و جری ہے، نہ مرد ہے

پیلسم : اب یہ بکواس اس زنجیر کے لوہے میں نرمی اور اس دل میں تیرے لیے رحم نہیں پیدا کرسکتیں۔ ۔

مری شرافت پہ کرلے حملے، دہن میں جب تک ترے زباں ہے
یہ لن ترانی، یہ بد زبانی، بجھی ہوئی آگ کا دھواں ہے

رستم: شرافت؟ ان قدموں میں بیٹھ کر جن ہونٹوں سے اپنے بزدل اور ذلیل ہونے کا اقرار کر چکا ہے، ان ہونٹوں سے شرافت کے لفظ کو بے عزت مت کر۔ کمینے تو اس دنیا ہی میں پیدا نہیں ہوا جس میں شرافت اور شریف رہتے ہیں۔ ۔

بے غیرتی کی آگ سے دوزخ ہے دل کا گرم
بازو میں تیرے زور، نہ آنکھوں میں تیری شرم
اس کا بدن کثیف، ترا دل کثیف ہے
کتا گلی کا تجھ سے زیادہ شریف ہے

پیلسم : ہاتھی کو پکڑنے کے لیے جنگل میں گڑھا کھودنا، سامنے سے آتے ہوئے شیر پر دور سے تیر چلانا، بھیڑیے کے پنجے میں پنجہ ڈال کر لڑنے کے بدلے دس قدم پیچھے ہٹ کر اسے برچھا مارنا، اگر یہ نامردی اور کمینہ پن نہیں ہے تو دشمن کو شمشیر کے بدلے، تدبیر سے شکست دینا بھی شرافت کے خلاف نہیں ہے۔ ؂

فتح پانے کے لیے یہ آخری اوزار ہے
گرز و خنجر کی طرح دھوکا بھی اک ہتھیار ہے

رستم : دھوکا شیر دل شریفوں کا نہیں، لومڑی کا دل اور بچھو کی روح رکھنے والے کمینوں کا حربہ ہے۔ ایک شریف دغا اور فریب سے دشمن پر فتح حاصل کرنے کو فتح نہیں، اپنی شرافت کی شکست اور اپنی تلوار کی بے عزتی سمجھتا ہے۔ ؂

جری کو آبرو اور جان پیاری ہے کمینے کو
بہادر جانتا ہے موت بے شرمی کے جینے کو

پیلسم : اب تیرا جینا اور مرنا دونوں ہمارے قبضے میں ہے۔ اپنی روح سے کہہ کہ جسم سے نکل کر موت کی پیشوائی کرے۔

(رستم کے سینے میں تلوار بھونکنے کے لیے بڑھتا ہے)

تہمینہ : خبردار ـــــ (پیلسم کی کلائی میں زور سے گھونسہ مارتی ہے۔ اُس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گرتی ہے اور تہمینہ تلوار پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہوجاتی ہے) انسانیت کی پیشانی پر شرم کے دھبے! تو شیر کو دھوکے سے زنجیر میں جکڑ کر

اس کے خون سے اپنی ذلیل تلوار کے منھ پر بہادری کا غازہ ملنا چاہتا ہے۔ زوف ہے تجھ پر ـــــ مجھے آج معلوم ہوا کہ سمنگان کی مائیں تیرے جیسے کمینے لڑکے بھی پیدا کرتی ہیں۔ ـ

چاہتا ہے تو کہ سر جھک جائے سارے ملک کا
نام رسوا کر رہا ہے تو ہمارے ملک کا
یہ فریب، اتنا حسد، انسان کو انسان سے
یوں دغا کرتے نہیں حیوان بھی مہمان سے

پیلسم : بدکار! بدچلن!! ملک کے دشمن کو اپنی عزت نذر کر دینے کے بعد ہمیں ملک کی عزت کرنا سکھا رہی ہے۔

تہمینہ : بدکار۔ بدچلن؟ کیا کہا؟ موذی، نمک حرام۔

(غصے میں دوڑ کر پیلسم کا گلا پکڑ لیتی ہے)

پیلسم : (گلا چھڑا کر) باندھ لو۔

(پیلسم کے دو ساتھی دو طرف سے تہمینہ کی کلائیاں پکڑ لیتے ہیں)

تہمینہ : (ہاتھ پکڑنے والوں سے) چھوڑ دو۔ کمینو مجھے چھوڑ دو۔ اس پاجی کو اپنے گندے منھ کے ہر لفظ کا ثبوت دینا ہوگا۔ میں اس سے اپنی عزت کا جواب مانگتی ہوں۔

رستم : بدبخت و بیوقوف رحم و درگذر کو بھی مجبوری سمجھتے ہیں ـــــ ادھر دیکھ ـــــ پیلسم! میری برداشت پر غلط بھروسا نہ کر۔ میں اور سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن بچے کی تکلیف، بوڑھے پر ظلم اور عورت کی بے عزتی کبھی نہیں دیکھ سکتا۔

پیلسم : ـ

دیکھنا ہی ہوگا، جو کچھ ہے تری تقدیر میں
دیکھنے ہی کے لیے باندھا ہے اس زنجیر میں

رستم: ـــ

باندھ رکھنے کے لے کافی یہ تدبیریں نہیں
گھاس کے تنکے ہیں یہ لوہے کی زنجیریں نہیں

(زنجیر توڑ کر گرز اٹھانے کے لیے دوڑتا ہے)

گرز و ترکش کیا ہوے؟ اچھا میری ہمت تو ہے
ہاتھ میں حربہ نہیں، پر ہاتھ میں طاقت تو ہے

(گرز نہ پا کر چھت کا ستون کھینچ لیتا ہے اور اسی سے پیلسم اور اُس کے ساتھیوں پر حملہ کرتا ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ - پہلا سین

توران کا شاہی محل

(ہومان، بارمان اور تورانی فوج کے سردار بادشاہ کا انتظار کر رہے ہیں)

ہومان : انسان کے خون اور سروں کی بارش کے بعد جنگ کا آسمان صاف ہوگیا تھا۔ موت تھک کر سو گئی تھی۔ زندگی سلامتی کے سائے میں اطمینان کی سانس لے رہی تھی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ صلح کے خاموش سمندر میں پھر طوفان آیا چاہتا ہے۔

بارمان : شاہی فرمان کے بموجب تورانی فوج کے بارہ ہزار منچلے سپاہی زرہ بکتر پہنے، لگامیں ہاتھوں میں لیے، گھوڑوں کی پیٹھ پر دوسرے حکم کا انتظار کر رہے ہیں ـــــ معلوم نہیں کہ یہ تباہی اور بربادی پھیلانے والی انسانی آندھی کس طرف بھیجی جائے گی۔

ہومان : مودب۔ جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں۔

بارمان : چہرے سے ناراضگی اور غصہ ظاہر ہو رہا ہے۔ دیکھیں کیا حکم ہوتا ہے؟ ہونٹوں سے مہربانی برستی ہے یا بجلی؟

(وزیر سلطنت کے ساتھ جوش اور غصے کے عالم میں افراسیاب کا داخلہ)

افراسیاب :توران کے دیرینہ دشمن رستم کو اپنا مہمان بنا کر زبانِ عمل سے تورانیوں کی

بےحمیتی کا دنیا میں اعلان کرنا، بے عزتی کو انتہائی درجے تک پہنچانے کے لیے اس کی غیر آسودہ خواہش نفسانی کو اپنی بیٹی تہمینہ کا حسن و شباب نذر دینا، اس ذلت بخش شادی کے شرمناک نتیجے سہراب کی پیدائش کا حال پندرہ برس تک اپنے آقا و شہنشاہ سے پوشیدہ رکھنا، کیا یہ مجرمانہ جسارت نہیں ہے؟ کیا یہ تورانیوں کے احساس خودداری کی صریح توہین اور شہنشاہ توران سے علانیہ بغاوت نہیں ہے؟ سمنگان کے شاہی محل میں رہنے والے کتے، عاقبت بینی تیری سفارش کر رہی ہے۔ اس لیے میری رگ رگ میں گرجتا ہوا غصے کا طوفان، ایران کی تباہی تک خاموشی اختیار کرے گا ـــــ اس کے بعد تیرے لیے نہ معافی ہے، نہ زندگی ـــــ ہومان! ـــــ بارمان!!

بارمان : (دست بستہ) ولی نعمت۔

افراسیاب : میرا حکم تھا کہ تورانی لشکر کے بارہ ہزار جنگ آزما، سامان حرب کے ساتھ سفر کے لیے پا بہ رکاب رہیں۔ ـــــ کیا مابدولت کے حکم ثانی کے لیے وہ مستعد اور گوش برآواز ہیں؟

ہومان۔ بارمان : (ہاتھ جوڑ کر) خداوند۔

افراسیاب : سمنگان کے بادشاہ کا نواسہ سہراب، جس کی تلوار کی جھنکار فتح و اقبال کو اپنا غلام بنانے کی دھمکی دے رہی ہے۔ کیکاؤس کے پُرنخوت سر کو شاہی تاج سے محروم کرنے کے لیے ایران کی زمین کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے روندنا چاہتا ہے۔ میرا خط اور تحفہ لے کر تم آج ہی بارہ ہزار تورانی نبرد آزماؤں کے ساتھ اس کے امداد و حوصلہ افزائی کے لیے سمنگان روانہ ہو جاؤ ـــــ نوخیز سہراب کا سینہ نئی امیدوں اور بلند ترین ارادوں سے معمور ہو رہا ہے۔ اس کی امیدوں کو اپنی جرأت افزا باتوں سے زندہ و مشتعل رکھنا۔ یہی تمھاری سفارت کا فرض خصوصی ہے۔ اس سے کہنا کہ تم اپنے شیر گیر ہاتھوں سے ایران کی مغرور چھاتی پر توران کی عزت کا جھنڈا گاڑنے جا رہے ہو۔ اس لیے توران کا شہنشاہ افراسیاب تمھاری کامیابی کے لیے دعا کرتا اور حصول فتح سے قبل ہی تمھیں ایران کے فتح کی مبارک باد دیتا ہے۔

ہومان : جہاں پناہ نے جو حکم دیا ہے، ہم دونوں غلام اس کے ایک ایک حرف کی تعمیل کریں گے۔

افراسیاب :سنو۔ قدردانی یا ہمدردی کے جذبے نے مجھے سہراب کی مدد پر آمادہ نہیں کیا۔ سانپ کا بچہ بھی سانپ ہی ہوتا اور بڑا اور توانا ہوکر سانپ ہی کی طرح ڈستا ہے۔ رستم کے خون و طاقت کا وارث سہراب زندہ رہا تو ایک دن وہ بھی توران کے عظمت و اقبال کے لیے سیلاب ادبار اور توران کے تاجدار کے لیے دوسرا رستم ثابت ہوگا۔ توران کے روشن مستقبل کی طرف مجھے ایک غیر محسوس تاریک سایہ بڑھتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ضرورت ہے کہ پہلے جوان بیٹے کے ہاتھ سے بوڑھے باپ کو قتل کرا دوں۔ اس کے بعد دعوت میں بلاکر، زہر یا خنجر سے سہراب نما خطرے کا بھی خاتمہ کر دوں۔ اس لیے کوشش کرنا کہ جب تک میدان کارزار کی فضا قسمت کے آخری فیصلے کی گونج سے کانپ نہ اٹھے، باپ بیٹے ایک دوسرے کو شناخت نہ کرسکیں۔ پہلے رستم، پھر سہراب۔ دونوں کی موت ہی میں توران کی زندگی ہے۔ سمجھ گئے؟ جاؤ۔ دیوان خانے میں انتظار کرو۔ میں بہت جلد تحفے کی کشتیاں اور اپنا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں ـــــــ سب کچھ فراموش ہوجائے، لیکن دو باتیں حافظے سے گم نہ ہوں ـــــ میرا حکم ـــــ اور اپنا فرض۔

ہومان۔ بارمان : شاہی اقبال کی فتح۔

(دونوں سر جھکا کر جاتے ہیں)

افراسیاب :رستم اور سہراب کی جنگ اس حیرت زار دنیا کا ایک عجیب واقعہ ہوگا ـــــــ شباب باختہ و فرسودہ طاقت باپ۔ نوجوان، شجاعت پروردہ بیٹے کا کبھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ رستم گرمی کے موسم کا سوکھا ہوا دریا ہے او سہراب دونوں کناروں سے چھلکتی ہوئی برسات کی ندی ہے۔ اُس کی جوانی کی شام ہو چکی اور اِس کی جوانی کی صبح ہو رہی ہے۔ اُس کی طاقت کا آفتاب چہرے کی شکنوں اور جھریوں کی لہروں میں ڈوب رہا ہے، اور اِس کی طاقت کا

آفتاب شباب کے افق رنگیں پر طلوع ہو رہا ہے۔ (وزیر سے) سنتے ہو۔ میرا حکم ہے کہ آج سے ہر وقت گھوڑوں کی پیٹھ پر زین اور تورانی سرفروشوں کے جسم پر زرہ بکتر اور ہتھیار سجے رہیں۔ رستم کی موت کی نوید ملتے ہی میں بجلی کی طرح ایران کے سر پر ٹوٹ کر اس کے ماضی کی شوکت، حال کے غرور، مستقبل کی تمناؤں کو ریزہ ریزہ کر دوں گا ـــــ اور وہی دن میری زندگی کا بہترین دن ہوگا۔

وزیر : اعلیٰ حضرت۔ یہ سلطنت کا قدیم نمک خوار حضور کی خیر سگالی اور ملک کی بہبودی کے لیے کچھ عرض.....

افراسیاب : خاموش۔ تو ہمیشہ عرض اور گزارش کی آڑ میں مابدولت کے جوش کو سرد کرنے کے لیے ناخوش گوار نصیحتوں سے لبریز وعظ شروع کر دیتا ہے ـــــــ بول۔ عرض کر۔ لیکن یہ خیال رکھ کہ "ایران پر حملہ کرو۔" اور "کیکاؤس کو تباہ کر دو۔" ان دو کیف پرور اور حوصلہ انگیز جملوں کے سوا اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔

وزیر : غلام کی یہ التجا ہے کہ بندگان عالی اپنے ملک و رعیت کے مالک ہیں، لیکن آسمان کی گردش، انقلاباتِ عالم کی رو اور خالقِ کائنات کی رائے اور مصلحت کے مالک نہیں ہیں۔ یہی باعث ہے کہ اپنی مجموعی عسکری قوت، اپنے خزانے کا گراں بہا اندوختہ، اپنے رعیت کے لاکھوں نوجوان کی شباب نارسیدہ زندگیاں برباد کرکے بھی، آپ آج تک ایران کے نوشتۂ تقدیر کا ایک حرف بھی تبدیل نہ کرسکے۔ جب خدا کی مرضی آپ کی خواہش سے متفق نہیں ہے، تو ایران پر حملہ کرنا، خدا کی مرضی سے جنگ کرنا ہے۔

افراسیاب : میں سہراب کو اپنے غضب کا حربہ بنا کر ایران سے اپنی پچھلی شکستوں کا بدلہ ضرور لوں گا۔ میرا دماغ گذشتہ ذلتوں کی یاد سے دوزخ بنا ہوا ہے۔ میرا دل اندوہ ناکامی کی ضربوں سے مجروح ہو رہا ہے۔ میری روح انتقام کی پیاس سے تڑپ رہی ہے۔ میں اس جلن کے لیے ٹھنڈک، اس زخم کے لیے مرہم، اس تشنگی کے لیے تسکین چاہتا ہوں۔

وزیر : خادم التجائے معافی کے ساتھ دوبارہ اسی خیال کا اعادہ کرنا چاہتا ہے کہ

جلالت مآب کے ارادے کی آفرینش ناممکنات کی دنیا میں ہوئی ہے۔

افراسیاب :(برافروختہ ہو کر) یعنی؟

وزیر : دنیا کی تمام نعمتوں اور برکتوں کی تخلیق کسی ایک انسان کے لیے نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے جو کچھ ہے اس کی حفاظت کیجیے۔ اور جو نہیں ہے اور نہیں مل سکتا، اسے جبراً حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیجیے، یہی سلطنت کے لیے پیغام بہبودی اور ملک کی زخمی سماعت کے لیے نغمۂ امن ہے۔

افراسیاب :میں خدا کی مرضی کو مجبور کروں گا کہ ایران کی قسمت کی تحریر افراسیاب کے قلم سے دوبارہ لکھی جائے۔ افراسیاب کی غلامی، یہی ایران کی آخری قسمت ہے۔

وزیر : عالم پناہ ــــ بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے۔ کتنی بدنصیب ہے وہ رعایا جس کا شفیق باپ اولاد کے خون پسینے کی کمائی کا روپیہ اولاد کی فوز و فلاح میں خرچ کرنے کے بدلے قہر و غضب کی نمائش، سامانِ ہلاکت کی آرائش اور وبائے جنگ کی افزائش میں ضائع کر رہا ہے ــــــ میں دو زانو ہو کر اور رحم و انصاف کا واسطہ دے کر عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ اس مسلسل جنگ کے ہولناک تماشے کو جو ہمیشہ ناکامی و پشیمانی کے امید سوز نظارے پر ختم ہوتا ہے، آئندہ کے لیے بند کر کے تباہ حال رعایا کو شکر گزار کیجیے ــــ رعیت کا دل جیتنا شاہانہ فتوحات میں سب سے بڑی فتح ہے۔

افراسیاب :تیری پچھلی وفاداریوں اور خدمتوں کا خیال کر کے، تیری بے مغز گفتگو میں اب تک از راہِ رحم سنتا رہا ــــ بکنا بند کر ــــ کیا تو میرے رحم کو غضب سے بدلنا چاہتا ہے؟

وزیر : خداوندِ نعمت۔ حصول خطاب و ترقی درجات کے لیے حق گوئی کا فریب دے کر اپنے آقا کے غلط ارادوں، غلط امیدوں کی، غلط راستے کی طرف رہنمائی کرنا اور اس کے حوصلوں کی خوشامد کی زبان سے شہ دے کر یقینی تباہی سے ٹکرا دینا خدمت نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی لالچوں کو ٹھکرا کر، صداقت کا آئینہ بن کے، اس کی بشریت کی کمزوریوں کو اُس کے سامنے ظاہر کر دینا، یہی حقیقی جاں نثاری اور سچی آقا پرستی ہے۔ میں جاں نثار ہوں، خوشامدی نہیں

ہوں۔

افراسیاب: معلوم ہوا۔ ضرور تو رشوت لے کر کیکاؤس سے مل گیا ہے۔ لے جاؤ۔ اس دوست کے لباس میں چھپے ہوئے دشمن کو۔ قتل کر دو۔ یہ زندہ رہا تو اپنی نامردانہ باتوں سے تمام توران کو بزدل بنا دے گا۔

(افراسیاب غصے میں چلا جاتا ہے)

وزیر: رعایا کی خواہشات کو پاگل کا خواب۔ زمین کو اپنے غلاموں کی بستی۔ اپنی رائے کو دنیا کا ناقابل تنسیخ قانون۔ وقت کے چکر کو اپنے اشارے کا محکوم سمجھنے والے، برخود غلط حکمرانوں سے تمام زندگی کی خیر خواہی اور بے داغ وفاداری کا آخر میں یہی انعام ملتا ہے ــــــ جلاوطنی، قید، قتل۔ یہی بہترین خدمات کے بہترین صلے ہیں۔ یہ پیکر ظلم، یہ مجسمۂ غرور، یہ خودداری و غلط کاری کے بولتے ہوئے پتلے، حق گوئی، کو دنیا کا سب سے بڑا جرم سمجھتے ہیں ــــــ یہ چوری، ڈاکہ، دھوکا، قتل بغاوت، ہر گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن، سچائی، کا جرم کبھی معاف نہیں کرتے۔ (سپاہی سے) چلو۔ سچ بولنے کی سزا دینے کے لیے مجھے موت کی عدالت کی طرف لے چلو۔

ریت کی دیوار پر بنیاد ہے ہر بات کی
بادشاہوں کی عنایت دھوپ ہے برسات کی

(سپاہیوں کے حصار میں وزیر کا جانا)

دوسرا ایکٹ - دوسرا سین

سمنگان کا شاہی محل

(شاہِ سمنگان، تہمینہ کنیزیں اور افراسیاب کے سفیر ہومان اور بارمان موجود ہیں)

شاہِ سمنگان : بادلوں کی کمان سے نکل کر زمین کی طرف آتا ہوا بجلی کا تیر اور سہراب کے ارادے میں پیدا شدہ طوفان کا بہاؤ ہماری منتوں سے اپنا رُخ اور راستہ نہیں بدل سکتا۔ اس کے حوصلے آندھی کی طرح پُر شور، اس کی آرزوئے جنگ، شکار پر جست کرتے ہوئے شیر کی مانند یقین فتح کے نشے سے مخمور اور اس کا جوش، خشک جنگل میں لگی ہوئی آگ کی طرح رو بہ ترقی ہے۔ وہ ابھی سے محسوس کر رہا ہے کہ اقبال اس کی پیشانی کو، فتح اُس کی تلوار کے قبضے کو، ایران کے قلعوں کی کنجیاں اس کی انگلیوں کو، تاج کیانی کے جواہر اس کے قدموں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ اس کے گرز کی ضرب سے ایرانیوں کی روحیں اور اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک سے کیکاؤس کے محل کی دیواریں کانپ رہی ہیں ـــــ اس لیے بیٹی اپنی ممتا کو اس کی سرکش مرضی کے ساتھ صلح کرنے کے لیے مجبور کرو۔ کیوں کہ وہ اس سفر کو خیر مقدم کے نعروں کی طرف سے پیغام دعوت اور اپنے بیداری کے خواب کی امید افروز تعبیر سمجھ رہا ہے۔

تہمینہ : اولاد کی محبت، ماں کی روح کا تبسم ہے۔ آج یہ تبسم فریاد بن کر آنسوؤں کی زبان سے سہراب کی ضد کی منتیں کر رہا ہے۔ لیکن اس کی ضد کسی منت، کسی

دلیل، کسی التجا سے رحم پر مائل نہیں ہوتی۔ ابا جان۔ اس کے ارادے کو مادرانہ اطاعت سے بغاوت پر آمادہ دیکھ کر میری زبان نے مجبوری سے ایران جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن مامتا کی آگ سے جلتا ہوا دل ابھی تک اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ہومان : محترم بانو۔ توران کے شہنشاہ افراسیاب نے اپنی شفقت و نوازش کے ثبوت میں محبت کے تحفوں اور شاہی گرامی نامے کے ساتھ، تورانی فوج کے جو بارہ ہزار منتخب و جنگ آزمودہ بہادر بھیجے ہیں۔ ان میں کا ہر جری بارہ ہزار دلیروں کی طاقت و تجربہ کا مالک ہے۔ ان بارہ ہزار تورانی شیروں کے ساتھ آپ کا نامور فرزند جس زمین پر قدم رکھے گا، اُس زمین کے آستانِ عظمت پر آسمان بھی سجدۂ نیاز ادا کرنے کے لیے مجبور ہوجائے گا۔

بارما : ؎

سر جھکا دے گا زمانہ جُبّہ سائی کے لیے
آئے گی خود فتح بڑھ کر پیشوائی کے لیے
غم نہ کیجیے آپ اس کے نیک و بد کے واسطے
قسمت و اقبال حاضر ہیں مدد کے واسطے

(جوش کے عالم میں سہراب کا داخلہ)

سہراب : رستم کا فرزند۔ اپنے بازو اور تلوار کے سوا کسی سے مدد کا طلب گار نہیں ہے (ہومان اور بارمان سے) میں نے صرف ناشکر گزاری و غرور کے الزام سے بچنے کے لیے تاجدار توران کی فوجی امداد قبول کر لی ہے۔ لیکن بہادر آئینہ کی طرح صاف گو ہوتا ہے۔ اس لیے میری صاف بیانی سے رنجیدہ نہ ہونا۔ میں نے اس اعانت کی پذیرائی کرکے اپنے عزم و شجاعت کی سخت دل شکنی کی ہے۔ سہراب تورانی لشکر کے اعتماد پر نہیں، اپنی جرأت و طاقت کے بھروسے پر ایران کی نخوت کو للکارنے جا رہا ہے۔ خدا میرا محافظ، ہمت میری سپر، تلوار میری رہنما، میدان جنگ میرا راستہ، یقینِ کامیابی میرا توشہ، حوصلے

میرے رفیقِ سفر اور کیکاؤس کا تخت میرے سفر کی آخری منزل ہے۔ اس سفر کے آغاز کا نام ہے استقلال اور اس سفر کے خاتمے کا نام ہے فتح۔

ہومان : ہمیں کامل یقین ہے کہ آپ اپنے زور بازو سے دنیا کی تاریخ میں شاندار اضافہ کریں گے۔

سہراب : ماں۔ جس رستم کی آفرینش پر آسمان زمین کو مبارک باد دیتا ہے، جس رستم کا نام سن کر شجاعت غرور کے نشے میں جھوم اٹھتی ہے، جس رستم کے نام پر طاقت فخر اور تلوار ناز کرتی ہے۔ اس رستم، اس شریف ترین انسان، اس فاتح اعظم کا فرزند ہونا میرے لیے موجب ندامت نہیں، باعث افتخار تھا۔ پھر معاف کرنا، نسائیت کی کمزوری، شباب کے گناہ، زندگی کے شرمناک جرم کی طرح میری حقیقت کو پردے میں رکھنے کی کیا وجہ تھی؟ ۔

دل میں رکھا راز، دنیا کو خبر ہونے نہ دی
شام گمنامی کی تم نے، کیوں سحر ہونے نہ دی

تہمینہ : اس سوال کا جواب ماں سے نہیں، ماں کی ماتا سے پوچھ۔ اگر ایک غریب چوری ہو جانے کے خوف سے اپنی زندگی کی پونجی دنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھتا ہے، تو یہ غلطی یا جرم نہیں، مجبوری ہے۔ یہ اندیشہ میری روح میں پیوست تھا کہ تیری پیدائش کا راز ظاہر ہو جانے سے تیرا باپ تجھے میری گود سے اپنے بازوؤں میں کھینچ کر میری دولتِ تسکین و متاعِ حیات مجھ سے چھین لے گا۔ اور مجھ بدنصیب کی آنکھیں شوہر کے چہرے کی طرح بیٹے کی صورت دیکھنے کے لیے بھی بے رحم قسمت کے سامنے ہمیشہ فریاد کرتی رہیں گی۔

سہراب : ماں، رستم جیسا باپ۔ اور سہراب جیسا بیٹا۔ ان دو آفتاب و ماہتاب کی موجودگی میں دنیا کو حقیر ستاروں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خدا اور مخلوق کے سامنے کیکاؤس کو تخت سے اتار کر اپنے عالی مرتبہ باپ کو ایران کا بادشاہ اور تمھیں ایران کی شہنشاہ بیگم بنانے کا عہد کر چکا ہوں۔ اس عہد کو پورا کرنے

کے لیے اب تم سے آخری مرتبہ اجازت مانگنے آیا ہوں ـــــ یہ کیا ماں! روتی ہو؟ رو نہیں۔ مائیں لائق کے لیے نہیں، نالائق اولاد کے لیے روتی ہیں۔ تمھارا بیٹا عزت کی دنیا فتح کرنے جا رہا ہے۔ اس لیے یہ رونے کا نہیں، خوش ہونے کا وقت ہے۔ ہنستے ہوئے ہونٹوں سے اجازت دے کر مجھے میدان جنگ کی طرف رخصت کرو۔ سمنگان کے قلعے کے دروازے پر فوج اور ایران کی زمین پر شہرت تمھارے سہراب کا انتظار کر رہی ہے۔

تہمینہ : سہراب۔ مجھے خوف ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد اپنے باپ کی طرح کہیں تو بھی غریب تہمینہ کو فراموش نہ کر دے۔ کیونکہ ایران کی زمین جادو کی زمین ہے۔ اس طلسم خاموشی میں پہنچتے ہی انسان سحرزدہ ہو کر اپنے پیاروں کی یاد کو محبت کے ہاتھ کی بدخط طفلانہ تحریر سمجھ کر حافظے سے مٹا دیتا ہے۔

سہراب : ماں، ماں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم میرے جسم و جان کا شیرازہ، میری نجات کا وسیلہ، میری زندگی کی برکت ہو۔ میری ہستی تمھاری ہستی کا عکس اور میری روح تمھاری روح کا سایہ ہے۔

تہمینہ : (یکایک رستم کی یاد سے بے قرار ہوکر) طلوع مسرت و بازگشت ماضی کی امید و اشتیاق میں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی زندگی کے سولہ برس گذر گئے۔ لیکن میری شب انتظار کی صبح نہ ہوئی ـــــ یا خدا عورت کا دل اتنا کمزور و مجبور محبت۔ اور مرد کا دل اتنا بے رحم و وفا ناآشنا ہوتا ہے!! آہ۔ عورت محبت کا نشہ پی کر تمام عمر ہوش میں نہیں آتی۔ اور مرد..... پیالہ ہونٹوں سے جدا ہوتے ہی اس شراب کی لذت و سرور کو فراموش کر دیتا ہے۔

سہراب : ماں۔ تم بے آواز لفظوں میں اپنے دل سے کیا مشورہ کر رہی ہو؟

تہمینہ : (ٹھنڈی سانس لے کر) خدا کی مرضی پوری ہو (مہرہ نکال کر) یہ تیرے باپ کی دی ہوئی نشانی ہے۔ اس نے سمنگان سے رخصت ہوتے وقت تاکید کی تھی کہ اگر تمھاری گود کی زینت لڑکی ہو تو یہ مہرہ اس کے سر کے بالوں میں ـــــ اور لڑکا ہو تو اُس کے بازو پر باندھ دینا ـــــ ہاتھ بڑھا ـــــ

سولہ برس سے آج ہی کے دن کے لیے اس محبت کی یادگار کی حفاظت کر رہی تھی ـــــ اس مہرے اور نظر میں شناسائی ہوتے ہی، باپ بیٹے کو، خون خون کو شناخت کرے گا۔ (سہراب کے بازو پر مہرہ باندھ دیتی ہے) سہراب۔ ہر بچہ ملک و ملت کی امانت ہوتا ہے۔ اس لیے جسمانی پرورش کے ساتھ بچے کی روحانی تربیت اور دماغی و اخلاقی نشو و نما کی بھی ماں ذمہ دار ہے۔ میں نے تیرے جسم کی حوصلہ زا اور قوت آفریں ورزشوں سے، دماغ کی ضیائے علم سے، دل کی شریف ترین جذبات سے اور روح کی خصائلِ انسانیت سے تعمیر کی ہے۔ خدا کی سپاس گزار ہوں کہ میری سولہ برس کی محنت برباد نہیں ہوئی۔ آج میں سعید، فیاض، دلیر، بلند فطرت نوجوان کی شکل میں اپنی شانزدہ سالہ تمناؤں اور مادرانہ دعاؤں کو دیکھ رہی ہوں ـــــ بیٹا۔ مجھے تیرے دل کی رفعت اور خیالات و احساسات کی عظمت مآبی پر اعتماد ہے۔ اس لیے تجھے حقیقی فاتح اور سچے سپاہی کا فرض سکھانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن صرف اس خیال سے کہ زندگی کی غفلت آور مصروفیتوں میں میری آواز تیرے دل کی خوبیوں کو بیدار کرتی رہے، رخصت کرنے سے پیشتر تجھے نصیحت کرتی ہوں کہ خدا کی بخشی ہوئی طاقت کو اعتدال، رحم اور انصاف کے ساتھ استعمال کرنا۔ تلوار کو بے کسوں اور کمزوروں کا محافظ و پشت پناہ سمجھنا۔ اور ظلم خواہ کتنی ہی حلیم اور کیسی ہی شریفانہ صورت میں سامنے آئے ہمیشہ اُسے ذلیل جاننا۔

دیکھنا خنجر و طاقت پہ نہ الزام آئے
لب پہ شاباش ہو، سہراب کا جب نام آئے

سہراب : پیاری ماں۔ میں لوہے کے ہتھیاروں سے سج کر میدان جنگ کی طرف ناموری کی تلاش میں جا رہا ہوں ـــــ یہ آہنی حربے دشمن کی ہمتوں کو، جسموں کو، فوجوں کو، قلعوں کو فتح کرسکتے ہیں۔ لیکن عزت اور شہرت پر فتح پانے کے لیے مجھے ایک اور حربے کی ضرورت ہے۔

تہمینہ : میرے بچے۔ وہ کون سا حربہ؟

سہراب : (تہمینہ کے قدموں میں بیٹھ کر) ماں کی دعا۔

تہمینہ : (سہراب کے سر پر ہاتھ رکھ کر) ۔

دعا دیتی ہوں تجھ کو وقت خادم، بخت یاور ہو
زمانہ پاؤں کے نیچے، خدا کا ہاتھ سر پر ہو

دوسرا ایکٹ - تیسرا سین[1]

ایرانی سرحد پر قلعہ سفید

(رات کا وقت۔ قلعے میں جلسہ مشاورت۔ تورانی لشکر کے روز افزوں فاتحانہ اقدام اور اپنی پیہم ہزیمت یابیوں سے خاطر شکستہ ہوکر ایرانی اکابرِ حکومت و عمایدینِ فوج مسئلۂ صلح پر مصروف بحث ہیں)

بہرام : سہراب۔ زوال کا نقیب، تخریب کا علم بردار، فنا کا پیامی، موت کی سانس کا شعلہ ہے۔ ہمارا قلعہ سفید ویرانہ عبرت، ہمارے نگارستانِ عیش مقتلِ آرزو، ہمارے محلات و باغات گھوڑوں کے طویلے بن جائیں۔ ہماری مالی آسودگی، معاشرتی شیرازہ، ملکی نظام، قومی وقار، جنگی ذخیرے، سر برآوردہ افراد اور بہترین سپاہیوں کی قیمتی زندگیاں برباد ہوں ـــــ ان یقینی الم ناک نتائج کے سوا اس لشکر کشی و صف آرائی کا اور کوئی حاصل نہیں ہے۔ سہراب کی تلوار کی جھنکار کو ہمیں اپنی شومیٔ قسمت کی طرف سے اعلان جنگ تصور کرنا چاہیے۔

گستہم : لیکن ہم نتیجے کے ظہور سے اول ہی کیوں یقین کرلیں کہ تقدیر ہمارے خلاف اس جنگ کا فیصلہ کر چکی ہے۔ جب تک ہمارے پاس قلعہ سفید کی بلند و مستحکم دیواریں ہیں، حوصلوں میں توانائی ہے، آزادی کی محبت ہے۔ سرفروشی کا جذبہ ہے، جوشِ فدائیت کی فراوانی ہے۔ اس وقت تک ایک کم عمر

[1] ''عشق و فرض'' کے نام سے کھیلا گیا ڈراما یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ (مرتبین)

نوخیز قوت کے سامنے تلواریں پھینک کر ایران و توران کی نظر میں اپنے دعویٰ شجاعت کو ذلیل نہ کرنا چاہیے۔

سردار ۱: بے شک۔ حوصلوں کی پستی ذلت کی طرف مرد کا پہلا قدم ہے۔ مجھے ابھی تک ارادوں کی پسپائی کا کوئی معقول سبب نظر نہیں آتا۔ دنیا امید کی جلوہ گاہ ہے، مایوسی کا ظلمت کدہ نہیں ہے۔ احساس کا نام زندگی اور جوش عمل کا نام کامیابی ہے۔

سردار ۲: آپ کی رائے مرض کی صحیح تشخیص ہے۔ دشمن کے حملے کا خوف، حملے سے زیادہ ہیبت ناک ہوتا ہے۔ یہ صرف ہمارا واہمہ ہے جو ہمارے سامنے شکست یافتہ مستقبل کی اشک بار تصویر پیش کر رہا ہے۔

بہرام: امید آپ کی توقعات کو فریب دے رہی ہے ـــــ ہوا میں گرہ دینے کی ناکام و بے نتیجہ کوشش نہ کیجیے۔ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کرنا، یہ آپ کی پہلی غلطی اور سہراب کو طفل شیر خوار یا معمولی نبرد آزما سمجھنا، یہ دوسری غلطی ہے۔ میں ملک کی بہبودی کے لیے بہترین مشورہ دے کر اپنی ذمہ داری اور قومی فرض سے سبک دوش ہوچکا۔ ہر شخص اپنی رائے کا مالک ہے۔ لیکن خاموش ہونے سے پیشتر ایک بار پھر متنبہ کرتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے لیے امن و آشتی کا دروازہ بند کر رہے ہیں۔ وقت کی آنکھیں بدل چکی ہیں۔ سہراب کے قوائے حربی اور فتوحات جلیلہ کو ہیچ سمجھ کر اس سے برسرِ جنگ ہونا، جنگ نہیں، خودکشی ہے۔

گستہم: (حاضرین سے) مجھے اپنی رائے کے درست و بے خطا ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ قیاس کی پیشین گوئی صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی ـــــ سنیے جلسہ مشورت کے سامنے میں نے اپنا ذاتی خیال پیش کر دیا۔ اب آپ لوگ متفق ہوکر خود فیصلہ کر لیں کہ پیش نظر مشکلات میں کیا کرنا چاہیے۔ جنگ یا صلح؟

سردار ۳: جب لشکر بے حوصلہ، اسباب مدافعت کمزور، حالات ناموافق، تدبیر خلاف، اُمید فتح موہوم اور قوی بازو دشمن کے حملے کامیاب ہیں ـــــ تو ایسے برگشتہ وقت میں ضرورت صلح کا احساس نہ کرنا، اپنی آرائش حیات اور ذرائع نجات

سے دست بردار ہونا ہے ـــــ میری رائے صلح کے حق میں ہے۔

سردار ۲: سہراب کا حملہ ایک اتفاقی آندھی ہے، جو تھوڑی دیر مطمئن فضا میں اضطراب پیدا کرکے اپنی طاقت کی نمائش کے لیے دوسری طرف روانہ ہوجائے گی۔ اس لیے ابلہانہ جوش سے مشتعل ہو کر ہنگامی آفت کو دائمی مصیبت نہ بنانا چاہیے۔ ورنہ زندگی کی غلطیوں میں یہ سب سے زیادہ ہولناک غلطی ہوگی۔

گستہم: (بہرام سے) جب کثرت رائے جنگ کی مخالف ہے، تو آپ ہماری جانب سے صلح کے قاصد بن کر جائیے۔ سہراب سے کہیے کہ دوستی کی نسیم بہار سے دشمنی کا موسم خزاں ختم ہوا۔ ہم جان و مال کی سلامتی کے وعدے پر اپنا قلعہ حوالے کرنے کو تیار ہیں۔

بہرام: وقت کی یہی پکار تھی۔ ضرورت و مصلحت کا یہی مطالبہ تھا ـــــ ملک کی بنیادیں آنے والے زلزلے کی دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ آپ نے اس فیصلے سے بند باندھ کر خون و تباہی کے سیلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ بربادی کے ہاتھ کے حربے چھین لیے۔ بدبختی کی امیدیں توڑ دیں ـــــ میں آپ کی دانائی و مآل اندیشی کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میری زبان سے سہراب کا شکریہ آمیز جواب سننے کے لیے آمادہ رہیے۔

(غصہ اور جوش کے ساتھ گُرد آفرید کا داخلہ)

گُردآفرید: ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟

بہرام: صلح کرنے۔

گُردآفرید: کس سے؟

بہرام: سہراب سے۔

گُردآفرید: سہراب سے! ایران کے بدترین بدخواہ سے!! قوم کی آزادی کے غاصب سے!!! جبر و استبداد کے نمائندے سے؟ ـــــ طاقت ور سے کمزور کا، پتھر سے شیشے کا، آندھی سے تنکے کا کبھی اتحاد نہیں ہوتا۔ صلح برابر والوں میں ہوتی ہے، اور طاقت کا ثبوت دینے کے بعد ہوتی ہے ـــــ یہ غیر مساوی صلح پست

ہمتی کا اظہار بے کسی ہے۔ ذلت کی پرستش کا معاہدہ ہے۔ ملک فروشی کی دستاویز ہے۔ تمھاری عزت کی پیشانی پر دائمی غلامی کی مہر اور تمھاری مادرِ وطن کے پُر جلال چہرے پر شرم کی سیاہی کا داغ ہے۔ ۔

مردود ہے وہ کوشش، ملعون ہے وہ خامہ
آزادیِ وطن کا لکھے جو بیع نامہ
عزت سمجھ رہے ہو غیروں کی بندگی میں
مر جاؤ -- گر ہے جینا ذلت کی گندگی میں

بہرام : گُرد آفرید۔ حریف کی طاقت اور ملک کی کمزوری کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد رائے ظاہر کرو۔ غلط جوش عقل کی گمراہی ہے ـــــ جس سہراب نے اس قلعۂ سفید کے محافظ ہجیر جیسے طاقت کے پہاڑ کو گھوڑے سمیت اٹھا کر مٹی کے ڈھیلے کی طرح زمین پر پھینک دیا۔ اس محبوبِ تقدیر و خداوند شمشیر کو ہم پاشکستہ تدبیروں اور مجنونانہ تقریروں سے فتح نہیں کر سکتے۔

گُردآفرید : فتح جرأت و عزیمت سے ملا کرتی ہے۔ سوچنے رونے اور بیوہ عورت کی طرح ہائے ہائے کرنے سے نہیں ملتی۔ فتح بے عزتی کے غلاموں کی مالکہ اور ہمت کے آقاؤں کی کنیز ہے۔ بزدل قسمت سے فتح کی بھیک مانگتے اور جری قسمت کے منہ پر تھپڑ مار کر فتح کو اپنی مِلک اور حق سمجھ کر زبردستی حاصل کرتے ہیں۔ ۔

جرأت ہے جس کے پاس وہی فتح مند ہے
جھک جائے گا جہان جو ہمت بلند ہے
اٹھو، بڑھو، دکھاؤ کہ طاقت ہے پاؤں میں
ملتی ہے فتح مرد کو، خنجر کی چھاؤں میں

بہرام : لیکن جب صلح کر لینے سے ہمارا قلعہ، وجاہت، ثروت، زندگی، ہر شے شامت و ہلاکت سے محفوظ رہتی ہے تو فولاد پیکر سہراب سے پنجہ کشی کر کے ہمیں دنیا میں اپنی حماقت کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

گردآفرید :شرم کر! شرم کر!! خود غرضی کے بازار میں دولت و راحت کے مصنوعی سکوں پر قوم کا اقتدار و حرمت فروخت کر دینے کو تو شرافت کا سودا جانتا ہے؟ پالو کتے کی طرح گلے میں سہراب کی اطاعت کا پٹہ ڈال کر اس کے پاؤں چاٹنے کو عزت کی زندگی سمجھتا ہے؟ ۔

تری زباں ہے فسانہ نمک حرامی کا
سبق پڑھاتا ہے اوروں کو بھی غلامی کا

بہرام : خبردار۔ گرد آفرید۔تو کسی معمولی شخص سے ہم کلام نہیں ہے۔ میری شخصیت و حیثیت کا ادب کر۔ جا۔ گھر میں جا ـــــ سلطنت کے انتظام میں عورت کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

گردآفرید :شرافت باختہ، بے حیا، تو مجھے عورت کہتا ہے۔ آ، عمل کے آئینے میں ہم دونوں اپنے چہرے دیکھیں اس وقت تیری حقیقت تیرے سامنے بے نقاب ہوجائے گی۔ تیری نگاہیں شرم کے بوجھ سے دب کر زمین میں دفن ہوجائیں گی۔ اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ گرد آفرید عورت نہیں، بہرام عورت ہے۔ کیونکہ میں عورت ہوکر بھی دنیا کے شریف ترین مرد کی طرح ملک و قوم کے دشمن کا سر اپنے پیروں سے روندنا چاہتی ہوں ـــــ اور تو مرد ہوکر ایک آبرو فروش عورت کی طرح اپنی پلکوں سے سہراب کے پاؤں کی گرد صاف کرنا اور اس کی پاپوش کو اپنے سر کا تاج بنانا چاہتا ہے۔

بہرام : ذلیل ـــــ زباں دراز ـــــ

(گرد آفرید پر تلوار سے حملہ کرتا ہے اور وہ کلائی مروڑ کر تلوار چھین لیتی ہے)

گردآفرید : کتا شیرنی پر حملہ نہیں کر سکتا۔ وطن کے دشمن (لات مار کر) جا۔ سہراب کے کفش برداروں کی فہرست میں نام لکھا کر اپنی عزت افزائی پر فخر کر ـــــ تیری قسمت میں نہ شریفوں کی زندگی ہے۔ نہ بہادروں کی موت ہے۔

بہرام : گرد آفرید۔ میں اس توہین کا خوفناک بدلہ لوں گا ـــــ تجھ سے بھی ـــــ

اور جو یہ نظارہ دیکھ کر اپنی مجرمانہ خاموشی سے تیری تائید کر رہے ہیں۔ ان
سے بھی۔

(غصے میں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چلا جاتا ہے)

گرد آفرید :ایران کے دلیرو۔ یہ دوست نما منافق، جس کے پاس مردانہ روح، شرم، ایمان، کچھ نہیں ہے۔ ذاتی مفاد کی نگہداشت جس کا اصول، مطلب پرستی جس کی زندگی کا معیار و معراج، اور دغا جس کا ضمیر ہے، اپنی گویائی کی حرارت سے تمھارے دل میں ہمت کے لہراتے ہوئے چشموں کو خشک کر کے تمھیں بھی اپنی طرح مردودِ خلائق بنانا چاہتا تھا۔ خدا نے تمھیں اس نگوں ساری و خواری سے بچا لیا ہے۔ بہادرو! سہراب اس دنیا میں دنیا سے کوئی علحدہ چیز نہیں ہے۔ وہ بھی تمھاری ہی طرح مٹی، پانی سے بنا ہوا انسان ہے۔ وہ بھی تمھاری ہی طرح اپنی زندگی کی مدت اور موت کے وقت سے بے خبر ہے۔ اس لیے تنکے کو پہاڑ اور پہاڑ کو آسمان سمجھ کر اپنی طاقتوں کو حقیر نہ سمجھو ـــــ اٹھو ـــــ اٹھو ـــــ مست ہاتھی کی طرح جھوم کر، آندھی کی طرح جھلا کر، بادل کی طرح گرج کر، بجلی کی طرح تلواریں کھینچ کر حفاظت وطن کے لیے اُٹھ کھڑے ہو۔ جہاں بزدلی ہے۔ وہیں شکست ہے۔ اور جہاں جرأت ہے وہیں فتح ہے۔

گستہم : خوف خیال کا خواب ہے۔ تم نے اس خواب سے ہمیں بیدار کر دیا۔

سب : زندہ باد گرد آفرید۔

گرد آفرید :زندہ باد۔ ایران۔

(سب جوش میں تلواریں کھینچ لیتے ہیں)

دوسرا ایکٹ - چوتھا سین

میدان جنگ کا ایک حصہ

(ہومان، بارمان اور قلعہ سفید کے محافظ ہجیر کے ساتھ سہراب کا داخلہ، ہجیر کے دونوں ہاتھ بندھے ہیں)

سہراب : تم قلعہ سفید کے محافظ ہو؟

ہجیر : ہاں۔

سہراب : تمھارا نام؟

ہجیر : ہجیر۔

سہراب : قلعے کے حاکم کا نام؟

ہجیر : گژدہم۔

سہراب : اگر قید کی زندگی کو، جس کے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی ہے، آزاد زندگی سے بدلنا چاہتا ہو، تو تنبیہ آمیز خط لکھ کر انجام سے غافل گژدہم کو آگاہ کرو کہ خوفناک مستقبل، تباہی و بربادی کے جلوس میں قلعے کے پھاٹک کے سامنے پہنچ گیا ــــــ اس لیے رحم و معافی حاصل کرنے کے لیے میرے حضور میں آکر نذرانۂ اطاعت پیش کرے۔

ہجیر : قویٰ کے ساتھ میری قوت حافظہ بھی ضعیف ہوگئی ہے۔ اس لیے عمر کے آخر دنوں میں غداری کا سبق یاد نہیں کرسکتا۔

سہراب : یعنی؟

ہجیر : تم نے میدان جنگ میں شکست دے کر میرے جسم کو قید کر لیا ہے۔ میری

روح تمھارے قید و بند میں نہیں ہے۔ میرا ضمیر اور میرا جذبۂ وطن پرستی آزاد ہے اور ہمیشہ آزاد رہے گا۔ غلش و خطرہ سمجھ کر انتہائی عقوبتوں کے ساتھ قتل کر دو۔ یا فتح کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو۔ لیکن میں لالچ سے مغلوب اور تکلیفوں سے دہشت زدہ ہوکر اپنے ملک کی غلامی کے کاغذ پر کبھی دستخط نہ کروں گا۔

سہراب : عقل کی شرکت میں اپنی غلط کار رائے پر نظر ثانی کر۔ موت کے جبڑے میں ملک کو نہ جھونک۔ میری اطاعت ہی میں تیرے اہلِ وطن کی زندگی ہے۔

ہجیر : زمین پر رینگتے ہوے حقیر کیڑوں کی طرح صرف حرکت کرنے اور سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔ آزادی اور اختیار سے محروم ہوکر پامال گھاس کی مانند جینا، انسانیت کی موت ہے۔ میری تمنا ہے اور دعا ہے کہ میرے اہلِ وطن جئیں۔ لیکن غلام بن کر نہیں، آقا بن کر۔ کتے کی طرح نہیں، شیر کی طرح۔

سہراب : گژدہم کو خط لکھ کر تسلیم شکست کا مشورہ دینا تیری طرف سے اس ملک کی سب سے بڑی خدمت تھی۔ تیرے انکار نے ثابت کر دیا کہ تو سخت بے وقوف ہے۔

ہجیر : ملک کے نمک حراموں کو ملک کے دشمن بھی احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ میں بے وقوف کہلانا پسند کرتا ہوں لیکن اپنے بے داغ و معزز نام کے ساتھ دغاباز اور قوم فروش کے خطاب کا اضافہ نہیں چاہتا۔

سہراب : اچھا تو اب میرے غضب کی ہولناکیوں کو رحم الزام نہیں دے سکتا۔ (ہومان اور بارمان سے) خوں ریزی و تبہ کاری کے مقید درندوں کی زنجیریں کھول کر قلعۂ سفید پر حملہ آور ہونے کے لیے آزاد کر دو۔ اور غم کی سیاہ راتِ میں برباد شدہ وطن کے تودہ خاک پر الّو کی طرح ماتم کرنے کے لیے اس بدبخت کو قید میں رکھو ـــــ لے جاؤ ـــــ یہی ناشکر گزاری کی کم سے کم سزا ہے۔ (ہومان۔ بارمان ہجیر کو لے جاتے ہیں) یہ یقین کے فریب خوردہ، یہ نیم مجنون ایرانی، امید کی زمین میں ہنسی بو رہے ہیں۔ لیکن انھیں بہت جلد آنسوؤں کی فصل کاٹنی ہوگی۔ ـ

مرے قدموں کو بوسہ دے گی جھک جھک کر جبیں تیری
بساط عجز بن جائیگی سجدوں سے زمیں تیری
اٹھا سکتا نہیں سر، تیغ جوہردار کے آگے
سُن۔ او ایران۔ جھک جا، اب مری تلوار کے آگے

(مردانہ لباس میں انتہائی جوش و غضب کے ساتھ گُرد آفرید کا داخلہ)

گُردآفرید : ایران کی تاریخ، شرفِ انسانیت و فتوحاتِ شرافت کا صحیفۂ زریں ہے، فروتنی و پامالی کا افسانۂ ذلت نہیں ہے۔ ایران اپنی علمی، اخلاقی، تمدنی اور جنگی قوتوں کے سامنے دنیا کا سر جھکانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ جھکنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ ـ

ایران کے قدموں میں ہے جیحون سے تا گنگ
اس خاک سے پیدا ہوئے طہمورث و ہوشنگ
ہر ذرہ ہے، خورشید کا ہم پایہ و ہم رنگ
ہر قطرہ ہے، طوفانِ قضا پوش، دم جنگ
ہر فرد یہاں کوہ فگن زور شکن ہے
یہ شیروں کا گہوارہ، شجاعت کا وطن ہے

سہراب : تیرے پاس پرشکوہ استعاروں اور فصیح و بلیغ لفظوں کا وافر سرمایہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تو اپنی گویائی کے اسراف سے ایرانیوں کے حوصلوں کی بے مائیگی اور عزم و ہمت کے افلاس پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ قسمت کے افق پر صبح زوال کی پہلی کرن دکھائی دے رہی ہے۔ پھر بھی احمق ایران ابھی تک زندگی کو شب راحت سمجھ کر دیرینہ عظمت کا خواب دیکھ رہا ہے۔

گُردآفرید : آفتاب کے عظمت و جلالت کا انکار اپنے بے بصر ہونے کا اقرار ہے۔ غرور کے مرض سے تیری بینائی مفلوج ہو گئی ہے۔ اس لیے تیری نظر پلکوں کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

سہراب : جنگ کا میدان شاعروں کی بزم خیالی، منطقیوں کی مجلس، فلسفہ کا مدرسہ نہیں ہے۔ یہاں کی شعریت کا نام زخم، منطق کا نام تلوار اور فلسفے کا نام طاقت ہے ـــــــ اچھا ظاہر کر تو کون ہے؟ تیری موت کے بعد قلعہ سفید میں کس نام سے تیرا ماتم کیا جائے گا؟

گُردآفرید : ۔

دشمن نخوت، حریف شعلہ سامانی ہوں میں
بس مرا نام و نشاں یہ ہے کہ ایرانی ہوں میں
سیلِ خون میں موج آہن کی روانی دیکھ لے
آج تو بھی بُرشِ تیغ کیانی دیکھ لے

(حملہ - خوفناک طویل جنگ - گُرد آفرید کی شکست۔ گھوڑے سے زمین پر گرتے وقت خود علحدہ ہوجانے سے گُرد آفرید کے بال کھل کر بکھر جاتے ہیں۔ اور مرد کے لباس میں ایک حسین دوشیزہ کو دیکھ کر سہراب حیرت زدہ ہوجاتا ہے)

سہراب : رعنائی نسائیت کی جمیل ترین تصویر مردانہ مرقعے میں! حسن کی دنیا کا ماہ کامل زرہ بکتر کے بادل میں!! موسم بہار کے تبسم کی رنگین جنگی نقاب میں!!! ۔

چمک رہا ہے نگار قدرت کا تاجِ زر خاک کی جبیں پر
کہ شاخ انجم سے گر گیا ہے کوئی گل روشنی زمیں پر
طلوع نور سحر کا عالم ہے جلوۂ جسم نازنیں پر
نثار ہے حسن شام جنت، بہار گیسوے عنبریں پر
حسین آنکھوں میں سحر ناطق، نظر میں انداز دلبری کے
بلوری گردن پہ روئے روشن، چراغ ہے ہاتھ میں پری کے

گُردآفرید :اقبال مند سہراب۔ وہ ایران کی بہادر لڑکی جس کے بازوؤں میں طاقت کا طوفان، جس کی تلوار میں بجلیوں کا سیلاب، جس کے حملے میں کوہ آتش فشاں

کا ہنگامہ پوشیدہ تھا۔ جو حریف کو کتاب زندگی کا مہمل لفظ اور فتح کو اپنے گرز کی ضرب کی صدائے بازگشت سمجھتی تھی، آج اُس کے اعتقاد کی دنیا، ناکامی کے زلزلے سے تباہ ہو گئی۔ اس کے یقین کا فلک بوس قلعہ بنیادوں سے اکھڑ کر عاجزی کی زمین پر سرنگوں ہو گیا ـــــ مجھے امان دو ـــــ میں اظہار درماندگی کے ساتھ اپنی شکست کا اقرار کرتی ہوں۔

سہراب : بہادر نازنین۔ زندگی کی سلطنت میں عورت حاکموں کی حاکم اور فاتحوں کی فاتح ہے۔ جو خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر اپنی رنگیں مسکراہٹ سے ایک لمحہ میں آدمی دنیا کو قتل کر سکتی ہے۔ جو شرم آلود نگاہوں کے اشارے سے چشم زدن میں بادشاہوں کا تاج اور دلیروں کی تلوار چھین سکتی ہے، اسے تیر و شمشیر لے کر میدان جنگ میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ حُسن کے مقابلے میں ہمیشہ مرد کے غرور کو شکست ہوئی ہے۔ اٹھو ـــــ یہ میری فتح نہیں، تمھاری فتح ہے۔

گُردآفرید :(اپنے آپ سے) کس قدر شریف! جتنا چہرہ خوبصورت اتنا ہی دل خوبصورت (چونک کر) ارے میں کدھر بہی جا رہی ہوں؟

سہراب : فتح یاب حسینہ! پنکھڑیوں کا دروازہ کھول کر باہر نکل آنے والی خوشبو کی طرح تم اپنی اصل شکل میں عیاں ہوگئیں، تو اب تمھیں اپنا نام و نشان بھی ظاہر کر دینا چاہیے۔ یہ میرا حکم نہیں، بارگاہِ حُسن میں مودبانہ درخواست ہے۔

گُردآفرید :میرے نام میں کوئی ایسی شیرینی اور موسیقی نہیں ہے، جس سے سامعت لذت اندوز ہو سکے۔ میں قلعہ سفید کے حاکم گژدہم کی بیٹی گُرد آفرید ہوں۔

سہراب : اور ـــــ اور ـــــ جانتی ہو۔ میں کون ہوں؟

گُردآفرید :جس گُرد آفرید کی ہیبت سے بہادروں کی رگوں کا سرخ خون زرد ہو جاتا تھا۔ تم اسے شکست دینے والے سہراب ہو۔

سہراب : تمھاری نظر تمھیں مغالطہ دے رہی ہے۔ آفتاب کی تجلی میں شمع کی روشنی کی طرح میری قدیم ہستی تمھارے حُسن کے جلال میں گم ہو گئی۔ اس چہرے کی پرستش کے لیے اب میں نے نیا نام، نیا جسم، نئی زندگی اختیار کی ہے۔ ـــ

مجروح شوق، جور کشِ روزگار ہوں
زخمی جگر کا شور، وفا کی پکار ہوں
دل کو نشہ ہے عشق کا آنکھوں کو دید کا
سہراب اب غلام ہے گُردآفرید کا

گُردآفرید :(اپنے آپ سے) اس کی باتیں فردوسی نغمہ کیوں معلوم ہوتی ہیں؟ کیا میری روح میں کوئی تبدیلی ہو رہی ہے؟

سہراب : پیاری آفرید! عرضِ تمنا کے جواب میں تمھاری ایک مختصر 'ہاں' عشق کی عقیدت مندی کا بہترین انعام ہے۔ میرے دل کو تحفۂ محبت سمجھ کر قبول کرو۔

گُردآفرید :(اپنے آپ سے) ایک نامعلوم جذبہ انتقام کے شعلوں کو سرد کیے دے رہا ہے ـــــ مگر نہیں ـــــ عظمت وطن کے قاتل کا جرم میں کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ (سہراب سے) سہراب۔ تمھاری تلوار نے گُرد آفرید کو فتح کیا تھا، لیکن تمھارے شریفانہ سلوک نے، غیرمقلوب نفرت کو شکست دے کر، گُرد آفرید کی روح کے ہر گوشے اور دل کے ہر ذرے کو فتح کر لیا۔ تم اب تک دشمن تھے، لیکن اب میری جان کے مالک اور میرے ملک کے مہمان ہو۔ میں تمام ملک کی طرف سے تمھیں اور تمھاری بہادر فوج کو قلعہ سفید میں تشریف آوری کی دعوت دیتی ہوں۔ اجازت دو کہ قلعے میں جاکر تمھارے شاہانہ خیر مقدم کی تیاریوں سے جذبات کی فضا میں محبت کا بہشت تعمیر کروں۔

سہراب : اب میں تمھاری مرضی کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ تمھارا حکم میری زندگی کا واجب الاطاعت قانون ہے۔ کیونکہ تم حُسن کی سلطنت کی ملکہ ہو اور میں اس سلطنت کی وفادار رعیت ہوں۔

گُردآفرید :تم ـــــ تم ـــــ میرے دل کی دنیا کے ـــــ بادشاہ ہو۔

(دونوں جاتے ہیں)

دوسرا ایکٹ - پانچواں سین

قلعۂ سفید کا دروازہ

(ہومان، بارمان اور سردارانِ فوج مع لشکر موجود ہیں)

ہومان : دنیا کے حربوں میں سب سے زیادہ خوفناک حربہ عورت کا حُسن ہے۔

بارمان : اور حُسن ہی کا دوسرا نام عورت کی فتح ہے۔

ہومان : یہاں بھی حسن و عشق کا معرکہ کارزار شروع ہو گیا ہے۔

بارمان : پہلی جنگ میں گُرد آفرید کو شکست ہوئی تھی۔ اس جنگ میں سہراب کی شکست ہوگی۔

(از خود رفتہ حالت میں سہراب کا داخلہ)

سہراب : محبت! محبت!! تو زندگی کی حلاوت ہے، دل کی جنت ہے، روح کا نشہ ہے، دنیا کا حسن ہے، عروسِ آفرینش کا سنگھار ہے، دوشیزۂ فطرت کے رنگینیٔ شباب کی فردوس آفرینی ہے۔ ؎

زندہ ہے تجھ سے روح طرب کائنات میں
تو نغمہ ازل ہے، ربابِ حیات میں
آسودگی روح، نشاط نظر نہیں
دنیا میں کچھ نہیں ہے، محبت اگر نہیں

ہومان : اے ضیغمِ توران! ـــــــ آپ معبد عشق میں حسنِ نسوانی کے بت رعنا کے روبرو اظہار عبودیت کے لیے ایران نہیں آئے ہیں۔۔۔ اپنا عہد و ارادہ یاد

کیجیے ـــــ میدان مبارزت میں محبت کی فتح یابی، تورانیوں کی فتح نہیں ہے۔

بارمان : میری بھی یہی گزارش ہے کہ اس ارضِ دار و گیر، اس ہستی و عدم کی درمیانی زمین پر آپ کے ولولۂ حرب و ضرب کو صنم پرستی میں مشغول دیکھ کر تمام تورانی لشکر چشمِ حیرت بن گیا ہے۔ معاف کیجیے گا ـــــ محبت ناکاروں کا مشغلۂ بیکاری اور محبت کے لفظ کی تکرار بیمار عقل کا ہذیان ہے۔

سہراب : تم پتھر ہو، سرد ہو، بے کیف ہو۔ زندگی کی بہترین لذت سے محروم ہو۔ تمھارے دل میں محبت کی حِس ہوتی تو تم بھی اقرار کرتے کہ دنیا کا نور عورت کا حسن ہے اور حُسن کا حُسن گُرد آفرید ہے۔

ہومان : افسوس!

سہراب : افسوس ان کے لیے ہے جو محبت کے آبِ حیات کو زہر سمجھتے ہیں (قلعے کے پھاٹک کے قریب جاکر) تعجب! ابھی تک دروازہ بند ہے!!

بارمان : اور دنیا کے خاتمے تک بند ہی رہے گا۔

سہراب : کیوں؟

ہومان : تاکہ دنیا پر ثابت ہوجائے کہ آپ نے گُرد آفرید کی نمائشی، مصنوعی، پُر فریب محبت پر یقین کرکے، ناقابلِ تلافی غلطی کی ہے۔

سہراب : خبردار! ـــــ تم میرے یقین کو دیوانگی کہہ سکتے ہو، میری آنکھوں کو الزام دے سکتے ہو۔ میرے دل کو اپنی زبان سے مجروح کر سکتے ہو۔ لیکن گُرد آفرید کی محبت کو، جھوٹی محبت کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ تم نے ان پھول کی پنکھڑیوں سے شہد ٹپکتے نہیں دیکھا۔ ایسے خوبصورت ہونٹ، کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

بارمان : اے دامِ فریب کے خوش اعتقاد اسیر، اب بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیجیے۔ دشمن کے جنگی قلعے کا دروازہ عورت کے وعدوں سے نہیں، زورِ بازو سے کھلتا ہے۔

(فصیلِ قلعہ پر گُرد آفرید دکھائی دیتی ہے)

سہراب : (ہومان و بارمان سے) وہ دیکھو۔ اُدھر دیکھو، اور اپنے قیاس کی ناتواں بنی پر نادم ہو۔ ۔

کہتے تھے تم کہ مرہم زخم نظر نہیں
دنیائے انتظار میں شب ہے، سحر نہیں
ہر ذرہ چشم شوق ہے، ارمان دید میں
پھیلا ہوا ہے نور فضائے اُمید میں

(بیتابانہ دیوار قلعہ کے نزدیک جاکر) پیاری آفرید۔ روح سے قریب ہو کر اب اس قدر دور کیوں ہو؟ فصیل قلعہ سے جلووں کی بارش ہو رہی ہے، لیکن اس سے تشنہ تمناؤں کی تسکین نہیں ہوسکتی۔ ۔

(ہومان اور بارمان کی طرف اشارہ کر کے)

بجلی گرا دے ان کے خیال اور یقین پر
آ۔ میرے دل کے چاند، اتر آ زمین پر

گُردآفرید :زمین کی لعنت! دنیا ظلم فروشی کا بازار، غلام سازی کا کارخانہ، وقار انسانیت کی قتل گاہ، عزت نفس کا مذبح نہیں ہے۔ ہوا، پانی روشنی کی طرح خدا کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں سے آزادی بھی ایک نعمت ہے۔ ہر خطۂ دنیا اسے قدرتی ورثہ اور ہر انسان اسے اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ ایرانی قوم نے تیرے ملک کی آزادی، دولت، صنعت، حرفت، تجارت، دنیا کی برکتوں میں سے کون سی برکت اور زندگی کی مسرتوں میں سے کون سی مسرت چھین لی تھی۔ جو تو بلا اشتعال، بلا سبب، بلا جرم اس کا تمدنی و معاشرتی نظام غارت کرنے اور اس کے دل کا اطمینان اور ملک کی متاع نشاط لوٹنے آیا ہے؟ ـــــ تو بہادر نہیں رہزن ہے۔ جا۔ واپس جا۔ بہشت کے آستانے پر اہرمن کے کارندے کا اور قلعہ سفید کے دروازے پر ایک ننگِ انسانیت ڈاکو کا خیر مقدم نہیں ہوسکتا۔

سہراب : پیاری آفرید۔ یہ اہلِ وفا کی زبان اور محبت کا لہجہ نہیں ہے۔ تم اس طرح غیر شناسا بن کر گفتگو کر رہی ہو۔ گویا ہماری ملاقات اس دنیا کے بدلے خواب و خیال کی دنیا میں ہوئی تھی۔ کیا اتنی دور سے پہچان نہیں سکتیں؟ غور سے دیکھو۔ میں سہراب ہوں۔ وہی سہراب، جس کے احساس و تخیل میں تم نے انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ وہی سہراب، جو حُسن کی پرستش کو عشق کا مذہب اور تمھارے تصور رنگیں کو اپنی روح کی بہشت سمجھتا ہے۔

گُردآفرید :خبردار۔ ان سامعہ خراش لفظوں سے میرے تقدیس حُسن کی توہین نہ کر ــــــ مغرور۔ اپنی اتفاقی کامیابیوں کو وقت کی سفلہ نوازی اور قسمت کی غلط بخشی سمجھنے کے بدلے، یہ سمجھ رہا ہے کہ تو جہاں پر جابرانہ حکومت کرنے کے لیے، اور یہ جہاں مجبور بیل کی طرح اپنے زخمی کندھوں پر اطاعت کا جوا رکھ کر تیرے دائرۂ حکم میں گردش کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے ــــــ لیکن ارضِ ایران کی وسعت، قلعہ سفید کی چار دیواری میں محدود نہیں ہے۔ ہماری موت کے بعد بھی ایران اپنی قوت و شوکت کے ساتھ زندہ رہے گا۔ اور ثابت کر دے گا کہ سہراب وقت کے کھیلنے کا کھلونا اور اتفاقات کی ہوا میں قسمت کی لہروں پر ناچتے ہوئے بلبلے کا تماشا ہے۔

سہراب : پیاری آفرید ۔ عورت دنیا کی سب سے زیادہ حسین و محبوب شے ہے۔ جذبات اس کا نام سنتے ہی ناچ اٹھتے، روح اس کے تصور سے روشن ہو جاتی، اور عشق اپنی تمام نیاز مندیوں کے ساتھ اس کے قدموں پر سجدے میں گر پڑتا ہے۔ تمھاری اس محبت آزار گفتگو سے اس کی رفعت و محبوبیت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ عورت کی تغیر پذیر فطرت کے بارے میں کتابوں کے ورق اور انسان کے تجربوں نے جو رائے دی ہے کیا تم اس غلط رائے کو آج صحیح ثابت کرنا چاہتی ہو؟ ؎

کیوں کیا مخمور و بے خود بادۂ سر جوش سے
کیوں دیا پیغام الفت نرگس مے نوش سے

ایک فتنہ اور بالائے زمیں پیدا کیا
کیوں میرے دل میں محبت کا یقیں پیدا کیا

گُردآفرید: محبت کا یقین دلائے بغیر تیری قید سے رہا ہونا ناممکن تھا۔ بے وقوف سُن۔ اپنے اہلِ وطن کی روح میں نامردانہ زندگی کی حقارت اور شجاعانہ موت کا احترام پیدا کرنے اور پیداشدہ جذبے کو آخری سانس تک قائم و شعلہ فشاں رکھنے کے لیے مجھے زندہ رہنے کی ضرورت تھی۔ شکر ہے کہ میں زندہ ہوں۔ لیکن سہراب کے لیے نہیں، اپنے ملک کے لیے۔ محبت کے لیے نہیں وطن کی خدمت کے لیے۔ تو مسمار گھروں اور بے کفن لاشوں پر قبضہ کر سکتا ہے۔ لیکن ہماری زندگی میں ہمارے قلعے اور ہماری آزادی پر قبضہ نہیں کر سکتا۔

سہراب: (انتہائی حیرت سے) گُرد آفرید! گُرد آفرید!!۔

گُردآفرید: رعونت کے پتلے! یہ ایران و توران کی کشاکش نہیں، مصافِ حیات میں خودغرضی و ظلم سے ایثار و قربانی کی آویزش ہے۔ یہ جنگ جابروں کے لیے، سرمایہ لعنت اور ستم رسیدوں کے لیے تلقین خودداری و درسِ حریت ہے۔ اگر قسمت کی شرکت و اعانت سے تو کامیاب بھی ہوا، تو تیری فتح شکست سے زیادہ ذلیل اور وقت کی ناسماعدت سے ہم سپر انداز بھی ہوئے، تو ہماری شکست فتح سے زیادہ شان دار ہوگی ——— تاریک سائے میں ڈوبتے ہوئے شام کے آفتاب کی طرح دنیا نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اب صرف دو چیزیں دھویں کے کاغذ پر لکھے ہوئے آگ کے حرفوں کی طرح دکھائی دے رہی ہیں۔ معزز زندگی یا معزز موت۔

(گُرد آفرید چلی جاتی ہے)

سہراب: حسین جسم میں دغا باز روح! صندل میں سوزش!! چاندنی میں دوپہر کی دھوپ کی تپش!!! (ہومان۔ بارمان سے) تم سچ کہتے تھے۔ حسن نے کبھی وفادار دل کی قدر نہیں کی۔ حملہ کرو۔ حملہ کرو۔ اس قلعۂ سفید، اس حصار سنگین کی ہستی، عورت کے وعدے سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ اُف۔ کتنا فریب۔

عورت!۔ عورت!! تو صرف ایک خوبصورت دھوکا ہے!!!۔

(تورانی لشکر حملہ کرتا ہے۔ فصیل قلعہ سے کھولتے ہوئے تیل، گراں وزن پتھروں اور تیروں کی خونیں بارش ہوتی ہے۔ طویل و مہیب جنگ کے بعد سہراب کے گرز سے قلعے کا دروازہ ٹوٹ کر گر پڑتا ہے۔ اور حملہ آور فوج قلعے میں فاتحانہ جوش کے ساتھ داخل ہوجاتی ہے۔)

دوسرا ایکٹ - چھٹا سین

قلعۂ سفید کا اندرونی حصہ

(حملہ آوروں کا شور۔ زخمیوں کی چیخیں۔ ہتھیاروں کی جھنکار۔ مارو۔ بھاگو کا غل بہرام منتقمانہ جذبات و شریرانہ مسرت کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

بہرام : گناہ اور سزا دونوں اعتقاد کے فریب ہیں۔ نیکی و بدی کی تخئیلِ بلند پرواز عقل کی ترقی معکوس ہے ـــــ آج سے پیشتر اپنی شمشیر و تدبیر سے ملک کے دشمنوں کی امداد کرنا میں ایک شرمناک گمراہی، ایک ہیبت ناک گناہ، ایک پروردۂ لعنت جرم سمجھتا تھا۔ مگر اب؟۔ اب نہیں۔ موت، آگ، بربادی نے شہر کے ہر حصے کو گھیر لیا ہے۔ کٹے ہوے سر، خون کی لہروں پر بلبلوں کی طرح تیر رہے ہیں۔ ایک دریدہ دہن، محروم فراست چھوکری کو 'عقل کل' اور اس کی احمقانہ رائے کو دنیا کی دانش مندی کا خلاصہ سمجھنے والوں کی یہی سزا ہے۔ میری تردید و توہین کا بھی انعام ہے ـــــ ایران کی تاریخ میں میرا نام، قاتلانِ قوم میں لکھا جائے گا ـــــ لکھا جائے ـــــ دنیا مجھے دشمنِ وطن کہے گی۔ کہنے دو ـــــ عاقبت خراب ہوگی ـــــ ہونے دو ـــــ مجھے قوم، وطن، عاقبت کچھ نہیں چاہیے ـــــ انتقام، صرف انتقام چاہیے ـــــ بہرام چل۔ دست بدست جنگ میں دوبارہ سہراب کی رہنمائی کر۔ سہراب کی فتح ہی تیرے انتقام کی فتح ہے۔

(بہرام کی روانگی۔ خوں چکاں تلوار لیے ہوئے گرد آفرید کا داخلہ)

گردآفرید: موت ایک تغیر ہیئت۔ ایک تبدیلی لباس، ایک نقل مکانی، ایک جدید آغاز عمل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ سفر حیات میں مسافر کا پیکر خاکی و مقصد سفر بدل جاتا ہے، لیکن منزل نہیں بدلتی۔ موجودہ زندگی کی انتہا، نئی زندگی کی ابتدا ہے۔ یعنی ہم موت کے دروازے سے معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا میں داخل ہوتے ہیں، یہی زندگی کا راز ہے۔ اور یہ راز صرف شہیدان حق و حریت کو معلوم ہے ——— شاباش۔ ایران کے فدائیو، شمع ملت کے پروانو۔ شاباش۔ تمھارے خون کا ہر قطرہ صبح عزت کا نو طلوع آفتاب اور تمھاری جنگِ آزادی کا ہر لحہ سعادتِ جاودانی کا سرمایہ دار ہے۔ سرفروشانہ موت کے بعد بھی تم مستقبل کے غیر فانی حافظے اور بقائے دوام کی لازوال دنیا میں زندہ رہوگے۔ تمھاری حیرت آفریں قربانیوں نے مغرور سہراب..... (سہراب کا نام زباں پر آتے ہی دل میں محبت کا خوابیدہ جذبہ بیدار ہو جاتا ہے) آہ، کتنا شجاع! کیسا شریف!! اس کے تجلی بار چہرے کی طرف دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اسی چہرے کے نور سے آفتاب و ماہتاب کی آفرینش ہوئی ہے۔ سہراب میری روح کو محبت کی روشنی سے منور کرنے والے سہراب، تم توران میں کیوں پیدا ہوئے؟ اگر تم مادرِ ایران کے فرزند ہوتے تو میں کنیز بن کر تمھاری خدمت کو کامرانی نشاط اور تمھاری پرستش کو وسیلہ نجات سمجھتی۔ اور..... (خیال بدلتا ہے) بے وقوف عورت۔ کیا عشق کی بجلیوں کی چمک کو جذبۂ جنگ کی تڑپ بتا کر ملک و قوم کے اعتبار کو دھوکا دے رہی ہے۔ کیا تو دل سے نہیں صرف زبان و تلوار سے سہراب کی مزاحمت کر رہی ہے؟ ہشیار ہو جا۔ تیرا گنہ گار خیال تجھے جرم کی مہیب دنیا میں کھینچے لیے جارہا ہے ——— اُسی دنیا میں، جہاں لعنت ہے رحمت نہیں۔ سزا ہے، کفارہ نہیں۔ نفرت کر، سہراب سے نفرت کر۔ دل سے بھی اور روح سے بھی.... (شعلہ محبت پھر بھڑکتا ہے) لیکن میں نفرت نہیں کرتی۔ اور نہیں کر سکتی۔ تو باعث تعجب کیوں ہے؟ دنیا میں کون عورت ہے جو اپنے شجاعت پیکر، وفاکردار، شریف رحیم، جمیل کو اپنا دل اور اپنا مقدر سپرد نہ کر دے گی! اسے دیکھنے کے بعد اس

حسن و جاذبیت سے معمور دنیا کی کسی شے کی طرف دیکھنے کی تمنا باقی نہیں رہتی۔ وہ صانع فطرت کی نظر افروز صنعت اور مصور قدرت کا حسین ترین شاہکار ہے.... (خیال کی رو پھر بدلتی ہے) دور ہو۔ اے عورت کی فطری کمزوری دور ہو۔ محبت کی باغیانہ شورش، فرض کی آواز اور ضمیر کی پکار کو مغلوب نہیں کر سکتی۔ جس قدر کمینہ شرافت سے غدار اپنے ملک سے، بزدل عزت کی موت سے نفرت کرتا ہے، میں بھی، ہاں میں بھی، اسی قدر سہراب سے نفرت کروں گی۔ اس کے چہرے کی نظر فریبی، صرف ایک حسین لعنت ہے ـــــ وطن کا دشمن۔ ارض وطن کی طرح خوبصورت، نعرۂ آزادی کی طرح پُر جلال، محبت قومی کی طرح قابل پرستش ہو۔ تب بھی وہ دنیا کی بدترین ہستی ہے۔

(خوف و اضطراب کی حالت میں گستہم کا داخلہ)

گستہم : اوہ۔ وہم بھی نہ تھا کہ انسان، جس کو چمن کائنات کا گل سرسبز، قدرت کا نقش آخر، آفرینش کا خلاصہ، کتاب تخلیق کا تکملہ کہا جاتا ہے، وہ بھیڑیے سے زیادہ خونخوار اور کتے سے زیادہ رذیل ثابت ہوگا۔ ـــــ اے خدا۔ تو نے اس بد نہاد شخص، اس متحرک لعنت کے ڈھیر کو کیوں پیدا کیا! کیا اس ننگِ ہستی کے بغیر تیرے بے عیب و مکمل نظام عالم کی تکمیل نہیں ہوسکتی تھی؟

گردآفرید : تمھارا ہر لفظ خطرے کا اعلان کر رہا ہے۔ کیا ہوا؟

گستہم : دغا۔ شرم ناک دغا۔

گردآفرید : دغا دی۔ کس نے؟ غیرت نے؟ ہمت نے؟ قسمت نے؟

گستہم : ایرانی ماں کے دودھ سے پلے ہوئے سانپ نے۔ قوم کش، خائن ملت بہرام نے۔

گردآفرید : ملعون۔ دوزخی۔

گستہم : اس نے سہراب کے پاس اپنا ایمان اور دوزخ کے پاس اپنی روح فروخت کر دی۔ اُس کی جفاکشی و بے حمیتی دیکھ کر مجھے تعجب ہو رہا ہے۔

گردآفرید : تعجب کیوں کرتے ہو؟ ہمیشہ ملک کے نمک حراموں ہی نے غیروں کی غلامی کے طوق سے اپنے ملک کی گردن کی زینت افزائی کی ہے ـــــ غداری کی تاریخ پڑھو۔ بہرام کی وطن دشمنی، دنیا کا پہلا عجیب واقعہ نہیں ہے۔

گستہم : اس کی امداد و رہنمائی سے سہراب کی فوج نے قلعہ کے محفوظ مقامات اور سامان جنگ کے ذخیروں پر قبضہ کر لیا۔ عنقریب قسمت جنگ کی کمان سے اپنے ترکش کا آخری تیر چلانا چاہتی ہے۔ اب ہمارے لیے کوئی امید باقی نہیں رہی۔

گردآفرید :(تڑپ کر) کیوں باقی نہیں رہی؟ جب تک غلامی سے نفرت باقی ہے۔ غیرت باقی ہے۔ جسم میں ایک بھی سانس اور قلعے میں ایک بھی جانباز باقی ہے، اُمید بھی باقی رہے گی۔ ہم فانی دنیا میں لازوال زندگی لے کر نہیں آئے ہیں۔ جب مدت حیات محدود، فنا لازمی، اجل یقینی ہے، تو عزت و شرافت کے ساتھ مرو۔ بہادروں کی طرح مرو۔ بوڑھے، اپاہج ناکارہ ہو کر بیماری کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے بدلے، قوم پر قربان ہو کر، مادر وطن کی آغوشِ محبت میں مرو ـــــ نااُمیدی سامنے سے دور ہو ـــــ آؤ ـــــ بس فتح یا ـــــ موت۔

(گرد آفرید تصویرِ غضب بنی گستہم کے ساتھ جاتی ہے۔ سہراب کا بہرام اور سپاہیوں کے ساتھ داخلہ)

سہراب : گرد آفرید۔ میری روح کی تمنا اور میرے خواب تمنا کی تعبیر ہے۔ اسے زندہ گرفتار کرو۔ خبردار، اس کے سر کے ایک بال اور پاؤں کے ایک ناخن کو بھی صدمہ نہ پہنچے۔

بہرام : لیکن گرد آفرید ہی نے ایرانیوں کی مردہ ہمتوں میں دوبارہ حرکت حیات، قوت عمل پیدا کی تھی۔

سہراب : اس لیے؟

بہرام : وہ رحم کی مستحق نہیں ہے۔

سہراب : عشق کی اتنی مجال نہیں کہ حُسن کو اس کے جرم کی سزا دے سکے —— جاؤ۔

(بہرام کا سپاہیوں کے ساتھ جانا)

ناز سراپا غرور اور نیاز ہمہ تن شکر ہوتا ہے۔ میں اس بے دید، بے مہر سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خوبصورتی اور بے وفائی کا آپس میں کون سا رشتہ ہے؟ چہرہ حسین، دل بہادر، آنکھیں بے مروت، میں نے دنیا میں ایسی عجیب خوبصورتی اور ایسی عجیب عورت نہیں دیکھی۔

(گُرد آفرید کی تلاش میں جاتا ہے)

--

دوسرا ایکٹ - ساتواں سین

اندرون قلعہ کا دوسرا حصہ

(دور گشت و خون کا ہنگامہ بہ گیر و بہ زن کا شور۔ آگ اور دھویں سے محصور گھروں کا نظارہ۔۔۔ گرد آفرید تکان سے نڈھال، زخموں سے چور، لہو میں شرابور، لڑکھڑاتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

گردآفرید: آزادی کا آفتاب تلواروں کی فضا میں خون سے رنگین افق پر آخری بار چمک کر غروب ہوگیا۔ دغا و خیانت نے قلعہ سفید کی قسمت کو غدار بہرام کا تیار کردہ سیاہ کفن پہنا دیا۔ (تلوار کو مخاطب کر کے) تلوار! پیاری تلوار!! میں غارت شدہ حیات قومی کا بقیہ، آتشِ افسردہ کا دھواں، کاروانِ رفتہ کا پس ماندہ غبار، ہنگامۂ تباہی کی آخری گونج ہوں۔ اس جسم سے روح کی علیحدگی کا وقت بھی قریب آپہنچا ہے۔ جب تک موت ان دونوں کو جدا نہ کر دے، میری جوانی کا سنگھار، میرے ہاتھوں کا زیور، میری زندگی کی وفادار سہیلی، تو مجھ سے جدا نہ ہونا ـــــ ایک بار سہراب کے خون میں.... (جذبۂ محبت سے مغلوب ہوکر) آہ کیسا خوب صورت نام۔ کتنا شیریں نام!!۔ اس نام کو سنتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کی دنیا میں محبت کے زمزموں کی بارش ہو رہی ہے۔ (خیال میں تبدیلی) محبت! کس کی محبت!! سہراب کی محبت؟ ـــــــ خبردار۔ دل۔ خبردار۔ اگر تو نے تصور کے آئینے میں ملک و قوم کے دشمن کی محبت کا عکس بھی پڑنے دیا۔ تو میں تجھے سینے سے نکال کر پیروں سے مل کر،

ذلت کی ٹھوکر مار کر بھوکے کتوں کے آگے پھینک دوں گی ـــــ آہ کیا تھا اور کیا ہوگیا!! انسانی اُمید اور انسانی زندگی کتنی بے حقیقت چیزیں ہیں۔ وقت کی گردش نے ثابت کر دیا کہ اُمید، تاریک فضا میں آسمان سے ٹوٹتے ہوے ستاروں کی عارضی روشنی اور زندگی ہوائی لہروں میں بہتے ہوئے پرندے کے متحرک پروں کا زمین پر بھاگتا ہوا سایہ ہے۔

(تورانی سپاہیوں کے ساتھ بہرام کا داخلہ)

بہرام : تلاش کامیاب ہوئی۔ گرفتار کر لو۔ گرو آفرید۔ میرے مشورے پر ہنسنے اور میری اہانت پر اظہار پسندیدگی کرنے والوں کی قسمت کا انقلاب دیکھا؟ ـــــ کہاں ہیں آزادی ملت کے فدائی؟ کہاں ہے تیرا قومی غرور؟ کہاں ہیں تیرے گرجتے ہوئے دعوے؟ ؎

دیکھ آئینے میں چہرہ زخم بھی ہے، خاک بھی
خون میں ڈوبا ہے دل بھی، جسم بھی، پوشاک بھی
گر رہے ہیں آنکھ سے آنسو تنِ صد پاش پر
رو رہی ہے کیوں کھڑی ہو کر وطن کی لاش پر

گردآفرید : کیا تیری روح اہرمن کے دل کی تاریکی سے پیدا ہوئی ہے؟ کیا تیری پرورش ایرانی ماں کے دودھ کے عوض درندے کے خون سے کی گئی ہے؟ موذی، جلاد۔ اگر تیرے ایمان کی طرح، تیری بصارت و سماعت بھی غارت نہیں ہو چکی، تو دشمن کی ٹھوکروں کی ضرب سے زخمی ملک کی دردناک حالت دیکھ، اور ڈوب مر بندگی اور بے چارگی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مادر وطن کی شرر بار فریاد سُن، اور شرم کر ـــــ اس خانماں ویرانی کا باعث، اس سیلاب ذلت کا منبع، اس طوفانِ ہلاکت کا مخرج، اس ناقابل عفو و ناقابل کفارہ جرم عظیم کا مجرم کون ہے؟ ـــــ تو ـــــ یہ جگر شگاف ماتمی آوازیں کسے ازلی و ابدی ملعون کہہ رہی ہیں؟ ـــــ تجھے ـــــ جن بہادروں نے حفاظت ملت کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک قربان کر دیا، کیا وہ تیرے قومی

بھائی نہ تھے؟ جن شریف عورتوں نے فرض کی قربان گاہ میں اپنے شوہروں، بھائیوں، بچوں کی جانیں نثار کر دیں، کیا وہ ملکی بہنیں نہ تھیں؟ ـــــــ اپنے بھائیوں کی زندگیاں، اپنی بہنوں کا سکون و آرام، اپنے مرزبوم کی سطوت و قہرمانیت لٹوا کر ندامت کے زخم سے مر جانے کے بدلے خوش ہو رہا ہے؟ ٹوٹے ہوئے دلوں، ذبح کی ہوئی اُمیدوں، خونِ جگر سے بھیگی ہوئی آہوں، سوختہ قسمت قلعہ سفید کی خاکسترِ برباد پر آنسو بہانے کے عوض دوزخ کے موکل کی طرح بے رحمی سے ہنس رہا ہے۔

بہرام : عداوت کے بازار کا سودا اتنے ہی گراں داموں پر بکتا ہے۔ تو نے مجھ سے میری نفرت مول لی تھی۔ یہ برگشتہ بختی اسی خرید کردہ نفرت کی قیمت ہے۔ یہ زبوں حالی میری جنسِ انتقام کا معاوضہ ہے۔

گُردآفرید :اگر تیرا دل مجھ سے انتقام لینے کے لیے بے قرار تھا، تو شریف دشمن کی طرح تلوار لے کر میرا مقابلہ کرتا۔ مقابلے کی جرأت نہ تھی تو کھانے میں زہر ملا دیتا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا تو سوتے میں چھری بھونک دیتا۔ لیکن غریب ملک نے تیرا کیا قصور کیا تھا، جس قصور کی پاداش میں تونے اس کے ہر گھر کو انسانوں کا مذبح اور ہر ذرے کو عظمت و عزت کا ماتم کدہ بنا دیا۔ تو سہراب کی نوازش کے سائے میں تباہ شدہ وطن کی خاک اور قوم کے زخمی دل کے خون سے اپنی دنیاوی جنت بنانا چاہتا ہے۔ لیکن اس جنت کا ہر پھول تیرے مجرم ضمیر کو سانپ بن کر ڈستا، اور یہ معصیت آباد ہمیشہ نفرت و لعنت کے زلزلوں سے کانپتا رہے گا۔ یاد رکھ، جرم کی زندگی اطمینان قلب کی موت اور گناہ کی بہار، روح کی خزاں ہے۔

راحت عصیاں سے بڑھ کر رنج عالم میں نہیں
وہ جلن اس آگ میں ہے، جو جہنم میں نہیں

بہرام : (ہمراہیوں سے) کیا دیکھتے ہو؟ ـــــ گرفتار کرو ـــــ یا قتل کر دو۔

(سپاہی چاروں طرف سے یورش کرتے ہیں۔ گُرد آفرید شکاریوں

کی برچھیوں کے حلقے میں محصور شیرنی کی طرح ہر ایک کے حملے
کا جواب دیتی ہے)

میرے گرسنہ انتقام کا آخری نوالہ۔

(پیچھے سے گُرد آفرید کی پیٹھ میں خنجر بھونک دیتا ہے)

گُردآفرید: آہ ــــ دغاباز ــــ مار آستین۔ (گرتے گرتے پلٹ کر دونوں ہاتھوں سے بہرام کا گلا پکڑ لیتی ہے) اتنے گناہ کرچکا تھا۔ یہ آخری گناہ نہ کرتا تو کیا دوزخ کے دروازے تیرے لیے بند ہو جاتے؟ کتے، تجھے زندہ رکھنا کمینہ پن کی عمر میں اضافہ کرنا ہے۔ تیرا ایمان مر چکا۔ انسانیت مرچکی۔ تو بھی مر..... (غصے میں جان لینے کے ارادے سے گلا دباتی۔ پھر رک جاتی ہے) مگر نہیں ــــ تو بدفطرت ہے۔ نمک حرام ہے۔ سنگ دل ہے۔ قاتل ہے۔ دنیا کی بدترین مخلوق ہے۔ سب کچھ ہے، پھر بھی میرا ہم وطن ہے ــــ (گلا چھوڑ دیتی ہے) جا ــــ قوم پرستوں کے مذہب میں بدی کا بدلہ بدی نہیں ہے۔ میں اپنے وطن کی عزت کے صدقے میں تجھے اپنا خون معاف کرتی ہوں۔

(گُرد آفرید زمین پر گرتی ہے۔ سہراب کا داخلہ)

سہراب: یا خدا ــــ میں کیا نظارہ دیکھ رہا ہوں! قفس خاکی کی رنگیں نوا فاختہ، پیکر شجاعت کی حسین روح، شعلہ حُسن کی تجلی، خون میں ڈوبی ہوئی ہے!!۔ افسانہ عزت کا عنوان، صحیفہ حریت کا سرنامہ، جرأت نسوانی کی تاریخ کا ورق زریں خاک پر پڑا ہوا ہے!!! (گُرد آفرید کا سر زانو پر رکھ کر) آفرید ــــ پیاری آفرید ــــ آنکھیں کھولو ــــ میں تمھیں بے وفائی کا الزام دینے کے لیے نہیں اپنی وفاداری کا یقین دلانے آیا ہوں۔ تمھارا تبسم ناز میری پرستش کا صلہ ہے۔ کیا ناکام محبت کو اپنے لب نازک سے تسکین نہ دوگی؟ ــــ کیا اپنی مسکراہٹ سے میرے دل کی تاریکیوں میں امید کی صبح پیدا نہ کروگی؟

گُردآفرید: (آنکھیں بند کیے ہوئے نیم بیہوشی کے عالم میں) کس کی آواز! ــــ ستاروں

کا گایا ہوا نغمہ آسمانی ـــــ زمین پر ـــــ کون گا رہا ہے؟

سہراب : تمھارا شیدائی، تمھارا پرستار سہراب۔

گُردآفرید :(آنکھیں کھول کر) تم ـــــ تم ـــــ اوہ ـــــ مرنا بھی مشکل ہو گیا ـــــ (جوش محبت سے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے اور گر پڑتی ہے) آؤ ـــــ پیارے سہراب، آؤ ـــــ تمھیں دیکھ کر دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہو گئی۔ لیکن اب تمنا کا وقت نہیں رہا۔ عدم کے مسافر کا سامان بندھ چکا ہے ـــــ زندگی کے نظارے اسے ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہے ہیں ـــــ میرے دل کے مالک ـــــ میرے فرض نے مجھے بے مروت بننے کے لیے مجبور کر دیا تھا ـــــ حق وطن کا مرتبہ عشق سے بلند تر ہے ـــــ اس لیے مجھے معاف کرو ـــــ اور جو ہوا ـــــ اُسے بھول جاؤ ـــــ موت کے دروازے پر دنیا کی دوستی و دشمنی ختم ہوجاتی ہے۔

سہراب : پیاری آفرید، تم نے دنیائے فرض کی ایک جدید حقیقت اور عورت کے دل کی عظمت کا ایک عظیم الشان راز ظاہر کرکے وہ بوجھ دور کر دیا جس سے میری روح پاش پاش ہوئی جا رہی تھی ـــــ میرا خیال تھا کہ تم مجھے اپنی محبت کا مستحق نہیں سمجھتیں، اس لیے اس قدر جوش مخالفت کے ساتھ جنگ کر رہی ہو۔

گُردآفرید : آہ تمھیں کیا معلوم کہ عشق و فرض کی کشمکش میں میری روح نے کتنے عذاب برداشت کیے ہیں ـــــ کتنے طوفان، کتنے زلزلوں سے تنہا وقف پیکار رہی ہے۔ صدمہ نہ کرو ـــــ دوست اور دشمن ہم نام ہیں۔ اس لیے ہمیں دھوکا ہوا ـــــ میں نے اپنے پیارے سہراب سے نہیں، اپنے ملک کے مخالف سے جنگ کی ہے۔

سہراب : آہ۔ ان لفظوں میں کتنا ترنم اور کتنی امید نوازی ہے ـــــ قسمت کی ستم ظریفی دیکھو۔ تسکین کے پیاسے کو راحت کا آب حیات بھی پلا رہی ہے اور جدائی کا زہر بھی۔

(یکایک جوشِ غضب میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

(سپاہیوں سے) کیا میری زبان کے واضح الفاظ معنی و مفہوم سے تہی دست تھے ـــــ میرے حکم سے بے پروا ہو کر دنیا کی یہ سب سے زیادہ قیمتی زندگی کس نے برباد کی؟

بہرام : (فخریہ لہجے میں) میں نے ـــــ

سہراب : تونے! ـــــ ایک ایرانی نے!! ـــــ گُرد آفرید کے ہم قوم و ہم وطن نے!!! کس لیے؟

بہرام : اس لیے کہ یہ میرا خیر خواہانہ فرض تھا۔ اس لیے کہ وہ تورانیوں کی دشمن تھی اور میں توران کا دوست ہوں۔

سہراب : تو کتنا بے حیا، کتنا بداصل، کتنا قابلِ نفرت ہے ـــــ مرقعِ شجاعت کی جس تصویرِ فدائیت نے ملک و قوم کی آبرو پر اپنی محبت، راحت، اُمید، زندگی کی ہر بیش بہا شے قربان کر دی۔ اس کے سینے میں ـــــ اس سینے میں ـــــ جو عشقِ وطن سے معمور ہو رہا تھا، خنجر بھونکتے وقت تیرے دل نے تجھ پر لعنت نہ کی؟ تیرا ہاتھ قبضے تک پہنچنے سے پیشتر مفلوج نہ ہوگیا؟ ـــــ سگِ دنیا! تیرے جسم کے ہر ذرے نے جس ایران کے نمک سے پرورش پائی ہے، جب تو نے اس محسن ایران سے وفاداری نہ کی۔ تو تو توران کا کب دوست ہوسکتا ہے ـــــ جس منھ سے اپنے کو تورانیوں کا دوست کہتا ہے ـــــ میں اُس ذلیل منھ پر تھوکتا ہوں ـــــ تیرے رہنے کی جگہ ـــــ دنیا نہیں ـــــ دوزخ ہے ـــــ

(بہرام کے سینے میں خنجر بھونک دیتا ہے)

بہرام : دنیا کے لیے عاقبت خراب کی تھی۔ لیکن گناہ نے فریب دے کر عاقبت بھی تباہ کی اور دنیا بھی۔ (مرجاتا ہے)

گُردآفرید : فرشتے روشنی کی چادر میں لپٹے۔ پھول اور نغمے بکھیرتے ہوئے آہستہ آہستہ زمین پر اتر رہے ہیں ـــــ دنیا عالمِ نور سے بدل رہی ہے ـــــ مرکزِ اصلی کی

طرف مائل پرواز روح کے لیے ـــــ آسمان کا دروازہ کھل گیا ہے ـــــ کس نے پکارا؟ ـــــ زندگی کے دروازے پر کون دستک دے رہا ہے؟ ـــــ موت ـــــ تو ہے؟ میں نہیں سمجھتی تھی کہ تو اتنی خوبصورت ہوگی ـــــ الوداع پیارے وطن ـــــ الوداع پیارے سہراب۔ الوداع۔

نہیں معلوم راز مرگ دنیا کے طبیبوں کو
اگر فرصت ملے تو یاد کرنا بدنصیبوں کو

(آخری ہچکی لے کر دنیا سے رخصت ہوجاتی ہے)

سہراب : ٹھہر ـــــ اے حسین مسافر ٹھہر ـــــ تو کارگاہ تمنا کو خرابۂ یاس۔ ایوان نشاط کو ماتم سرا، جلوہ زار ہستی کو مسکنِ ظلمت بنا کر کہاں جا رہی ہے؟ واپس آ ـــــ اے نامعلوم منزل کی رہرو، واپس آ۔ تیرے جانے کے بعد دنیا میں حرف فریاد اور آنسوؤں کی آبادی رہ جائے گی۔ آفتاب و مہتاب، آسمان کے دل کے داغ، تارے رات کے جگر کے آبلے اور رنگین پھول زمین کے جسم کے زخم معلوم ہوں گے۔ (دیوانہ وار پکارتا ہے) آفرید ـــــ آفرید ـــــ آفرید ـــــ اے جمال ناطق۔ اے حسن گویا۔ تو کیوں خاموش ہو گیا۔ تو کیوں بے کسی کی پکار کا جواب نہیں دیتا۔ کیا میرے لیے اب تیرے پاس محبت کی ایک مسکراہٹ، تسکین کا ایک حرف بھی نہیں ہے؟ ـــــ ہائے کون جواب دے؟ پھول ہے، خوشبو نہیں۔ مکان ہے، مکیں نہیں۔ سلطنت ہے ملکہ نہیں ـــــ (گرد آفرید کی لاش سے مخاطب ہوکر) قدرت نے کائنات سے اپنا عطیۂ عظمت واپس لے لیا۔ دنیا کا حُسن بہشت کے اضافۂ جمال کے لیے بلا لیا گیا۔ زمین کے چہرۂ فخر کا جلال، تاریکی عدم کو مطلع نور بنانے کے لیے چلا گیا ـــــ اے ملکۂ جمال تو نے فرض پر عشق کو اور ملک پر زندگی کو قربان کرکے حیاتِ ابدی حاصل کر لی۔ ایران کی آئندہ نسلیں تیرے ثبات و استقلال کے حیرت آفریں کارناموں پر فخر کریں گی ـــــ ایران کی لڑکیاں تیری بہادری کے گیتوں سے اپنی زندگیوں کو مبارک بنائیں گی ـــــ ایران کی تاریخ

ایثار کے حرف تیرے پُر جبروت نام کی تجلی سے صفحۂ دنیا پر آفتاب ماہتاب بن کر چمکتے رہیں گے ـــــ اے پژمردہ بہارِ آفرینش، اے افسردہ شعلۂ وطن پرستی، اے خوابیدہ طوفانِ شجاعت، میں تیرے قدموں کو الوداعی بوسہ دیتا ہوں ـــــ یہی اولین ـــــ اور یہی آخری بوسہ محبت ہے۔

(روتا ہوا گُرد آفرید کے پیروں پر گر پڑتا ہے)[1]

(پردہ)

[1] "عشق و فرض" کے نام سے کھیلا گیا ڈراما یہاں ختم ہوجاتا ہے۔ (مرتبین)

تیسرا ایکٹ - پہلا سین

سہراب کے لشکر کی چھاونی

(ہومان، بارمان، تورانی سردار اور سپاہی اپنی کامیابیوں کا جشن منا رہے ہیں)

ہومان : بادل کے محل میں سنہری پشواز پہن کر بجلی ناچ رہی ہے۔

بارمان : کل تلوار کی تان پر موت کا ناچ بھی شروع ہوجائے گا۔

سردار ۱: صرف ناچ؟

ہومان : گانا بھی۔

سردار ۲: کون گائے گا؟

ہومان : زندگی۔

سردار ۲: کیا گائے گی؟

ہومان : فنا کا گیت۔

سردار ۱: زندگی تو غم اور خوشی کے سروں سے بنا ہوا خود ایک دلچسپ گیت ہے۔

سردار ۲: ٹھیک کہا۔ اور یہ گیت مزا اس وقت دیتا ہے جب اسے شراب کا پیالہ ہاتھ میں لے کر گایا جائے۔

سردار ۳: (پیالہ بڑھا کر) لیجیے۔ ہونٹوں کی مضراب سے روح کے ستار میں زندگی کی راگنی بجائیے۔

سردار ۱: اہا ہا۔

شراب ناب کے جلووں سے ساغر میں اُجالا ہے
ہزاروں چودھویں کے چاند ہیں اور ایک ہالا ہے

سردار ۲ :۔

یہ وہ شے ہے گرے تو خاک سے اکسیر پیدا ہو
ہر اک قطرہ سے اک اک حُسن کی تصویر پیدا ہو

تیسرا ایکٹ - دوسرا سین

کیکاؤس کا دربار

(کیکاؤس تخت پر بیٹھا ہے۔ غصے سے چہرہ خوفناک اور آنکھیں لال ہو رہی ہیں)

کیکاؤس : جس کیکاؤس کے ابرو پر شکن دیکھ کر دنیا گنہگار غلام کی طرح کانپ کر سجدے میں گر جاتی ہے۔ جس کے قہر کے حضور میں طوفان سے زیادہ طاقت ور اور زلزلے سے زیادہ خوفناک انسان دو زانو ہو کر رحم کی بھیک طلب کرتے ہیں۔ اس کے غضب سے یہ بے پراوئی!۔ اُس کے حکم سے یہ سرتابی!!۔ کوئی وہ فرماں بردار نہیں فرماں روا ہے۔ ایران کا خادم نہیں ایران کا آقا ہے —— رستم۔ مغرور رستم، تیری روح میں بغاوت کا مرض پیدا ہوگیا ہے۔ میرا شاہی مرتبہ یہ جرأت اور گستاخی کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔

گودرز : جہاں پناہ۔ خانہ زاد کی جاں بخشی ہو۔ آپ غصے میں غلط رائے قائم کر رہے ہیں —— رستم سے اس وقت تک کوئی ایسا قصور سرزد نہیں ہوا کہ اس کی بے داغ جاں نثاری پر شبہ کیا جائے۔ دنیا میں دو چیزیں ہمیشہ اپنی روشنی سے چمکتی رہیں گی۔ آسمان پر آفتاب اور زمین پر رستم کی وفاداری۔

کیکاؤس : دھوکا نہ کھاؤ۔ تم اوپر کا ملمع دیکھ کر پیتل کو سونا سمجھ رہے ہو۔

گودرز : غلام کی یہ گذارش ہے کہ تورانی لشکر ہمارے قلعوں، شہروں، صوبوں کو فتح کرتا اور حریف طاقتوں کو روندتا ہوا شاہی پایۂ تخت کے سامنے پہنچ کر بھوکے شیروں کے جھنڈ کی طرح گرج رہا ہے۔ سہراب جیسے خوفناک دشمن کے

مقابلے میں اس وقت ایران کو رستم کے مشورے، مدد اور تلوار کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے اسے ناراض کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر وہ آنے کے بعد رنج و غصہ سے واپس چلا گیا تو ایران اپنے سب سے بڑے خیرخواہ اور سب سے بڑے سپاہی کی خدمت سے محروم ہوجائے گا۔

طوس : جلالت مآب۔ رستم کا نعرۂ جنگ سنتے ہی مردہ ہمتیں زندہ ہوجاتی ہیں۔ ؎

ڈر نہیں کچھ بھی اگر ہو سارا عالم اک طرف
لاکھ لشکر اک طرف ہوں اور رستم اک طرف
سلطنت کی آبرو ہے، ملک کا اقبال ہے
وہ ہمارے بازوؤں کا زور سر کی ڈھال ہے

کیکاؤس : جنگ میں شرکت ہی کے لیے میں نے خط لکھ کر اسے طلب کیا تھا۔ لیکن اس کا زابل سے ایران نہ آنا، کیا ثابت کر رہا ہے؟ ـــــــ یہی کہ تمھاری خوشامد اور تعریفوں نے اسے مغرور بنا دیا ہے۔ وہ تم سب کی ہستیوں کو، میری مہربانیوں کو اور اپنی حقیقت کو فراموش کرچکا ہے۔ ؎

سمجھتا ہے کہ بجھ سکتا نہیں ہرگز چراغ اس کا
اسی سے بڑھتا جاتا ہے غرور اس کا دماغ اس کا

(رستم کا داخلہ)

رستم : ؎

اے تاج بخش، باج ستاں، شاہ کامگار
اے ملک گیر، قلعہ شکن، شیر کارزار
تو حسن کائنات ہے، تو فخر روزگار
قسمت ہو زیر حکم، ظفر زیرِ اختیار
جب تک فلک پہ جلوۂ شمس و قمر رہے
اس تاج کی ضیا سے جہاں میں سحر رہے

(کیکاؤس غصے سے دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے)

کیکاؤس : (اپنے آپ میں) جھوٹا ـــــ ریا کار۔

رستم : خاقان عالم، غلام حاضر ہے۔ ؎

جب تک خدا کے نور سے روشن ہیں صبح و شام
برتر ہو آسمان سے اس تخت کا مقام
ایران کی اطاعت و خدمت کے واسطے
حاضر ہے دست بستہ شہنشاہ کا غلام

کیکاؤس : تو صرف ہونٹوں سے اپنے کو غلام کہہ کر میرے غصے اور میرے اختیار کا منہ چڑھاتا ہے۔ طلبی کا خط ملنے کے بعد بھی فوراً حاضر ہونے کے بدلے میرے حکم سے بے پروائی برتتا، کیا یہی فرض شناس غلاموں کا طریقہ ہے؟ یہ غلامی نہیں نمک حرامی ہے۔

رستم : رستم اور نمک حرام!۔ خداوند نعمت، میرے کانوں نے آج تک ایسے ذلیل لفظ نہیں سنے۔ جو رستم ایران کی اطاعت کو اپنا فرض، ایران کی خدمت کو اپنا مذہب اور ایران کی محبت کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ اُسے نمک حرام کہہ کر آپ اپنی مردم شناسی اور قدر دانی کا ثبوت دے رہے ہیں؟ ؎

صلہ اچھا ملا مجھ کو مری خدمت گزاری کا
یہی انعام ہے کیا عمر بھر کی جاں نثاری کا

کیکاؤس : اب تک میری آنکھوں پر تیری بناوٹی وفاداریوں نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ آج وہ پردہ ہٹ گیا۔ اب میں تجھے تیری اصل شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ ؎

عیاں ہر حرف ہے مجھ پر ترے دل کے نوشتے کا
مجھے دھوکا نہ دے تو روپ بھر کر اک فرشتے کا

رستم : بس۔ جہاں پناہ۔ بس۔ کیا حضور نے سر بازار مجھے ذلیل کرنے کے لیے زابل سے ایران میں طلب کیا ہے؟ ادب اور برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ ؎

میں بھی اپنے سینے میں رکھتا ہوں دل انسان کا
دھیان رکھیے اپنے رتبے اور اپنی شان کا
کیا کہوں۔ دیتا ابھی پتھر سے پتھر کا جواب
شرم آتی ہے کہ کھایا ہے نمک ایران کا

کیکاؤس : تیری بے خوفی اور سرکشی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایران میں دو بادشاہ حکومت کر رہے ہیں۔ آج تیرے غرور کی تجھے سزا دے کر ثابت کروں گا کہ ایران کا بادشاہ رستم نہیں، کیکاؤس ہے۔

رستم : تب میں بھی یہ کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ کیکاؤس کی سلطنت اور کیکاؤس کا تاج رستم ہی کی تلوار اور بازو کی مدد سے ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اگر اس دل میں بادشاہ بننے کی خواہش ہوتی، تو آج ایران کا تاج کیکاؤس کے سر پر نہیں، رستم کے سر پر دکھائی دیتا۔ لیکن میرا کام بادشاہ بننا نہیں بادشاہ بنانا ہے۔ میں تاج پہنتا نہیں، تاج بخشتا ہوں۔ ؎

تکا کرتے ہیں میری مہربانی کی نگاہوں کو
میں وہ ہوں، بھیک میں دیتا ہوں تاج و تخت شاہوں کو

کیکاؤس : یہ سلطنت کا مجرم ہے — گرفتار کر لو — خاموش کھڑے ہو! — کیا میرا حکم نہیں سنا؟ — قید کرو۔

رستم : ناعاقبت اندیش کیکاؤس، اپنی عقل کی تاریکی سے کیانی تاج کی چمک کم نہ کرو۔ آج مجھے معلوم ہوگیا کہ جس تخت پر کیومرث، ہوشنگ، طہمورث، جمشید، فریدون، منوچہر، نوذر، کیقباد جیسے دانا و بینا بادشاہ بیٹھ کر دنیا میں ایران کا نام روشن کر چکے ہیں، تم اس مسند عزت، اس شاہی تخت پر ہرگز بیٹھنے کے لائق نہیں ہو۔ ؎

سلطنت ایران کی پائی، سمجھ پائی نہیں
ایک بچے کے برابر تم میں دانائی نہیں
راستہ کوئی دکھا سکتا نہیں بدبخت کو
لو چلا میں۔ اب بچاؤ، اپنے تاج و تخت کو

(رستم غصے میں چلا جاتا ہے)

گودرز : اعلیٰ حضرت۔ تباہی سہراب کی شکل میں دروازے پر موجود ہے۔ تہمتن کو واپس بلائیے۔

کیکاؤس : کبھی نہیں۔ رستم ایران سے چلا گیا، تو کیا ایران کی زمین غلہ نہ اگائے گی۔ ایران کا آسمان پانی کے بدلے زہر برسائے گا۔ ایران میں آفتاب و ماہتاب طلوع نہ ہوں گے۔ ایرانی تاج کے تابناک الماس، چمکتے ہوئے ہیرے کنکر، سنگ ریزے، پتھر بن جائیں گے۔ میں رستم کو کوئی چیز نہیں سمجھتا۔ رستم کی عزت ایران سے ہے۔ ایران کی عزت رستم سے نہیں ہے۔

طوس : ایک بار پھر غور کیجیے۔

کیکاؤس : ضرور نہیں۔

طوس : افسوس۔ آپ نے آدھی دنیا فتح کر لی۔ لیکن اپنے غصے کو فتح نہ کر سکے۔

کیکاؤس : بس ۔ خاموش۔

(غصے میں خنجر لے کر تخت سے اتر آتا ہے۔ طوس سر جھکا دیتا ہے۔ گودرز کیکاؤس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ درباری حیرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - تیسرا سین

چھاونی

(رات کا وقت۔ دور ایرانی اور تورانی لشکروں کے خیمے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہومان، بارمان اور ہجیر کے ساتھ سہراب کا داخلہ)

سہراب : ہجیر۔ تم میری قید سے رہائی چاہتے ہو؟

ہجیر : چاہتا ہوں۔ لیکن ایک شرط سے۔ ایران میرا وطن ہے، میں آپ کا شریک ہو کر ایران کے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔

سہراب : قوم کی جاں نثار گرد آفرید کی طرح جس ایرانی کے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے، میں خود اسے دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھتا ہوں —— اچھا تو میں تمھیں رہائی دوں گا۔ عزت، دولت، عہدہ اور جاگیر بخشوں گا —— اور آج سے اپنا عزیز ترین بھائی سمجھوں گا۔ صرف اتنا بتادو..... (ہجیر کو سوچ میں ڈوبے دیکھ کر) سنتے ہو؟

ہجیر : (چونک کر) سن رہا ہوں۔

سہراب : کیا واقعی رستم اس لشکر میں نہیں ہے؟

ہجیر : میں نے ایرانی لشکر کا ایک ایک کونہ، ایک ایک خیمہ، ایک ایک سردار کا چہرہ آپ کو دکھا دیا اور ان سرداروں کے نام، رتبے اور عہدے سے بھی واقف کر دیا۔ تعجب ہے کہ پھر بھی آپ میری سچائی پر شک کر رہے ہیں۔

سہراب : بے شک میں نے بھیس بدل کر رات کی تاریکی میں تمھارے ساتھ ایرانی فوج کا پوری طرح جائزہ لیا۔ لیکن میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ ضرور

موجود ہے۔ ہجیر۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ رستم کو پہچاننے میں تمھاری آنکھوں نے غلطی کی ہو؟

ہجیر : میں رستم کو ایک بار نہیں سینکڑوں بار دیکھ چکا ہوں ـــــ میری نظر ابھی اتنی کمزور نہیں ہے کہ دیکھی ہوئی صورت کو بھی نہ پہچان سکوں۔

سہراب : تو پھر تسلیم کرلوں کہ وہ زابل سے ایران کی مدد کے لیے نہیں آیا؟

ہومان : مجھے جاسوس سے اطلاع ملی ہے کہ رستم اس جنگ میں کیکاؤس کی مدد کے لیے آیا تھا۔ لیکن کیکاؤس نے سر دربار اس کی بے عزتی کی اور وہ بے انتہا ناراضی اور غصے کے ساتھ اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

سہراب : ایک طرف اِن کی آواز اور ایک طرف دل کی آواز۔ کس آواز کو سچائی کی آواز سمجھوں!!

ہجیر : (اپنے آپ سے) اگر سہراب نے رستم کی جان کو نقصان پہنچایا تو میرے ایران کی کون حفاظت کرے گا؟ ـــــ نہیں۔ سچائی کو اندھیرے سے روشنی میں نہ آنے دوں گا۔

سہراب : دیکھ ہجیر۔ جس طرح رات کے وقت شکار کی تاک میں بیٹھے ہوئے بھیڑیے کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں۔ اسی طرح مجھے تیری نگاہوں میں بھی ایک عجیب و خوفناک چمک دکھائی دیتی ہے۔ "رستم نہیں ہے" یہ کہتے وقت ہوا سے ہلتے ہوئے تنکے کی طرح تیرے ہونٹ کانپ اٹھتے ہیں اور پیلے پتے کی طرح تیرا چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔ (گریبان پکڑ کر) خبردار مجھے دھوکا نہ دینا۔ ورنہ قسم ہے تلوار کی کہ تیرے خون کو موری میں بہتے ہوئے پانی سے بھی زیادہ حقیر سمجھوں گا۔ آگے بڑھ ـــــ اب دنیا میں تیرے لیے دو ہی چیزیں رہ گئی ہیں، سچا ثابت ہوگیا تو رہائی ـــ اور جھوٹا ثابت ہوا تو موت۔

(ہجیر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے جاتا ہے)

بارمان : جب سہراب رستم کے خیمے کے پاس پہنچ کر نہایت غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا، اس وقت مجھے اندیشہ ہوا کہ ضرور خون کا جوش خون کو پہچان

لے گا۔ لیکن شاباش ہے ہجیر کو۔ کہ اُس کے ایک جھوٹ نے باپ بیٹے کے بیچ میں سینکڑوں پردے حائل کر دیے۔

ہومان : لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کیکاؤس کے دربار سے خفا ہو کر چلے آنے کے بعد، رستم دوبارہ کیکاؤس کی اعانت کے لیے کس طرح رضامند ہو گیا

بارمان : کیکاؤس نہایت غصہ ور اور جلد باز بادشاہ ہے۔ جوش کم ہونے کے بعد اسے اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ آخر اس کے اظہار ندامت اور طوس و گودرز کے سمجھانے سے رستم اپنا ارادہ بدل دینے کے لیے مجبور ہو گیا۔

ہومان : اپنے بادشاہ افراسیاب کی آرزو پوری کرنے کے لیے کوشش کرو کہ اس جنگ کے آخر تک باپ بیٹے ایک دوسرے کو نہ پہچان سکیں۔ توران کی سلامتی کے لیے رستم اور سہراب دونوں کو ـــــ اور دونوں نہیں تو ایک کو مرنا ہی چاہیے۔ ورنہ یہ مل کر ساری دنیا کو ایران اور کیکاؤس کا غلام بنا دیں گے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - چوتھا سین

میدان جنگ

(اندر سے لڑائی کے باجے اور مارو مارو کا شور سنائی دیتا ہے۔
ایران کے کچھ سپاہی پناہ پناہ کہتے ہوئے بھاگتے نظر آتے ہیں۔
گودرز اور طوس کے ساتھ رستم داخل ہوتا ہے)

رستم : شاباش، سہراب، شاباش۔ آفریں ہے تیری بہادری کو۔ آفریں ہے تیری ماں کے دودھ کو۔ (طوس و گودرز سے) میدان جنگ میرا وطن اور تلواروں کی چھاؤں میری آرام گاہ ہے۔ میری ساری زندگی خنجروں کی چمک اور خون کی بارش میں بسر ہوئی ہے لیکن میں نے آج تک معرکہ کارزار میں اتنی بے جگری اور اتنی شاندار بے پروائی کے ساتھ کسی انسان کو موت سے کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی حیرت ناک دلیری اور طریق جنگ دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک دوسرا رستم پیدا ہو گیا۔

گودرز : لیکن جس طرح آگ پر پارہ اڑ جاتا ہے۔ اسی طرح مقابلے کے وقت آپ کا نام سنتے ہی، اس کی طاقت بھی اس کے بازوؤں سے علحدہ ہو جائے گی۔

رستم : میں نے صرف ایران کی محبت و فرض سے مجبور ہو کر انصاف، دیانت اور اپنے اصول و شان کی خلاف ایک سولہ برس کے ناتجربہ کار لڑکے کے مقابلے میں میان سے تلوار کھینچی ہے۔ لیکن میں اس کے سامنے اپنا رتبہ اور نام ظاہر نہیں کروں گا۔ کیونکہ ایک کم سن بچے سے لڑنا رستم کی آبرو نہیں، رستم

کے نام کی بے عزتی ہے۔

(اندر پھر شور ہوتا ہے)

طوس : وہ دیکھیے۔ وہ دیکھیے۔ پھر ہمارا لشکر سیلاب کی طرح آگے بڑھنے کے بدلے کنارے سے ٹکرا کر واپس لوٹتی ہوئی لہر کی طرح سمٹ کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔

رستم : زندگی کی اتنی محبت!۔ موت کا اتنا خوف!!۔ کیا یہ میدان جنگ میں تلوار و شجاعت کو ذلیل کرنے آئے تھے!!! ــــ جاؤ ــــ جاؤ ــــ ان سے کہو کہ مایوس نہ ہوں۔ رستم زندہ ہے۔ اور ایران کا اقبال بھی زندہ رہے گا۔ (گودرز اور طوس جاتے ہیں۔ اندر دوبارہ شور ہوتا ہے) اِن بزدلوں کی روح میں غیرت کی روشنی بجھ گئی ہے۔ اس لیے انھیں فرض کا راستہ دکھائی نہیں دیتا ــــــ یہ کون ہے؟ سہراب؟ ہاں وہی ہے۔ کتنا بہادر! کتنا خوبصورت!!۔ دیکھنے سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ میرا فرزند ہوتا، تو آسمان کی طرح آج زمین پر بھی، دو آفتاب و ماہتاب دکھائی دیتے ــــــ آہ۔ وہ موت کی تلاش میں اسی طرف آ رہا ہے۔ واپس جا سہراب۔ اگر تیرے باپ ماں زندہ ہیں تو ان کے بڑھاپے اور ارمانوں پر رحم کر۔ اور واپس جا۔ نادان۔ تو ایران میں رستم سے نہیں، اپنی قسمت سے جنگ کرنے آیا ہے۔

(سہراب کا داخلہ)

سہراب : چہرہ آگ اور دل برف۔ خوف کی آندھی میں، ریت کے ذروں کی طرح اڑتے پھر رہے ہیں۔ شاید ان بزدلوں کے عقیدے میں بھاگنے ہی کا نام بہادری ہے۔ کیکاؤس۔ تیری قسمت کے روشن دن کی شام آگئی۔ کل میرے قدم تیرے تخت پر اور تیرا تاج میرے قدموں میں ہوگا۔

(آگے بڑھتا ہے۔ رستم روکتا ہے)

رستم : ٹھہر۔ اس جنگ میں خود فتح تیرے خنجر کی دھار، اور نصیب تیرے بازوؤں کا

زور بن جائے۔ تو بھی تو کیکاؤس تک زندہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اس کا تاج، تیری امید سے اور اس کا تخت تیری ہمت سے بہت زیادہ بلند ہے۔

سہراب : یہ چہرہ! یہ جلال!! ــــ اے ایرانی بزرگ تو کون ہے؟

رستم : ایران کا نمک خوار۔ شہنشاہ کیکاؤس کا جاں نثار۔

سہراب : (اپنے آپ سے) میری ماں نے اپنے لفظوں سے میرے دل پر جو رستم کی تصویر کھینچ دی ہے اس ذہنی تصویر سے یہ پُر عظمت چہرہ کس قدر مشابہ ہے۔

رستم : میں دنیا کی کوئی عجیب چیز نہیں ہوں۔ تو میرے چہرے کی طرف غور سے کیا دیکھ رہا ہے؟

سہراب : (اپنے آپ سے) ـ

وہی شوکت عیاں ہے، اس کے تیور اور قرینے سے
اڑے جاتے ہیں نقشِ دشمنی دل کے نگینے سے
نہ جانے کون کہتا ہے کہ بڑھ- قدموں پہ سر رکھ دے
یہی ہے باپ تیرا۔ جا، لپٹ جا - اس کے سینے سے

رستم : وہی خاموشی ــــ وہی حیرت ــــ کیا تو کوئی خواب دیکھ رہا ہے؟ ـ

آنکھیں کیوں پتھرا گئیں، بڑھتے قدم کیوں جم گئے
کیا ہوا جو یک بیک آندھی کے جھونکے تھم گئے
ناز مت کر۔ ہاتھ بے قیمت لہو میں رنگ کر
عورتوں سے لڑ چکا۔ آ۔ مرد سے اب جنگ کر

سہراب : جنگ دشمن سے ہوتی ہے۔ عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ یہ جنگ خوں ریزی سے شروع ہوکر اشک باری پر ختم نہ ہو۔ اس لیے حملے سے پیشتر، اے محترم انسان میں تیرے نام اور رتبے سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ ـ

جس کو دیکھا تھا کبھی آئینۂ تقریر میں
دیکھتا ہوں ۔ میں وہی جلوہ تری تصویر میں

رستم : تو عجب طرح کی گفتگو کر رہا ہے۔ کیا موت کے خوف سے دیوانہ ہوگیا ہے؟ ـ

پوچھتا نام و نشاں، اس جنگ کے انجام سے
لڑنے آیا ہے یہاں مجھ سے، کہ میرے نام سے؟

سہراب : میں نام اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ یہ چہرہ دیکھ کر میرے دل میں دشمنی کی جگہ تیری عزت پیدا ہو گئی ہے۔

جس کی تلوار سے، توران کے لب پر دم ہے
کیوں چھپایا ہے، یقیناً تو وہی رستم ہے

رستم : رستم شیروں سے، اژدہوں سے، بہادری کے طوفان سے لڑتا ہے۔ اپنی عمر، رتبے اور شہرت کی توہین کرنے کے لیے جنگ کے میدان کو ماں کی گود سمجھنے والے ناسمجھ لڑکوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔

سرد ہو جاتے ابھی، یہ جوش کیا، اور شور کیا
سامنے رستم کے تو کیا اور تیرا زور کیا
کانپ اٹھتا۔ دیکھتے ہی موت کی تصویر کو
جنگ میں رستم نہ آیا، دے دعا تقدیر کو

سہراب : بہادر بوڑھے، میرا دل نہیں چاہتا، کہ تجھ پر حملہ کروں ـــ میں منت کرتا ہوں کہ مجھے غفلت کے اندھیرے میں نہ رکھ ـــ اگر واقعی تو رستم ہے، تو میں تلوار پھینک کر، ہاتھ جوڑ کر، دو زانو بیٹھ کر تیرے قدموں کو بوسہ دوں گا، اور عزت و ادب کے ساتھ سر جھکا کر تیری بزرگی کو سلام کروں گا۔

اور کہوں گا کہ خوش اقبال بنا دے مجھ کو
ہاتھ رکھ سر پہ مرے اور دعا دے مجھ کو

رستم : دنیا پر یہ ثابت کرنے کے لیے سہراب نے رستم جیسے یکتائے زمانہ دلیر سے جنگ کی تھی، تو دھوکا دے کر مجھ سے رستم ہونے کا اقرار کرانا چاہتا ہے۔

کیوں نہیں کہتا کہ مجھ میں جنگ کا اب دم نہیں

ہوش میں آ، کان کھول اور سن کہ میں رستم نہیں

سہراب : اگر تو رستم نہیں ہے۔ تو آنکھیں بند ہونے سے پہلے، دنیا کو آخری مرتبہ حسرت کی نظروں سے دیکھ لے۔

(دونوں پہلے گرز سے، پھر گرز پھینک کر تلواروں سے اور تلواریں ٹوٹ جانے کے بعد ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آپس میں جنگ کرتے ہیں۔ آخر میں سہراب رستم کو زمین پر گرا دیتا ہے اور چھاتی پر چڑھ کر قتل کے ارادے سے خنجر نکالتا ہے۔ رستم سہراب کی کلائی پکڑ لیتا ہے)

رستم : ٹھہر ـــــــ ایران کے بہادروں کا دستور ہے کہ دشمن کو دو مرتبہ شکست دینے کے بعد قتل کرتے ہیں۔ اگر تجھے اپنے بازوؤں کی طاقت پر بھروسا اور تیرے دل میں بہادروں کے دستور کی عزت ہے تو مجھے کل نصیب آزمائی کا ایک اور موقع دے۔ کل کا فیصلہ قسمت کا آخری فیصلہ ہوگا۔

سہراب : کیا اتنی مختصر مدت میں فتح و شکست کا اصول، ہرن اور شیر کی فطرت کا قانون بدل جائے گا؟ اگر تجھے یقین ہے کہ رات بھر کی خوشامد سے صبح کو قسمت تیری مدد کے لیے آمادہ ہو جائے گی۔ تو اچھا۔ حفاظتِ زندگی کی اس آخری کوشش کے لیے تجھے کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔ (سینے سے اٹھ کر) مرد کا زیور بہادری اور بہادری کا زیور رحم ہے۔

(خنجر پھینک دیتا ہے)

—

تیسرا ایکٹ - پانچواں سین

ہومان، بارمان کا خیمہ

ہومان : جس طرح فاتح ظلمت، آفتاب کی نو طلوع کرنیں شب کی حدود حکومت میں داخل ہوکر تاریکی کو منتشر و مغلوب کرکے رفتہ رفتہ فضا کی سلطنت پر قبضہ کرلیتی ہیں۔ اسی طرح ہزیمت خوردہ ایران بھی سہراب کی عسکری طاقت کا اقتدار اور اس کے تہوّر و بسالت کی جہانگیری تسلیم کرچکا تھا۔ لیکن اس کی طفلانہ حرکت نے حال کی فتوحات اور مستقبل کے توقعات، حاصل شدہ اور غیر حاصل شدہ ہر شے اور ہر اُمید کو رائگاں کر دیا۔

بارمان : وہ اس حقیقت سے لاعلم ہے کہ ناپختہ عقل کی خامی سے انسان زندگی کی جس غلطی کو سطحی اور ناقابلِ التفات سمجھتا ہے۔ وہی حقیر غلطی ایک روز ہیبت ناک تباہیوں کا سنگ بنیاد اور عظیم الشان غم انگیز نتائج کی آفرید گار ثابت ہوتی ہے۔

ہومان : جس کا جوش جوان اور تجربہ بچہ ہے ـــ جس کا بازو طاقت ور اور عقل کمزور ہے۔ وہ دنیا کو فتح کرسکتا ہے، دنیا پر حکومت نہیں کرسکتا۔

بارمان : قبضے میں آئے ہوئے شیر کو دوبارہ حملہ کرنے کے لیے آزاد کر دینا، یہ سہراب کی ایسی خوفناک غلطی ہے، کہ اس غلطی پر عقل باختہ دیوانے بھی افسوس کرتے ہوں گے۔

ہومان : اور اس احمقانہ غلطی کو وہ بہادرانہ رحم کہتا ہے۔

بارمان : جنگ کیا ہے؟ قتل، خون، موت کی نمائش ـــــ اس لیے جنگ خود ایک بے رحمی ہے ـــ بے رحمی کی سلطنت میں رحم کے قانون پر عمل نہیں ہوتا۔

ہومان : یہ اُس کی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ جو فتح، طاقت اور تلوار سے حاصل نہ ہو سکی وہ رستم نے عقل کے زور اور فریب کے حربے سے حاصل کرلی۔

بارمان : تو اب کیا کرنا چاہیے؟ ہمارے بادشاہ افراسیاب کی آرزو اور ہماری کوشش برباد ہوا چاہتی ہے۔

ہومان : چلو سہراب کو اس غلطی پر شرمندہ کریں۔ اس کی روح میں ایک نئی روح پھونکیں۔ اس کے دل کی نیکی کو عداوت سے اور رحم کے جذبے سے بدل دیں۔ اگر ہمارے جھنجھوڑنے سے سہراب کی سوئی ہوئی سمجھ جاگ اٹھی تو کل کا دن رستم کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

(دونوں جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ - چھٹا سین

میدان جنگ

(رستم اداس چہرے اور غمگین دل کے ساتھ مایوس نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے)

رستم : پروردگار۔ میں نے کبھی تیرے قہر و غضب کو حقیر نہیں سمجھا۔ کبھی تیری طاقت کے سامنے اپنی فانی طاقت کا غرور نہیں کیا۔ پھر اس ذلت کی شکل میں تو نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ ـــــ اے درد مندوں کی دوا، اے کمزوروں کی قوت، اے ناامیدوں کی اُمید۔ میں نے کل ساری رات تیرے حضور میں سجدہ ہائے نیاز کے ساتھ آنسو بہا کر مدد کے لیے التجا کی ہے۔ اپنے عاجز بندے کی التجا قبول کر۔ اس بڑھاپے میں دنیا کے سامنے میری شرم رکھ اور ایک بار میری جوانی کا زور و جوش مجھے دوبارہ واپس دے دے۔

عطا کردے وہی طاقت جو اک دن تھی مرے بس میں
جوانی کا لہو پھر جوش مارے میری نس نس میں
تری قدرت پلٹ سکتی ہے سارے کارخانے کو
پھر اک دن کے لیے تو بھیج دے پچھلے زمانے کو

(سہراب کا داخلہ)

سہراب : صبح ہوگئی۔ ممکن ہے کہ آج کی صبح اس کی زندگی کی شام ثابت ہو۔ نہ جانے

کیا سبب ہے کہ اس کی موت کا خیال آتے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ (رستم کو دیکھ کر) تو آگیا۔ کیا جنگ کے نقارے کی پہلی ہی چوٹ سے تیری نیند ٹوٹ گئی؟

رستم : بہادر اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔ میں آدھی رات سے صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

سہراب : آج لڑائی کا دوسرا دن ہے۔ جانتا ہے اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا؟

رستم : ہم دونوں میں سے ایک کی موت۔

سہراب : شیر دل بوڑھے۔ میرا دل تیری موت دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ ایک غیبی آواز بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے۔ اگر ایران کی گود بہادر فرزندوں سے خالی نہیں ہے۔ تو جا۔ واپس جا۔ اور اپنے عوض میں کسی اور ایرانی دلیر کو بھیج دے۔ میں تجھے زندگی اور سلامتی کے ساتھ لوٹ جانے کی اجازت دیتا ہوں۔

رستم : کل کی اتفاقی فتح پر غرور نہ کرو۔ ہر نیا دن انسان کے لیے نئے انقلاب لے کر آتا ہے۔ تقدیر کا پہیہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا ہے۔ ؎

گھڑی بھر میں بدلنا ہوگا تجھ کو پیرہن اپنا
منگا کر پاس رکھ لے جنگ سے پہلے کفن اپنا

(جنگ شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سہراب ہاتھ روک لیتا ہے)

سہراب : ٹھہر۔ آج میں تجھ میں نیا جوش اور نئی قوت دیکھ رہا ہوں۔ جواں ہمت بوڑھے، مجھے پھر شک ہوتا ہے کہ تو رستم ہے۔ میں تیری عزت کا واسطہ اور تیری بہادری کی دہائی دے کر ایک بار پھر تیرا نام پوچھتا ہوں زور سے نہیں، منت سے۔ غرور سے نہیں، عاجزی سے۔

رستم : تو میرا نام ہی جاننا چاہتا ہے۔ تو سُن۔ میرا نام ہے......

سہراب : (خوشی کی گھبراہٹ سے) رستم؟

رستم : نہیں سہراب کی موت۔

سہراب : افسوس! تو نے میرے رحم کی قدر نہ کی۔

(پھر جنگ ہوتی ہے۔ رستم سہراب کو گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے)

رستم : ؎

بس اسی ہمت اسی طاقت پہ تھا اتنا غرور
تو کوئی شیشہ نہ تھا، کیوں ہو گیا پھر چور چور
کیا ہوا زور جوانی، اُٹھ، اجل ہے گھات میں
دیکھ لے اب کس قدر قوت ہے بوڑھے ہاتھ میں

(سہراب کے سینے میں خنجر بھونک دیتا ہے)

سہراب : آہ اے آنکھو، تمھارے نصیب میں باپ کا دیدار نہ تھا —— کہاں ہو، پیارے باپ کہاں ہو؟ آؤ۔ آؤ کہ مرنے سے پہلے تمھارا سہراب تمھیں ایک بار دیکھ لے۔ ؎

کیا خبر تھی کہ بگڑ جائے گی قسمت اپنی
آخری وقت دکھا دو مجھے صورت اپنی

رستم : کیا اپنی جوانی کی موت پر ماتم کرنے کے لیے اپنے باپ کو یاد کررہا ہے؟ —— اب تیرے باپ کی محبت، اس کی دعا، اس کے آنسو، اس کی فریاد، کوئی تجھے دنیا میں زندہ نہیں رکھ سکتی۔ ؎

مرہم کہاں جو رکھ دے دلِ پاش پاش پر
آیا بھی وہ تو روئے گا بیٹے کی لاش پر

سہراب : بھاگ جا۔ بھاگ جا۔ اس دنیا سے کسی دوسری دنیا میں بھاگ جا۔ تو نے سام و نریمان کے خاندان کا چراغ بجھا دیا ہے —— تاریک جنگلوں میں، پہاڑوں کے غاروں میں سمندر کی تہہ میں، تو کہیں بھی جا کر چھپے۔ لیکن میرے باپ رستم کے انتقام سے نہ بچ سکے گا۔

رستم : (چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے) کیا! کیا!! ــــ تو رستم کا بیٹا ہے؟

سہراب : ہاں۔

رستم : تیری ماں کا نام؟

سہراب : تہمینہ۔

رستم : تیرے اس دعوے کا ثبوت؟

سہراب : اس بازو پر بندھی ہوئی میرے باپ رستم کی نشانی۔

رستم : جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔ تو دھوکا دے رہا ہے۔ مجھے پاگل بنا کر اپنے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ (گھبراہٹ کے ساتھ سہراب کے بازو کا کپڑا پھاڑ کر اپنا دیا ہوا مہرہ دیکھتا ہے) وہی مہرہ۔ وہی نشانی (سر پیٹ کر) کیا کیا!۔ کیا کیا!! اندھے، پاگل، جلاد، یہ کیا کیا!!! ــــ شیر جیسا خوں خوار، بھیڑیے جیسا ظالم، ریچھ جیسا موذی حیوان بھی اپنی اولاد کی جان نہیں لیتا۔ لیکن تو انسان ہو کر حیوان سے بھی زیادہ خونی اور جہنم سے بھی زیادہ بے رحم بن گیا۔ ؎

خون میں ڈوبا ہے وہ جس سے مزہ جینے میں تھا
دل کے بدلے، کیا کوئی پتھر ترے سینے میں تھا
توڑ ڈالا اپنے ہی ہاتھوں سے، او ظالم اُسے
تیرا نقشہ، تیرا ہی چہرہ جس آئینے میں تھا

سہراب : فتح مند بوڑھے، تو رستم نہیں ہے۔ پھر میری موت پر خوش ہونے کے بدلے اس طرح کیوں رنج کر رہا ہے؟

رستم : (رو کر) اس دنیا میں رنج اور آنسو، رونے اور چھاتی پیٹنے کے سوا اب اور کیا، باقی رہ گیا!! میں نے تیری زندگی تباہ کرکے اپنی زندگی کا ہر ایک عیش اور اپنی دنیا کی ہر ایک خوشی تباہ کر دی۔ مجھ سے نفرت کر، میرے منھ پر تھوک، مجھ پر ہزاروں زبانوں سے لعنت بھیج۔ ؎

فغاں ہوں، حسرت و ماتم ہوں، سر سے پاؤں تک غم ہوں
میں ہی بیٹے کا قاتل ہوں، میں ہی بدبخت رستم ہوں

(سہراب کے پاس ہی زمین پر گرتا ہے۔ سہراب اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چھاتی سے لپٹ جاتا ہے)

سہراب : باپ۔ پیارے باپ۔

رستم : ہائے تونے الفت سے، نرمی سے، منت سے، کتنی مرتبہ میرا نام پوچھا — اس محبت و عاجزی کے ساتھ پوچھنے پر لوہے کے ٹکڑے میں بھی زبان پیدا ہو جاتی پتھر بھی جواب دینے کے لیے مجبور ہوجاتا۔ لیکن اس دو روزہ دنیا کی جھوٹی شہرت اور اس فانی زندگی کے آنی غرور نے میرے ہونٹوں کو ہلنے کی اجازت نہ دی — میرے بچے، میری تہمینہ کی نشانی۔ ۔

کس جگہ بے رحم اجل سے میں نہاں رکھوں تجھے
آنکھ میں، دل میں، کلیجے میں، کہاں رکھوں تجھے
بس نہیں انسان کا چلتا، فنا و فوت سے
کیا کروں۔ کس طرح تجھ کو چھین لوں میں موت سے

سہراب : ہومان۔ بارمان۔ ہجیر، سب نے مجھے دھوکا دیا — باپ نہ رو۔ میری موت کو خدا کی مرضی سمجھ کر صبر کرو۔ ۔

مل گئی مجھ کو جو قسمت میں سزا لکھی تھی
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کی قضا لکھی تھی

رستم : جب تیری ناشاد ماں، بال نوچتی، آنسو بہاتی، چھاتی پیٹتی، ماتم اور فریاد کی تصویر بنی ہوئی سامنے آکر کھڑی ہوگی۔ اور پوچھے گی کہ میرا لاڈلا سہراب، میرا بہادر بچہ، میری کوکھ سے پیدا ہونے والا شیر کہاں ہے؟ تو اپنا ذلیل منہ، دونوں ہاتھوں سے چھپا لینے کے سوا، اسے کیا جواب دوں گا۔ کن لفظوں سے اس کے ٹوٹے ہوئے دل اور زخمی کلیجے کو تسلی دوں گا۔ ۔

سنوں گا ہائے کیسے؟ ماتا کی اس دہائی کو
کہاں سے لاؤں گا، مانگے گی جب اپنی کمائی کو

نگاہیں کس طرح اٹھیں گی مجھ قسمت کے ہیٹے کی
دکھاؤں گا میں کن ہاتھوں سے ماں کو لاش بیٹے کی

سہراب : پیارے باپ۔ میری بدنصیب ماں سے کہنا کہ انسان سب سے لڑسکتا ہے۔ قسمت سے جنگ نہیں کر سکتا ــــ آہ ــــ

(رستم کی گود سے زمین پر گر کر آنکھیں بند کرلیتا ہے)

رستم : یہ کیا! ــــ یہ کیا!! ــــ میرے بچے، آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ کیا خفا ہوگئے۔ کیا ظالم باپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے ــــ یہ موت کا گہوارہ، یہ خون میں ڈوبی ہوئی زمین، پھولوں کا بستر، ماں کی گود، باپ کی چھاتی نہیں ہے۔ پھر تمھیں کس طرح نیند آگئی؟ ؎

میرے بچے یوں نہ جا، مجھ کو تڑپتا چھوڑ کے
میرا دل، میرا جگر، میری کمر کو توڑ کے
ہائے کیا کیا آرزو تھی، زندگانی میں تجھے
موت آئی پھولتی پھلتی جوانی میں تجھے

سہراب : ماں ــــ خدا ــــ تمھیں ــــ تسلی دے۔

رستم : اور ــــ اور ــــ بیٹا بولو، بولو ــــ چُپ کیوں ہوگئے؟ آہ، آہ ــــ اس کا خون سرد ہورہا ہے۔ اس کی سانسیں ختم ہو رہی ہیں ــــ اے خدا۔ اے کریم و رحیم خدا۔ اولاد باپ کی زندگی کا سرمایہ اور ماں کی روح کی دولت ہے۔ یہ دولت محتاجوں سے نہ چھین۔ اپنی دنیا کا قانون بدل ڈال۔ اس کی موت مجھے اور میری باقی زندگی اسے بخش دے۔ موت۔ موت ــــ تو زال و رودابہ کے گھر کا اجالا، میرے بڑھاپے کی امید، میری تہمینہ کا بولتا کھیلتا ہوا کھلونا کہاں لیے جا رہی ہے؟ ــــ دیکھ میری طرف دیکھ۔ میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کو تاج و تخت کی بھیک دی ہے، آج ایک فقیر کی طرح تجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی بھیک مانگتا ہوں۔ ؎

پھینک دے جھولی میں تو۔ میرے گل شاداب کو
ہاتھ پھیلائے ہوں میں دے دے مرے سہراب کو

سہراب : (آنکھیں بند کیے ہوئے) دنیا — رخصت — خدا —

(سہراب مرجاتا ہے)

رستم : آہ۔ جوانی کا چراغ آخری ہچکی لے کر بجھ گیا —— بے رحم موت نے میری امید کی روشنی لوٹ لی — اب لاکھوں چاند، ہزاروں سورج مل کر بھی میرے غم کا اندھیرا دور نہیں کر سکتے۔ آسمان ماتم کر، زمین چھاتی پیٹ۔ درختو، پہاڑو، ستارو ٹکرا کر چور چور ہو جاؤ —— آج ہی زندگی کی قیامت ہے۔ آج ہی دنیا کا آخری دن ہے۔ زندگی! دنیا!!۔ کہاں ہے زندگی؟ —— کہاں ہے دنیا؟ —— زندگی سہراب کے خون میں اور دنیا رستم کے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ (دیوانوں کی طرح پکارتا ہے) سہراب — سہراب — سہراب —

(غش کھا کر گر پڑتا ہے سین بدل کر بہشت ہو جاتا ہے فرشتے آسمان سے سہراب کی لاش پر پھول برساتے ہیں)

(پردہ)

— ختم —